سورۃ الکہف

آیاتہا ۱۱۰ ۱۸ سورۃ الکہف مکیۃ ۶۹ رکوعاتہا ۱۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تمام مفسرین کے قول کے مطابق یہ سورت مکی ہے۔ اور ایک جماعت سے مروی ہے کہ یہ سورت ابتدا سے لے کر قول باری تعالیٰ جُرُزًا تک مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، لیکن پہلا قول اصح ہے۔ اور اس کی فضیلت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث مروی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جس نے یہ سورت پڑھی اسے زمین و آسمان کے درمیان نور عطا کیا جائے گا اور اس کے سبب اسے قبر کے فتنہ سے بچا لیا جائے گا(1)۔ اور اسحاق بن عبداللہ بن ابی فروہ نے بیان کیا ہے: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا میں تمہاری ایسی سورت پر راہنمائی نہ کروں جسے ستر ہزار فرشتوں نے منزل تک پہنچایا اور اس کی عظمتوں نے زمین و آسمان کے درمیان کو بھر دیا (اور) اس کی تلاوت کرنے والے کے لئے بھی اسی کی مثل ہے۔'' صحابہ کرام نے عرض کی: کیوں نہیں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ سورت اصحاب الکہف ہے جس نے جمعہ کے دن اسے پڑھا تو دوسرے جمعہ تک اور مزید تین دنوں تک اس کی مغفرت کر دی جائے گی اور اسے ایسا نور عطا کیا جائے گا جو آسمان تک پہنچے گا اور فتنہ دجال سے اسے بچا لیا جائے گا۔'' اسے ثعلبی نے اور مہدوی نے بھی اسی معنی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اور مسند دارمی میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: جس نے جمعہ کی رات سورۃ الکہف پڑھی تو اس نے اپنے درمیان اور بیت عتیق کے درمیان ایک نور روشن کر لیا(2)۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ (3) سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے سورۃ الکہف کے شروع سے دس آیات یاد کر لیں اسے دجال سے بچا لیا جائے گا۔'' اور ایک روایت میں ہے ''سورۂ کہف کے آخر سے'' اور مسلم میں نواس بن سمعان کی حدیث بھی ہے ''جو کوئی دجال کو پائے تو اسے چاہئے کہ وہ اس پر سورہ کہف کی ابتدائی آیات پڑھے۔'' اور اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ کہا ہے: حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے سورۃ الکہف کی دس آیات یاد پڑھیں فتنہ دجال اسے ضرر اور نقصان نہیں دے گا(4)''۔ اور جس نے ساری سورت پڑھی وہ جنت میں داخل ہو گا۔

1۔ الجواہر الحسان، جلد 2، صفحہ 286

2۔ السنن الکبری، للبیہقی، کتاب الجمعہ، مایؤمر بہ فی لیلۃ الجمعہ، جلد 3، صفحہ 249

3۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل للقرآن، فضل سورۃ الکہف، جلد 1، صفحہ 271

4۔ ایضاً، کتاب الفتن، ذکر دجال، جلد 2، صفحہ 401

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ؕ﴿۱﴾ قَیِّمًا لِّیُنۡذِرَ
بَاۡسًا شَدِیۡدًا مِّنۡ لَّدُنۡہُ وَ یُبَشِّرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمۡ
اَجۡرًا حَسَنًا ۙ﴿۲﴾ مَّاکِثِیۡنَ فِیۡہِ اَبَدًا ۙ﴿۳﴾

''سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے نازل فرمائی اپنے (محبوب) بندے پر یہ کتاب اور نہیں پیدا ہونے دی اس میں ذرا کجی، (اور معاش و معاد کو) درست کرنے والی ہے تاکہ ڈرائے سخت گرفت سے جو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور یہ مژدہ سنائے ان اہل ایمان کو جو کرتے ہیں نیک اعمال کہ بے شک ان کے لئے بہت عمدہ جزا ہے۔ وہ ٹھہریں گے اس (جنت) میں تا ابد''۔

قولہ تعالیٰ: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ؕ﴿۱﴾ قَیِّمًا ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ قریش نے نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کو یہود کے علماء کی طرف بھیجا اور انہوں نے ان دونوں کو کہا: تم ان سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں پوچھو ان کے پاس جا کر آپ کی کیفیت اور حالت بیان کرو اور آپ کے قول کے بارے انہیں اطلاع کرو، کیونکہ ان کے پاس پہلے کتاب ہے اور ان کے پاس انبیاء علیہم السلام کے بارے وہ علم ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے، پس وہ دونوں نکلے یہاں تک کہ مدینہ طیبہ پہنچ گئے، اور انہوں نے یہودیوں کے علماء سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے پوچھا، اور ان کے سامنے آپ کے معاملہ کو بیان کیا، اور آپ کے بعض اقوال کے بارے انہیں مطلع کیا، اور انہوں نے انہیں کہا: بلاشبہ تم اہل تورات ہو ہم تمہارے پاس آئے ہیں تاکہ تم ہمیں ہمارے اس صاحب کے بارے میں کچھ آگاہ کرو۔ تو یہودی علماء نے انہیں کہا: تم ان سے تین چیزوں کے بارے میں پوچھو ہم تمہیں ان کے بارے بتاتے ہیں پس اگر انہوں نے تمہیں ان کے بارے خبر دے دی تو پھر وہ نبی مرسل ہے، اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو وہ جھوٹ گھڑنے والا آدمی ہے، پھر تم اس بارے میں اپنی رائے دیکھ لو، تم ان سے ان نوجوانوں کے بارے میں پوچھو جو پہلے زمانے میں گزر چکے ہیں، ان کا معاملہ کیا تھا؟ کیونکہ ان کا واقعہ بہت عجیب بات ہے۔ اور پھر تم اس سے اس گھومنے اور چکر لگانے والے آدمی کے بارے میں پوچھو جو زمین کے مشارق و مغارب تک پہنچا، اس کی خبر کیا ہے؟ اور پھر تم اس سے روح کے بارے سوال کرو، وہ کیا ہے؟ پس جب وہ تمہیں ان کے بارے بتا دے تو تم اس کی اتباع کرو کیونکہ وہ نبی ہے، اور اگر وہ نہ بتائے تو وہ محض جھوٹا آدمی ہے پھر تم اس کے بارے میں جو چاہو کرو۔ پس نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط دونوں قریش کے پاس مکہ مکرمہ آ گئے اور آ کر بتایا: اے گروہ قریش! تحقیق ہم تمہارے پاس ایسی چیز لائے ہیں جو تمہارے درمیان اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان فرق اور جدائی کر دے گی ...... تحقیق ہمیں یہودی علماء نے حکم دیا ہے کہ ہم ان سے چند چیزوں کے بارے سوال کریں جن کے بارے انہوں نے ہمیں بتا دیا ہے، پس اگر وہ تمہیں ان کے بارے خبر دے دیں تو وہ نبی ہیں، اور اگر نہ دیں تو وہ جھوٹا آدمی ہے، اور تم

اس بارے میں اپنی رائے دیکھ لو، چنانچہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور عرض کی: اے محمد! ﷺ ہمیں ان جوانوں کے بارے میں بتائیے جو پہلے زمانے میں گزر چکے ہیں۔ تحقیق ان کا قصہ بڑا عجیب ہے، اور اس آدمی کے بارے بتائیے جو چکر کاٹتا رہا یہاں تک کہ زمین کے مشارق و مغارب تک جا پہنچا، اور ہمیں روح کے بارے بتائیے وہ کیا ہے؟

راوی کا بیان ہے: پس رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا: ''جو کچھ تم نے پوچھا ہے میں اس کے بارے کل تمہیں بتاؤں گا۔'' اور آپ نے ان شاء اللہ تعالیٰ نہ کہا۔ پس وہ آپ سے واپس چلے گئے۔ اور رسول اللہ ﷺ اس بارے میں پندرہ راتوں تک ٹھہرے رہے، انتظار کرتے رہے جو وہ گمان کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں آپ کی طرف کوئی وحی نہ بھیجی اور نہ حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے، یہاں تک کہ اہل مکہ لوگوں کو بھڑکانے کے لئے بری خبریں اڑانے لگے اور کہنے لگے: محمد (ﷺ) نے ہم سے کل کا وعدہ کیا تھا، اور آج پندرہ راتیں گزر چکی ہیں، اور ہم نے صبح اس حال میں کی ہے کہ انہوں نے ہمیں ان چیزوں کے بارے کوئی خبر نہیں دی جن کے بارے ہم نے ان سے سوال کیا تھا، یہاں تک کہ وحی کے رکنے نے رسول اللہ ﷺ کو بھی غمزدہ کر دیا، اور آپ پر اس کے بارے اہل مکہ کی گفتگو گراں گزرنے لگی، پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی جانب سے سورۂ اصحاب کہف لے کر حاضر ہوئے اس میں آپ ﷺ کو ان پر غمزدہ ہونے کی وجہ سے عتاب بھی کیا گیا، اور اس کے بارے آپ کو خبر بھی دی گئی جو انہوں نے آپ سے جوانوں، گھومنے والے آدمی (1)، اور روح کے بارے پوچھا تھا۔ ابن اسحاق نے کہا ہے: میرے سامنے ذکر کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو فرمایا: اے جبرائیل! تو مجھ سے رک گیا یہاں تک کہ برا گمان کیا جانے لگا''۔ تو جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ کو عرض کی: وَ مَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَیْنَ اَیْدِیْنَا وَ مَا خَلْفَنَا وَ مَا بَیْنَ ذٰلِكَ ۚ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ نَسِیًّا ۝ (مریم) (اور (جبرائیل! میرے نبی سے کہو) ہم نہیں اترتے مگر آپ کے رب کے حکم سے، اسی کا ہے جو ہمارے سامنے ہے اور جو ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے۔ اور نہیں ہے آپ کا رب بھولنے والا۔) پس اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی حمد اور اپنے رسول ﷺ کی نبوت کے ذکر کے ساتھ سورت کا آغاز کیا، کیونکہ انہوں نے اسی سے متعلق آپ کا انکار کیا تھا پس ارشاد فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ یعنی سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے اپنے (محبوب) بندے یعنی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر کتاب نازل فرمائی، بلاشبہ آپ ﷺ میری طرف سے رسول ہیں، یعنی یہ اس کی تحقیق ہے جو انہوں نے آپ سے آپ کی نبوت کے بارے میں سوال کیا تھا۔ وَ لَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝ قَیِّمًا (اور نہیں پیدا ہونے دی اس میں ذرا کجی) یعنی معتدل ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ تا کہ ڈرائے دنیا میں اس جلدی آنے والی سزا سے اور آخرت میں عذاب الیم سے، یعنی (وہ سزا اور گرفت) آپ کے اس رب کی طرف سے ہوتی ہے جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا۔ وَ یُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝ مّٰكِثِیْنَ فِیْهِ اَبَدًا ۝ یعنی وہ دار الخلد (ہمیشہ رہنے والا گھر) ہے وہ اس میں نہیں مریں گے، وہ لوگ جنہوں نے اس بارے

1۔ تفسیر طبری، جلد 15 صفحہ 221-220

آپ کی تصدیق کی جو آپ لے کر آئے ان امور میں سے جن کے سبب غیروں نے آپ کو جھٹلایا، اور انہوں نے اعمال میں سے ان پر عمل کیا جن کے بارے آپ نے انہیں حکم دیا۔

وَّ يُنۡذِرَ الَّذِيۡنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا یعنی قریش کو ان کے اس قول سے ڈرایا: بے شک ہم فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمۡ (نہ انہیں اللہ کی (ذات وصفات) کا کچھ علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو) جنہوں نے اپنے فراق اور جدائی کو اور اپنے دین کے عیب اور نقص کو بڑا کر دیا۔ كَبُرَتۡ كَلِمَةً تَخۡرُجُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ (کتنی بڑی ہے وہ بات جو ان کے مونہوں سے نکلتی ہے)۔ مراد ان کا یہ قول ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اِنۡ يَّقُوۡلُوۡنَ اِلَّا كَذِبًا۔ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمۡ اِنۡ لَّمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٰذَا الۡحَدِيۡثِ اَسَفًا (وہ نہیں کہتے ہیں مگر (سر تا سر) جھوٹ۔ تو کیا آپ (فرط غم سے) تلف کر دیں گے اپنی جان کو ان کے پیچھے اگر وہ اس قرآن کریم پر ایمان نہ لائے افسوس کرتے ہوئے)۔ یعنی اپنے آپ کو ان پر اس وقت غمزدہ کرتے ہوئے جب وہ چیز حاصل نہ ہو جس کی وہ آپ سے امید رکھتے ہیں (آپ اپنی جان کو ضائع کر دیں گے) ایسا ہرگز نہ کریں۔ ابن ہشام نے کہا ہے: بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ یعنی کیا آپ اپنی جان کو ہلاک کر دیں گے؟ (مُهلك نفسك) یہ ابوعبیدہ نے مجھ سے بیان کیا ہے۔

اسی طرح ذوالرمہ نے بھی کہا ہے:

ألا أيهذا الباخِعُ الوَجدُ نفسه بشيءٍ نَحَتْه عن يَدَيْه المقادِرُ(1)

اور اس کی جمع باخعون اور بَخَعة ہے۔ اور یہ شعر اس کے قصیدہ میں ہے اور عرب کہتے ہیں: قد بَخعْتُ له نُصْحِي و نفسي، یعنی میں نے اس کے لئے پوری کوشش کی۔ اِنَّا جَعَلۡنَا مَا عَلَى الۡاَرۡضِ زِيۡنَةً لَّهَا لِنَبۡلُوَهُمۡ اَيُّهُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا (بے شک ہم نے بنایا ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں اس کے لئے باعث زینت و آرائش تاکہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں سے کون عمل کے لحاظ سے بہتر ہے۔) ابن اسحاق نے کہا ہے: یعنی ان میں سے کون ہے جس نے میرے حکم کی اتباع کی ہے اور میری اطاعت کرتے ہوئے عمل کیا ہے۔ وَاِنَّا لَجٰعِلُوۡنَ مَا عَلَيۡهَا صَعِيۡدًا جُرُزًا (اور ہم ہی بنانے والے ہیں ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں (ویران کر کے) چٹیل میدان، غیر آباد۔) یعنی زمین، اور بے شک جو کچھ اس پر ہے وہ فنا ہونے والا اور ختم ہو جانے والا ہے، اور بلاشبہ لوٹنا میری طرف ہی ہے اور میں ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دوں گا، پس آپ پریشان نہ ہوں اور نہ وہ آپ کو غمزدہ کرے جو آپ دیکھتے ہیں اور سنتے ہیں۔ ابن ہشام نے کہا ہے: الصعید سے مراد سطح زمین ہے، اور اس کی جمع صُعُد ہے۔

ذوالرمہ چھوٹے ہرن کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

كأنه بالضُحَا ترمي الصعيدَ به دبابةٌ في عِظام الرأس خُرطوم

اور یہ شعر اس کے قصیدہ میں ہے۔ اور الصعید کا معنی الطریق (راستہ) بھی ہے، تحقیق حدیث میں آیا ہے: ایاكم

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 284

والقعود علی الصُّعُدات(1) (راستوں پر بیٹھنے سے بچو) اور الجرز سے مراد وہ زمین ہے جو کوئی شے نہ اگاتی ہو، اور اس کی جمع أجراز ہے۔ اور کہا جاتا ہے: سَنَةٌ جُرُزٌ اور سِنُون أجراز اور یہ وہ سال ہوتے ہیں جن میں کوئی بارش نہ ہو۔ اور ان میں قحط سالی، خشکی اور سختی ہو۔

ذوالرمہ نے اونٹ کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

طَوَى النحز والإجراز ما في بطونها فما بقيت إلا الضلوع الجراشِع

ابن اسحاق نے کہا ہے: پھر الله تعالیٰ نے ان نوجوانوں کی خبر کے بیان کی طرف توجہ فرمائی جن کے بارے انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا۔ پس ارشاد فرمایا: اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا (کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ غار والے اور رقیم والے ہماری ان نشانیوں میں سے ہیں جو تعجب خیز ہیں۔) یعنی تحقیق میری وہ نشانیاں جو میں نے اپنے بندوں میں رکھی ہیں وہ میری ان حجتوں اور دلائل میں سے ہیں جو اس سے زیادہ تعجب خیز ہیں۔ ابن ہشام نے کہا ہے: الرقیم سے مراد وہ کتاب اور تحریر ہے جو ان کی خبر کے بارے لکھی گئی اور اس کی جمع رُقُم ہے۔ عجاج نے کہا ہے:

و مُسْتَقَرّ المصحف المُرَقَّم

(لکھا ہوا مصحف رکھنے کی جگہ) اور یہ شعر بحر رجز کے قصیدہ میں سے ہے۔

ابن اسحاق نے کہا ہے: پھر فرمایا: اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۙ ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ۝ ((یاد کرو) جب پناہ لی ان جوانوں نے غار میں پھر انہوں نے دعا مانگی: اے ہمارے رب! ہمیں مرحمت فرما اپنی جناب سے رحمت اور مہیا فرما ہمارے لئے اس کام میں ہدایت۔ پس ہم نے بند کر دیئے ان کے کان (سننے سے) اس غار میں کئی سال تک جو گنے ہوئے تھے پھر ہم نے انہیں بیدار کر دیا تاکہ ہم دیکھیں کہ ان دو گروہوں میں سے کون صحیح شمار کر سکتا ہے اس مدت کا جو وہ (غار میں) ٹھہرے تھے۔) پھر فرمایا: نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ (اے حبیب!) ہم بیان کرتے ہیں آپ سے ان کی خبر ٹھیک ٹھیک) یعنی سچی خبر بیان کرتے ہیں۔ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى ۝ وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ۝ (بے شک وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کے (نور) ہدایت میں اضافہ کر دیا۔ اور ہم نے مضبوط کر دیا ان کے دلوں کو جب وہ راہ حق میں کھڑے ہو گئے تو انہوں نے (برملا) کہہ دیا: ہمارا پروردگار وہ ہے جو پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا ہم ہرگز نہیں پکاریں گے اس کے سوا کسی معبود کو (اگر ہم ایسا کریں) تو گویا ہم نے ایسی بات کہی جو حق سے دور ہے۔) یعنی انہوں نے میرے ساتھ شرک نہیں کیا جیسا کہ تم نے میرے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہرایا ہے جن کے بارے تمہیں علم نہیں۔ ابن ہشام نے کہا ہے: الشَّطَط کا معنی غلو کرنا اور حق سے تجاوز کرنا ہے۔

1۔ مجمع الزوائد، کتاب الادب، الجلوس علی الصعید، جلد 8، صفحہ 119، حدیث 12935

جیسا کہ اعشیٰ [بنی] قیس بن ثعلبہ نے کہا ہے:

أتنتهون ولا ینهی ذوی شطط كالطعن يذهب فيه الزيت والفتل

اور یہ شعر اس کے قصیدہ میں ہے۔

ابن اسحاق نے کہا ہے: پھر فرمایا: هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ (یہ ہماری قوم ہے جنہوں نے بنالیا ہے اس کے سوا غیروں کو (اپنے) خدا، کیوں نہیں پیش کرتے ان (کی خدائی) پر کوئی ایسی دلیل جو روشن ہو۔) ابن اسحاق نے کہا ہے: یعنی ایسی حجت جو کامل اور بلیغ ہو۔ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝ وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ۝ وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ (ورنہ پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھتا ہے۔ اور جب تم الگ ہو گئے ہو ان (کفار) سے اور ان معبودوں سے جن کی یہ پوجا کرتے ہیں اللہ کے سوا، تو اب پناہ لو غار میں پھیلا دے گا تمہارے لئے تمہارا رب اپنی رحمت (کا دامن) اور مہیا کر دے گا تمہارے لئے تمہارے اس کام میں آسانیاں۔ اور جو دیکھے گا سورج کو جب وہ ابھرتا ہے تو وہ ہٹ کر گزرتا ہے ان کی غار سے دائیں جانب اور جب وہ ڈوبتا ہے تو بائیں طرف کتراتا ہوا ڈوبتا ہے۔ اور وہ (سو رہے) ہیں ایک کشادہ جگہ غار میں۔) ابن ہشام نے کہا ہے: تزاور کا معنی تمیل مائل ہونا (ایک طرف ہونا) اور یہ الزور سے ماخوذ ہے۔

اور ابوالزحف کلیبی نے شہر کی صفت بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

جَذب المُنَدّى عن هوانا أزْوَرُ يُنْضِي المطايا خِمْسُه العَشَنْزَرُ

اور یہ دونوں بیت اس کے ارجوزہ میں ہیں۔ اور تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وہ اپنی بائیں جانب سے ان کے پاس سے گزر جاتا ہے اور انہیں چھوڑ دیتا ہے۔

جیسا کہ ذوالرمہ نے کہا ہے:

إلى ظُعُن يَقْرِضن أقواز مشرف شمالا و عن أيمانهن الفوارس

اور یہ شعر اس کے قصیدہ میں ہے۔ اور الفجوۃ سے مراد کشادہ جگہ ہے۔ اور اس کی جمع الفجاء ہے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

ألبست قومك مَخزاة و منقصة حتى أبيحوا و حلّوا فَجوة الدار

ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ((سورج کا) یوں (طلوع و غروب) اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے۔)

یعنی یہ ان پر حجت اور دلیل ہے اہل کتاب میں سے جنہوں نے ان کے امور میں سے اسے پہچانا جنہوں نے انہیں حکم دیا کہ وہ آپ سے ان کے بارے پوچھیں (کہ) ان کے بارے خبر کی تحقیق آپ کی نبوت کی صداقت کی علامت ہے۔ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ۝ وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ڰ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ

وَ ذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ((حقیقت یہ ہے) کہ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ گمراہ کردے تو تو نہیں پائے گا اس سے کوئی مددگار (اور) راہنما، اور (اگر تو دیکھے تو) تو انہیں بیدار خیال کرے گا حالانکہ وہ سو رہے ہیں، اور ہم ان کی کروٹ بدلتے رہتے ہیں (کبھی) دائیں جانب اور (کبھی) بائیں جانب اور ان کا کتا پھیلائے بیٹھا ہے اپنے دونوں بازو ان کی دہلیز پر۔) ابن ہشام نے کہا ہے: الوصید کا معنی دروازہ ہے۔

عبسی نے کہا ہے اور اس کا نام عبد بن وہب ہے:

بأرضِ فلاةٍ لا يُسَدُّ وصِيدها   عليّ و معروفي بها غير منكرِ

اور یہ شعر اس کے اشعار میں ہے۔ اور الوصید کا معنی فناء بھی ہے، (یعنی صحن، گھر کے سامنے کھلی جگہ) اور اس کی جمع وصائد، وُصُد اور وُصْدان ہے۔ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿۱۸﴾ وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَ لْيَتَلَطَّفْ وَ لَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿۱۹﴾ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَ لَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾ وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ؕ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰۤى اَمْرِهِمْ (اگر تو جھانک کر انہیں دیکھے تو ان سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑا ہو...... کہنے لگے وہ لوگ جو غالب تھے اپنے کام پر) یعنی جو ان میں سے اہل سلطنت اور حکمران تھے۔ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا (کہ بخدا ہم تو ضرور ان پر ایک مسجد بنائیں گے۔) سَيَقُوْلُوْنَ (کچھ کہیں گے) یعنی وہ یہودی علماء جنہوں نے انہیں ان کے بارے سوال کرنے کا حکم دیا۔ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ قُلْ رَّبِّيْۤ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۚ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ (کہ اصحاب کہف تین تھے چوتھا ان کا کتا تھا، کچھ کہیں گے: وہ پانچ تھے چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب تخمینے ہیں بن دیکھے۔ اور کچھ کہیں گے: وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ آپ فرمائیے: (اس بحث کو رہنے دو) میرا رب بہتر جانتا ہے ان کی تعداد کو (اور) نہیں جانتے ان (کی صحیح تعداد) کو مگر چند آدمی، سو بحث نہ کرو ان کے بارے میں)۔ یعنی تم ان کے بارے میں اختلاف نہ کرو۔ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۪ وَّ لَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا (بجز اس کے کہ سرسری سی گفتگو ہو جائے۔ اور نہ دریافت کرو ان کے متعلق (اہل کتاب) میں سے کسی اور سے۔) کیونکہ انہیں ان کے بارے کوئی علم نہیں ہے۔ وَ لَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۫ وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَ قُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾ (ہرگز نہ کہنا کسی چیز کے متعلق کہ میں اسے کرنے والا ہوں کل مگر (یہ کہ ساتھ یہ بھی کہو) اگر چاہا اللہ تعالیٰ نے۔ اور یاد کر اپنے رب کو جب تو بھول جائے۔ (یہ بھی) کہو کہ مجھے امید ہے کہ دکھادے گا مجھے میرا رب اس سے بھی قریب تر ہدایت کی راہ) یعنی کسی چیز کے متعلق ہرگز نہ کہنا جس کے بارے وہ آپ سے پوچھیں جیسے تم نے اس بارے میں کہا کہ میں تمہیں کل خبر دوں گا، اور ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور کہیئے۔ اور اپنے

رب کا ذکر کیجئے جب آپ بھول جائیں اور کہیئے: قریب ہے میرا رب اس خبر کے بارے میری راہنمائی فرمادے جس کے بارے تم نے مجھ سے پوچھا ہے ہدایت کی راہ، کیونکہ آپ نہیں جانتے جو کچھ میں اس بارے میں کرنے والا ہوں۔ وَ لَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا (اور (اہل کتاب کہتے ہیں کہ) وہ ٹھہرے رہے اپنے غار میں تین سو سال اور زیادہ کئے انہوں نے (اس پر) نو سال)۔ یعنی عنقریب وہ یہ کہیں گے۔ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ ۫ وَّ لَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا (آپ فرمایئے: اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جتنی مدت وہ ٹھہرے، اسی کے لئے (علم) غیب ہے آسمانوں اور زمین کا، وہ بڑا دیکھنے والا ہے اور سب باتیں سننے والا ہے، نہیں ان کا اس کے سوا کوئی دوست، اور نہیں وہ شریک کرتا اپنے حکم میں کسی کو) یعنی اس پر ان میں سے کوئی شے مخفی نہیں جس کے بارے انہوں نے آپ سے پوچھا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اصحاب کہف کی خبر کے بارے یہ سیرت میں واقع ہے جسے ہم نے ترتیب کے ساتھ ذکر کر دیا ہے۔ اور ذوالقرنین کا واقعہ آگے آرہا ہے، پھر ہم سورت کے آغاز کی طرف لوٹتے ہیں اور کہتے ہیں: تحقیق اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور اخفش، کسائی، فراء، ابوعبید اور جمہور متاولین نے یہ خیال کیا ہے کہ اس سورت کے آغاز میں تقدیم و تاخیر ہے، اور اس کا معنی یہ ہے: الحمد للہ الذی أنزل علی عبدہ الکتاب قیما ولم یجعل لہ عوجا۔ (سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے اپنے محبوب بندے پر یہ کتاب نازل فرمائی درآنحالیکہ یہ (معاش و معاد کو) درست کرنے والی ہے اور اس میں ذرا کجی نہیں پیدا ہونے دی) اور قَیِّمًا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: کلام بغیر تقدیم و تاخیر کے اپنے سیاق پر ہے، اور اس کا معنی ہے: ولم یجعل لہ عوجا ولکن جعلناہ قیما (اور اس میں ذرا کجی نہیں پیدا ہونے دی لیکن ہم نے اسے درست کرنے والا بنایا۔)

اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ کے قول میں حسن ہے (وہ یہ) کہ قَیِّمًا کا معنی مستقیم ہے، یعنی یہ کتاب سیدھی اور صحیح حکمت کو بیان کرنے والی ہے اس میں کوئی خطا نہیں، نہ اس میں فساد ہے اور نہ کوئی تناقض ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: قَیِّمًا درست قرار دینے والی ہے سابقہ کتابوں کو (کیونکہ یہ) ان کی تصدیق کرتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: قَیِّمًا یعنی یہ ہمیشہ دلائل کے ساتھ درست قرار دینے والی ہے۔ عِوَجًا مفعول بہ ہے۔ اور العِوج (عین کے کسرہ کے ساتھ) یعنی دین، رائے، حکم، اور طریق (انداز) میں پائی جانے والی کجی کو کہا جاتا ہے۔ اور عین کے فتحہ کے ساتھ اجسام مثلاً لکڑی اور دیوار وغیرہ میں پائی جانے والی کجی اور ٹیڑھے پن کو کہا جاتا ہے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور قرآن کریم میں کوئی عوج یعنی عیب نہیں ہے، یعنی اس میں کوئی تناقض اور اختلاف نہیں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا (النساء) (اور (اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ) اگر وہ غیر اللہ کی طرف سے (بھیجا گیا) ہوتا تو ضرور پاتے اس میں اختلاف کثیر)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی اسے مخلوق نہیں بنایا، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس قول باری تعالیٰ میں روایت کیا گیا ہے قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ (الزمر:28) آپ نے

فرمایا: غیر مخلوق۔ اور مقاتل نے کہا ہے: عِوَجًا کا معنی اختلاف ہے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أدوم بودّی للصدیق تکرّما　　ولا خیر فیمن کان فی الودّ أعْوَجَا

لِّيُنْذِرَ بَأْسًا شَدِيْدًا یعنی تا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن کریم ڈرائے سخت گرفت سے۔ اور اس میں اضمار ہے، یعنی تا کہ (آپ یا قرآن کریم) کافروں کو اللہ تعالیٰ کی سزا سے ڈرائے۔ اور یہ شدید عذاب کبھی دنیا میں ہوتا ہے اور کبھی آخرت میں ہوتا ہے۔ مِنْ لَّدُنْهُ یعنی من عندہ۔ (اس کی جانب سے ہے) ابوبکر نے عاصم من لدنہ کو دال کے اسکان اور اسے ضمہ کے ساتھ اشمام کرنے اور نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور ہا کو یا کے ساتھ ملا دیا ہے۔ اور باقیوں نے لَدُنْهُ دال کے ضمہ، نون کے اسکان اور ھا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ جوہری نے کہا ہے: اور لَدُنْ میں تین لغات ہیں: لَدُنْ، لَدَی اور لَدُ اور کہا ہے: مِن لَدُ لِحْيَيْهِ الی مُنْحُورہ

المُنْحُور لغوی طور پر النَّحْر (نتھنے) کے معنی میں ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ، ای بأن لھم (اور یہ مژدہ سنائے ان اہل ایمان کو جو نیک اعمال کرتے ہیں کہ ان کے بدلے ان کے لئے ہوگی اَجْرًا حَسَنًا (بہت عمدہ جزا) اور وہ جنت ہے۔ مّٰكِثِيْنَ وہ ہمیشہ رہیں گے۔ فِيْهِ اَبَدًا یعنی اس کی کوئی انتہا نہیں۔ اور اگر تو بشارت دینے کو بیان پر محمول کرے تو پھر اَنَّ میں با کی ضرورت نہیں۔ اور اُجر حسن سے مراد وہ عظیم ثواب ہے جو جنت تک پہنچا دے گا۔

وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآىِٕهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝

''اور تا کہ ڈرائے ان (نادانوں) کو جو یہ کہتے ہیں کہ بنا لیا ہے اللہ نے (فلاں کو اپنا) بیٹا۔ نہ انہیں اللہ (کی ذات وصفات) کا کچھ علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو، کتنی بڑی ہے وہ بات جو نکلتی ہے ان کے مونہوں سے، وہ نہیں کہتے ہیں مگر (سرتاسر) جھوٹ۔''

قولہ تعالیٰ: وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا اور وہ یہودی ہیں جنہوں نے کہا: حضرت عزیز اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ اور عیسائیوں نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ اور قریش نے کہا: ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ سورت کے آغاز میں ڈرانے کا ذکر عام ہے، اور یہ ان کے بارے میں خاص ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے۔ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ، مِنْ صلہ ہے، یعنی انہیں اس قول کے بارے کوئی علم نہیں، کیونکہ وہ مقلد ہیں اور انہوں نے بغیر دلیل کے یہ کہہ دیا ہے: وَّلَا لِاٰبَآىِٕهِمْ اور نہ ان کے اسلاف کو (کوئی علم ہے)۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً، كَلِمَةً بیان ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی ازروئے قول کے وہ بات بہت بڑی ہے۔ حسن، مجاہد، یحییٰ بن یعمر اور ابن ابی اسحاق رحمہم اللہ نے کَلِمَہ (1) کو رفع

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 496

کے ساتھ پڑھا ہے؛ أی عظمت کلمۃٌ۔ (وہ بات بہت بڑی ہے) مراد ان کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (فلاں کو اپنا) بیٹا بنا لیا ہے۔ اور اس قرأت کی بنا پر اضمار کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں۔ کہا جاتا ہے: کبر الشئ جب کوئی شے عظیم ہو جائے۔ اور کبر الرجل جب آدمی عمر رسیدہ ہو جائے۔ تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ (جو ان کے مونہوں سے نکلتی ہے) یہ صفت کے محل میں ہے۔ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا وہ نہیں کہتے ہیں مگر (سرتاسر) جھوٹ۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا ۝

''تو کیا آپ (فرطِ غم سے) تلف کر دیں گے اپنی جان کو ان کے پیچھے اگر وہ ایمان نہ لائے اس قرآن کریم پر افسوس کرتے ہوئے۔''

قولہ تعالیٰ: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ، بَاخِعٌ اس کا معنی ہے ہلاک کرنے والا اور قتل کرنے والا اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اٰثَارِهِمْ یہ أثر کی جمع ہے، اور کہا جاتا ہے: إثر (پیچھے) اور اس کا معنی ہے آپ سے ان کے اعراض کرنے اور ان کے پیٹھ پھیرنے کے پیچھے (کیا آپ اپنے آپ کو ہلاک کر دیں گے)۔ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اگر وہ اس قرآن کریم پر ایمان نہ لائے۔ اَسَفًا یعنی ان کے کفر پر افسوس اور غصہ کرتے ہوئے اور یہ تفسیر کی بنا پر منصوب ہے۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِیْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَیُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝

''بے شک ہم نے بنایا ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں ان کے لئے باعث زینت و آرائش تاکہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں سے کون عمل کے لحاظ سے بہتر ہے۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِیْنَةً لَّهَا اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِیْنَةً لَّهَا، مَا اور زِیْنَةً یہ دونوں مفعول ہیں۔ اور الزِّیْنَةَ سے مراد ہر وہ شی ہے جو سطح زمین پر ہے، پس یہ عام ہے، کیونکہ ہر شی اپنے خالق اور پیدا کرنے والے پر دلالت کرتی ہے۔ اور حضرت ابن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ آپ نے زینۃ سے مراد رجال (مرد) لئے ہیں؛ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ زینت سے مراد خلفاء اور امراء ہیں (1)۔ اور ابن ابی نجیح نے حضرت مجاہد سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ: اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِیْنَةً لَّهَا کے بارے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: علماء زمین کی زینت ہیں۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اس سے نعمتیں، لباس، پھل، سبزیاں، پانی اور اسی طرح کی اور چیزیں جو اس میں زینت کا باعث ہیں وہ مراد لی ہیں، اور اس میں سے ابھرے پہاڑ اور ہر وہ شے جس میں زینت نہیں مثلاً سانپ اور بچھو وغیرہ یہ داخل نہیں ہیں۔ اور عموم کے بارے قول کرنا زیادہ بہتر اور اولیٰ ہے، اور یہ کہ ہر وہ شے جو زمین پر ہے وہ اس میں اپنی خلقت، صنعت، اور اپنی پختگی کے اعتبار سے زینت ہے۔ اور آیت تسلی اور اطمینان دلانے کے لئے بیان کی گئی ہے، یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ دنیا اور اہل دنیا کے لئے غمزدہ اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 496

پریشان نہ ہوں کیونکہ ہم نے اسے دنیا والوں کے لئے امتحان اور آزمائش بنادیا ہے، پس ان میں سے کچھ تدبر اور غور وفکر کر کے ایمان لے آئیں گے، اور ان میں سے کچھ کفر بھی کریں گے، پھر قیامت کے دن (وہ سب) ان کے سامنے ہوگا پس ان کا کفر اور انکار آپ پر گراں اور شاق نہ گزرے کیونکہ ہم انہیں ان کے کئے کی سزا اور بدلہ دیں گے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت کا معنی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں دیکھا جا سکتا ہے: ''بے شک دنیا سرسبز و شیریں ہے اور اللہ تعالیٰ تمہیں اس میں خلیفہ اور نائب بنانے والا ہے پس وہ دیکھتا ہے تم کیسے عمل کرتے ہو (1)؟'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''بے شک زیادہ خوف دلانے والی وہ شے جس کے بارے میں تم پر خوف اور اندیشہ محسوس کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے دنیا کی رونق وخوشحالی (زهرة الدنيا) کو ظاہر کر دے گا۔'' پوچھا: زهرة الدنيا کیا ہے؟ فرمایا: ''دنیا کی برکتیں (2)'' ان دونوں روایتوں کو امام مسلم وغیرہ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ دنیا اپنے ذائقہ میں بڑی لذیذ اور شیریں ہے اور اپنے دکھائی دینے میں بڑی عمدہ اور خوش کرنے والی ہے گویا یہ اس پھل کی طرح ہے جو بڑا میٹھا اور شیریں ہو اور دیکھنے میں بڑا خوبصورت ہو، پس اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈال دیا ہے تاکہ وہ یہ دیکھے کہ از روئے عمل کے حسین کون ہے؟ یعنی کون اس میں زیادہ زھد اختیار کرنے والا اور اسے زیادہ چھوڑنے والا ہے اور بندوں کے لئے اس چیز سے بغض رکھنے اور اسے ناپسند کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے مزین اور آراستہ کیا ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی اس بارے میں بندے کی مدد اور معاونت فرمائے''۔ اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ کہتے تھے جیسا کہ امام بخاری نے ذکر کیا ہے: اے اللہ! بے شک ہم استطاعت نہیں رکھتے مگر اس کی کہ ہم اس سے فرحت وسرور حاصل کریں جسے تو نے ہمارے لئے آراستہ اور مزین فرمایا ہے، اے اللہ! بلاشبہ میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ میں اسے اس کے حق میں خرچ کروں۔ تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ وہ اسے اس کے حق میں خرچ کرنے پر آپ کی مدد فرمائے۔ اور یہی معنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا ہے: ''پس جس نے اسے طیب نفس کے ساتھ پالیا اس کے لئے اس میں برکت رکھ دی جائے گی اور جس نے اسے نفس کی حرص اور طمع کے ساتھ لیا تو وہ اس کی طرح ہے جو کھاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا (3)''۔ اور اسی طرح دنیا کو کثرت سے اکٹھا کرنے والا ہے کہ وہ اس پر قناعت نہیں کرتا جو اسے دنیا میں سے حاصل ہوتا ہے بلکہ اس کا ارادہ اسے جمع کرنے کا ہوتا ہے، اور یہ چیز اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے؛ کیونکہ فتنہ اور آزمائش اس کے ساتھ لاحق ہو جاتے ہیں اور محفوظ اور سلامت نہ ہونا غالب ہوتا ہے، تحقیق کامیاب اور فلاح پانے والا وہ ہے جس نے اسلام قبول کیا گزارے کے لائق روزی حاصل کی اور اللہ تعالیٰ نے اسے اس پر قناعت عطا فرما دی جو اس نے اسے عطا کیا۔ اور ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے والد محترم قول باری تعالیٰ: **اَحْسَنُ عَمَلًا** کے بارے میں کہتے تھے: احسن عمل ایمان کے ساتھ حق کو پکڑنا اور

1۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والتوبة، فی قصة اصحاب النار الثلاثة، جلد 2، صفحہ 353

ایضاً، ابن ماجہ، باب فتنة النساء، حدیث نمبر 3989، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، کتاب الزکوٰۃ، التحذیر من الاغترار بزینة الدنیا، جلد 1، صفحہ 336

3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 199، وزارت تعلیم اسلام آباد

حق میں خرچ کرنا ہے، فرائض کو ادا کرنا ہے اور محارم سے اجتناب کرنا ہے مندوبات کو کثرت سے کرنا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول اچھا ہے، اپنے الفاظ میں مختصر ہے اور اپنے معنی میں بلیغ ہے، اور حضور نبی مکرم ﷺ نے اسے ایک لفظ میں جمع فرما دیا ہے اور وہ آپ ﷺ کا وہ ارشاد ہے جو آپ نے سفیان بن عبد اللہ ثقفی رضی اللہ عنہ کو اس وقت ارشاد فرمایا جب انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ اسلام کے بارے میں مجھے ایسی بات ارشاد فرمائیے کہ میں آپ کے بعد اس کے بارے کسی سے سوال نہ کروں؟...... اور ایک روایت میں: غیرك (آپ کے سوا) کے الفاظ ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: قل امنتُ باللہ ثم استقم (1)۔ کہو میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لایا پھر اس پر استقامت اختیار کر لے؛ اسے امام مسلم نے نقل کیا ہے۔ اور حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: **اَحْسَنُ عَمَلًا** کا معنی ہے ان میں سے دنیا میں زیادہ زاہد کون ہے؟ اور اسی طرح ابو عصام عسقلانی نے کہا ہے: **اَحْسَنُ عَمَلًا** کون اسے زیادہ چھوڑنے والا ہے؟ اور زہد کے بارے میں علماء کی عبارات مختلف ہیں، پس ایک قوم نے کہا ہے: امید (اور خواہش) کو کم کرنا اور یہ خشک اور سخت کھانا کھانے اور گدڑی پہننے سے حاصل نہیں ہوتا؛ یہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اور سچ کہا ہے کہ بے شک وہ جس کی امید اور آرزو کم ہو جائے وہ عمدہ اور اعلیٰ کھانوں کو تلاش نہیں کرتا۔ اور نہ وہ قسم قسم کے عمدہ لباس پہنتا ہے، وہ دنیا سے وہ کچھ لے لیتا ہے جو اسے میسر آئے، اور وہ اس میں سے اتنی چیز پر اکتفا کرتا ہے جو اس کے معاملات حیات کو جاری رکھ سکتی ہو۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: اس سے مراد محمدۃ (حمد) کو ناپسند کرنا اور ثنا (تعریف) کو پسند کرنا ہے۔ اور یہی قول امام اوزاعی اور ان کے پیروکاروں کا ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: دنیا کو مکمل طور پر چھوڑ دینا زہد ہے۔ کیا اس نے اس کے چھوڑنے کو پسند کیا ہے یا ناپسند؟ اور یہی فضیل کا قول ہے۔ اور بشر بن حارث نے کہا ہے: دنیا کی محبت سے مراد لوگوں کی ملاقات کو پسند کرنا ہے، اور دنیا میں زہد اور بے رغبتی کا اظہار کرنے سے مراد لوگوں کی ملاقات سے دور رہنا ہے، اور حضرت فضیل رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی منقول ہے: دنیا میں زہد کی علامت لوگوں سے دور رہنا ہے اور ان سے احتراز برتنا ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: کوئی زاہد زاہد نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ دنیا کو چھوڑنا اس کے نزدیک اسے لینے سے زیادہ پسندیدہ ہو؛ یہ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: زہد یہ ہے کہ تو دنیا میں اپنے دل سے رغبت نہ رکھے؛ یہ ابن مبارک نے کہا ہے۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: زہد سے مراد موت کو پسند کرنا ہے۔ اور پہلا قول معنوی اعتبار سے ان تمام اقوال کو شامل ہے پس وہی اولیٰ اور بہتر ہے۔

وَ اِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَیْهَا صَعِیْدًا جُرُزًا ۝۸

''اور ہم ہی بنانے والے ہیں ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں (ویران کر کے) چٹیل میدان، غیر آباد۔''

اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ اور ابو سہل نے کہا ہے: ایسی زمین جس میں نباتات اور سبزہ نہ ہو، گویا کہ اس کا سبزہ کاٹ دیا گیا ہو۔ اور الجرز کا معنی قطع کرنا، کاٹ دینا ہے اور اس سے **سنۃ جُرُز** (وہ سال جس میں بارش نہ ہو اور قحط سالی ہو) ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جامع اوصاف الاسلام، جلد 1، صفحہ 48

راجز نے کہا ہے:

قد جَرَ فتهنّ السِّنُونُ الأجْرازُ

(قحط والے سالوں نے انہیں ختم کر دیا)

اور الأرض الجُرزُ وہ زمین ہے جس میں نباتات نہ ہو اور نہ اس میں آبادی وغیرہ میں سے کوئی شے ہو، گویا کہ اسے مکمل طور پر کاٹ دیا گیا ہو اور زائل کر دیا گیا ہو۔ مراد قیامت کا دن ہے، کیونکہ اس دن زمین ہموار ہوگی اس میں کوئی چیز چھپی ہوئی نہ ہوگی۔ نحاس نے کہا ہے: لغت میں الجرز سے مراد وہ زمین ہے جس میں سبزہ نہ ہو۔ کسائی نے کہا ہے: جُرِزَت الأرضُ تَجْرَزُ اور جرزھا القوم یَجْرُزونھا جب وہ زمین میں اگنے والی ہر شے سبزہ اور کھیتی وغیرہ کھا جائیں تو یہ کہا جاتا ہے پس وہ زمین مجروزۃ اور جُرُزٌ کہلاتی ہے۔

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝

''کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ غار والے اور رقیم والے ہماری ان نشانیوں میں سے ہیں جو تعجب خیز ہیں''۔

سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ جب أَمْ مذکور ہو اور اس سے پہلے ہمزہ استفہام نہ ہو تو وہ بمعنی بل اور ہمزہ استفہام کے ہوتا ہے، اور وہ ام منقطعہ ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ أَمْ کا عطف استفہام کے اس معنی پر ہے جو لعلک میں پایا جا رہا ہے، یا یہ ہمزہ استفہام انکاری کے معنی میں ہے۔ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے خیال پر پختہ کرنا ہے کہ اصحاب کہف تعجب خیز تھے، اس معنی میں کہ وہ واقعہ اتنا بڑا اور عظیم نہیں ہے جتنا سوال کرنے والے کافروں نے آپ پر اسے بڑا قرار دیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ساری نشانیاں ان کے قصہ کی نسبت بڑی، عظیم، اور عام ہیں، یہ قول حضرت ابن عباس، حضرت مجاہد، قتادہ اور ابن اسحاق رضی اللہ عنہم کا ہے(1)۔ اور خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، کیونکہ مشرکین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان نوجوانوں کے بارے میں پوچھا جو گم ہوئے تھے، اور ذی القرنین اور روح کے بارے پوچھا اور اللہ تعالیٰ نے وحی مؤخر فرما دی جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس جب وحی نازل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم کیا تم نے گمان کیا ہے کہ غار اور رقیم والے ہماری تعجب خیز نشانیوں میں سے ہیں؟ یعنی وہ ہماری تعجب خیز نشانیوں میں سے نہیں ہیں، بلکہ ہماری نشانیوں میں سے ایسی ہیں جو ان کے واقعہ اور خبر سے زیادہ تعجب خیز ہیں۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: آسمانوں اور زمین کو تخلیق کرنا ان کے واقعہ سے زیادہ تعجب خیز ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں نے غیب میں سے جس پر آپ کو اطلاع دی ہے وہ زیادہ تعجب خیز ہے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سفر معراج میں آپ کی شان اس سے زیادہ تعجب خیز ہے۔ ماوردی نے کہا ہے(2): کلام کا معنی نفی ہے، یعنی آپ یہ خیال نہ کرتے اگر ہم خبر نہ دیتے۔ ابو سہل نے کہا ہے: استفہام برائے تقریر ہے، یعنی آپ یہ خیال کرتے ہیں کیونکہ وہ تعجب خیز ہیں۔ اور الکھف سے مراد پہاڑ میں کھلا سوراخ ہے اور جو وسیع اور کھلا نہ ہو تو وہ غار کہلاتا ہے۔ نقاش نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: الکھف سے مراد

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 497
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 286، مفہوم

پہاڑ ہے اور یہ لغت میں مشہور نہیں (1)۔

لوگوں نے الرقیم کے بارے میں اختلاف کیا ہے، پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: قرآن میں موجود ہر شے کے بارے اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا ہے سوائے چار کے، یعنی غسلین، حنان، الاواہ اور الرقیم۔ حضرت مرہ سے رقیم کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: کعب کا خیال ہے کہ یہ وہ گاؤں ہے جس سے وہ اصحاب نکلے تھے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: الرقیم سے مراد وادی ہے۔ اور حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: الرقیم سے مراد وہ چٹان ہے جو اس غار پر تھی (2)۔ اور ابن زید نے کہا ہے: الرقیم وہ کتاب ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے ہم پر غالب کر دیا، لیکن اس کے واقعہ کی ہمارے سامنے وضاحت نہ کی۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: الرقیم سے مراد وہ تحریر ہے جو تانبے کی تختی میں لکھی ہوئی تھی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: تانبے کی ایک تختی میں قوم کفار نے ان نوجوانوں کا واقعہ لکھا تھا جو ان سے بھاگے تھے اور انہوں نے اسے ان کی تاریخ بنا دیا، انہوں نے ان کے گم ہونے کا وقت ذکر کیا، ان کی تعداد ذکر کی کہ وہ کتنے تھے اور یہ بھی بیان کیا گیا کہ وہ کون تھے؟ اور اسی طرح فراء نے کہا ہے، انہوں نے بیان کیا ہے: رقیم تانبے کی ایک تختی ہے جس میں انکے اسماء، ان کے نسب، ان کا دین اور جس سے وہ بھاگے تھے سب لکھا ہوا تھا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ان روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایسی قوم تھے جو واقعات اور حوادثات کی تاریخ لکھتے تھے، اور یہ مملکت کی فضیلت ہے اور یہ مفید کام ہے۔ اور یہ اقوال الرقیم سے ماخوذ ہیں اور اسی سے ''کتاب مرقوم'' (لکھی ہوئی کتاب) ہے۔ اور اسی سے الارقم (زہریلے سانپ) وہ اپنے اوپر سیاہ و سفید نشانات اور لکیروں کی وجہ سے کہلاتا ہے۔ اور اسی سے رقمہ الوادی ہے، یعنی وہ جگہ جہاں پانی چلے اور وہ اس میں اکٹھا ہو جائے۔ اور جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے وہ متناقض نہیں، کیونکہ پہلا قول انہوں نے حضرت کعب سے سنا ہے، اور دوسرے قول میں یہ جائز ہے کہ انہوں نے اس کے بعد رقیم کو پہچان لیا ہو۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے ان سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اصحاب کہف کا ذکر کیا اور فرمایا: بے شک یہ چند نوجوان تھے جو گم ہو گئے، مفقود ہو گئے تو ان کے گھر والوں نے انہیں تلاش کیا لیکن وہ انہیں نہ پا سکے تو انہوں نے اسے بادشاہ وقت کے پاس پیش کر دیا تو اس نے کہا: یقیناً ان کی کوئی خبر ہوگی، اور اس نے تانبے کی ایک تختی منگائی اور اس میں ان کے نام لکھ لئے اور اسے اپنے خزانہ (ریکارڈ) میں رکھ دیا، پس وہی تختی ہی رقیم ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک بادشاہ کے گھر میں دو مومن تھے پس ان دونوں نے ان نوجوانوں کی حالت، ان کے اسماء، اور ان کے انساب تانبے کی تختی میں لکھے اور پھر اسے تانبے کے ایک تابوت میں رکھ دیا اور اسے عمارت میں رکھ دیا۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے: الرقیم لکھی ہوئی کتاب ہے جو ان کے پاس تھی اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین میں سے وہ شریعت تھی جس پر وہ عمل پیرا تھے اور اسے تھامے ہوئے تھے۔ اور نقاش نے حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے کہ الرقیم سے مراد ان کے دراہم ہیں۔ اور حضرت انس بن مالک اور شعبی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے کہ الرقیم سے مراد ان کا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 497　　2۔ ایضاً

کتا ہے۔ اور عکرمہ نے کہا ہے: الرقیم دوات ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ الرقیم ہونے کی وہ تختی ہے جو اس دیوار کے نیچے تھی جسے حضرت خضر علیہ السلام نے سیدھا کیا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الرقیم سے مراد وہ غار والے ہیں جن پر وہ بند ہوگئی تھی، پھر ان میں سے ہر ایک نے اپنے اصلح عمل کا ذکر کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بارے میں معروف خبر ہے جسے صحیحین نے ذکر کیا ہے، اور اسی طرف امام بخاری بھی مائل ہیں۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کے بارے تو خبر دی ہے، اور اصحاب رقیم کے بارے کسی شے کا ذکر نہیں کیا۔ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: الرقیم روم کا ایک شہر ہے اس میں ایک غار ہے اس میں اکیس آدمی داخل ہوئے گویا وہ اصحاب کہف کی ہیئت پر سو گئے، پس اس قول کی بنا پر وہ دوسرے جوان تھے جن کو وہی کچھ پیش آیا جو اصحاب کہف کو پیش آیا۔ واللہ اعلم

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الرقیم فلسطین کے قریب ایک وادی ہے اور اس میں ایک وسیع غار ہے، اور یہ رقمة الوادی سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد پانی جمع ہونے کی جگہ ہے؛ کہا جاتا ہے: علیك بالرقمة ودع الضفة (جہاں پانی جمع ہے اس کو لازم پکڑو اور کنارہ کو چھوڑو) اسے غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: شام میں ایک غار ہے جیسا کہ میں نے بہت سے لوگوں سے سنا ہے اور اس میں مردے ہیں، اس کے پڑوس والے خیال کرتے ہیں کہ یہی اصحاب کہف ہیں اور وہاں مسجد اور عمارت بنی ہوئی ہے اور اس عمارت کو الرقیم کہا جاتا ہے اور ان کے ساتھ ایک بوسیدہ کتا بھی ہے۔ اور اندلس میں غرناطہ کی طرف اس کے قریب ایک گاؤں ہے اس کا نام گوشہ ہے اس میں ایک غار میں مردے ہیں اور ان کے ساتھ ایک بوسیدہ (ہڈیوں والا) ایک کتا بھی ہے، اور ان میں سے اکثر کا گوشت اتر چکا ہے اور بعض آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، حالانکہ کئی صدیاں گزر چکی ہیں اور ہم نے ان کی شان اور حالت جاننے کے بارے کوئی آثار نہیں پائے۔ اور لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ اصحاب کہف ہیں، میں ان کے پاس داخل ہوا اور میں نے ان کے پاس ۵۰۴ھ لکھا ہوا دیکھا اور وہ اسی حالت میں تھے، اور وہاں ایک مسجد ہے، اور ان کے قریب ایک رومی عمارت ہے اس کا نام الرقیم ہے، گویا وہ ایک پرانا اور بوسیدہ محل ہے اس کی بعض دیواریں باقی ہیں، اور وہ زمین کے ایک جنگل میں ایک کھنڈر سا ہے، اور غرناطہ کے اوپر کی جانب جو کہ قبلہ کے ساتھ ملتی ہے پرانے رومی شہر کے آثار ہیں اس کو مدینہ دقیوس کہا جاتا ہے، ہم نے اس کے آثار میں عجیب و غریب قبریں اور اس طرح کی چیزیں دیکھی ہیں (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو اندلس میں ان کے متعلق دیکھنے کا ذکر کیا گیا ہے بلاشبہ وہ ان کے سوا ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اصحاب کہف کے حق میں فرماتا ہے: لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ۝ (الکہف) (اگر تو جھانک کر انہیں دیکھے تو ان سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑا ہو اور تو بھر جائے ان کے (منظر) کو دیکھ کر ہیبت سے) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس وقت کہا جب انہوں نے انہیں دیکھنے کا ارادہ کیا: تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس کو اس سے منع کیا ہے جو تم سے بہتر ہے (2)؛ عنقریب قصہ کے آخر میں اس کا ذکر آئے گا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے قول باری تعالیٰ:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 511

2۔ تفسیر الماوردی، جلد 2، صفحہ 293

کَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا کے بارے میں کہا ہے: وہ تعجب خیز ہیں (ھم عجبٌ)۔ اسی طرح ابن جریج نے ان سے روایت کیا ہے، آپ اس طرف جارہے ہیں کہ یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس بات کا انکار نہیں ہے کہ آپ کے نزدیک وہ تعجب خیز ہیں۔ اور ابن نجیح نے ان سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: وہ کہہ رہا ہے کہ وہ ہماری آیات سے زیادہ تعجب خیز نہیں ہے (1)۔

اِذْ اَوَی الْفِتْیَةُ اِلَی الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّ هَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا۝

''(یاد کرو) جب پناہ لی ان جوانوں نے غار میں پھر انہوں نے دعا مانگی اے ہمارے رب! ہمیں مرحمت فرما اپنی جناب سے رحمت اور مہیا فرما ہمارے لئے اس کام میں ہدایت۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِذْ اَوَی الْفِتْیَةُ اِلَی الْكَهْفِ روایت ہے کہ شہر دقیوس کے اشراف کی اولاد میں سے ایک قوم اور جماعت تھی اس شہر کا حاکم کافر تھا، [اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دقلیوس تھا] اور اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ دقنیوس تھا۔ اور روایت ہے کہ انہیں پگھلائے ہوئے سونے کا طوق اور کنگن پہنائے گئے تھے، وہ رومیوں میں سے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کی اتباع اور پیروی کرتے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے تھے۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا جس کو دقیانوس کہا جاتا ہے اس نے روم کے شہروں میں سے ایک شہر پر غلبہ پالیا، قبضہ کرلیا اس کو افسوس کہا جاتا ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ طرسوس ہے اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے بعد ہوا ہے چنانچہ اس نے بتوں کی پرستش کا حکم دیا اور اس شہر کے باسیوں کو بتوں کی پوجا کی دعوت دی، اور وہاں سات نوجوان تھے جو چھپ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے، پس ان کی خبر بادشاہ کے پاس پہنچادی گئی اور انہیں اس کا خوف لاحق ہوا تو وہ رات کے وقت بھاگ نکلے، اور ان کا گزر ایک چرواہے کے پاس سے ہوا اس کے ساتھ کتا تھا پس اس نے بھی ان کی اتباع کی اور انہوں نے ایک غار میں پناہ لی۔ پس بادشاہ ان کے پیچھے غار کے منہ تک پہنچ گیا، پس اس نے ان کے اندر داخل ہونے کے نشانات تو پائے لیکن باہر نکلنے کا کوئی نشان نہ پایا، پس وہ اندر (تلاش کے لئے) داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں کو اندھا کردیا اور انہیں کوئی شے نظر نہ آئی، تو بادشاہ نے کہا: تم ان پر غار کا درواز بند کردو یہاں تک کہ وہ اندر ہی بھوکے پیاسے مرجائیں گے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت کیا ہے کہ وہ جوان ایک ایسے بادشاہ کے دین میں تھے جو بتوں کی پوجا کرتا تھا اور ان کے لئے جانور ذبح کرتا تھا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتا تھا، اور اس بارے میں اہل شہر اس کی پیروی کرتے تھے، اور ان جوانوں کو بعض حواریوں کی جانب سے کچھ علم ہوا تھا جیسا کہ نقاش نے ذکر کیا ہے، یا ان سے پہلی امتوں کے مومنین کی طرف سے...... پس وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 228-227

اور انہوں نے اپنی بصیرت کے ساتھ لوگوں کے افعال کی قباحت کو دیکھ لیا، پس انہوں نے اپنے آپ کو دین اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ لازم کرلیا، اس کا پابند بنالیا؛ پس ان کا معاملہ بادشاہ کے پاس پیش کیا گیا، اور اس کو بتایا گیا کہ یہ جوان تیرے دین سے الگ ہوگئے ہیں اور یہ تیرے معبودوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ کفر کرتے ہیں، پس بادشاہ نے انہیں اپنی مجلس میں حاضر کیا اور انہیں اپنے دین کی پیروی کرنے اور اپنے الہوں کے لئے ذبح کرنے کا حکم دیا، اور علیحدہ ہونے کی صورت میں انہیں قتل کی دھمکی دی، تو انہوں نے اسے کہا جیسا کہ روایت کیا گیا ہے: رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا۝ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ لَوْ لَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا۝ وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ (الکہف)

اور روایت ہے کہ انہوں نے اس کلام کی طرح کہا نہ کہ یہ کلام کیا، تو بادشاہ نے انہیں کہا: بلاشبہ تم نوجوان ہو، ناتجربہ کار اور جاہل ہو، تمہاری عقل سمجھ نہیں ہے، اور میں تمہارے بارے میں کوئی جلدی فیصلہ نہیں کرتا بلکہ میں مہلت دیتا ہوں تم اپنے گھروں کو چلے جاؤ اور اپنے نظریہ میں تدبر کرو، خوب غور وفکر کرو اور میرے حکم کی طرف لوٹ آؤ (میرے دین کی طرف رجوع کرلو) اور اس نے اس بارے میں انہیں معین وقت دے دیا، پھر وہ اس مدت کے دوران سفر پر چلا گیا اور ان نوجوانوں نے اپنے دین سمیت بھاگنے کا مشورہ کیا، اور ان میں سے ایک نے انہیں کہا: بے شک میں فلاں پہاڑ میں ایک غار پہچانتا ہوں، میرا باپ اس میں اپنے ریوڑ لے جاتا تھا پس ہمیں چاہئے کہ ہم اس میں جائیں اور وہاں چھپ جائیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے کوئی راستہ کھول دے، پس روایت ہے کہ ہاکی اور گیند کھیلتے ہوئے نکلے، اور وہ اسے اپنے راستے کی طرف لڑھکاتے چلے گئے تاکہ لوگ ان کے بارے محسوس نہ کریں۔ اور روایت ہے کہ ان پر غلبہ پالیا گیا تھا پس ان کا ایک میلہ آگیا وہ اس کی طرف نکلے اور وہ بھی تمام لوگوں میں سوار ہوکر گئے، پھر وہ ہاکی اور گیند کے ساتھ کھیلنے میں لگ گئے یہاں تک کہ وہ ان سے الگ ہوگئے۔ اور وہب بن منبہ نے بیان کیا ہے کہ ان کے معاملے کا آغاز یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا ایک حواری اصحاب کہف کے شہر کی طرف آیا وہ اس میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتا تھا پس اس نے اپنے آپ کو ایک حمام والے کے پاس اجرت پر دے دیا اور اس میں کام کرتا رہا، اور حمام کے مالک نے اس کے کاموں میں بہت بڑی برکت دیکھی، پس اس نے اپنا سارا کام اس کے سپرد کردیا، اور اس آدمی کو اہل شہر میں سے چند نوجوانوں نے پہچان لیا۔ پس اس نے انہیں اللہ تعالیٰ کی پہچان کرائی اور وہ اس کے ساتھ ایمان لے آئے اور اس کے دین پر اس کی اتباع و پیروی کرنے لگے، اور ان کی اس کے ساتھ ملاقات اور میل جول مشہور ہوگیا پس ایک دن بادشاہ کا بیٹا ایک عورت کو ساتھ لے کر اس حمام کی طرف آیا اور اس نے اس کے ساتھ خلوت کا ارادہ کیا تو اس حواری نے اسے منع کیا اور وہ باز آگیا، پھر دوسری مرتبہ وہ آیا تو اس نے اسے منع کیا لیکن اس نے اسے گالی گلوچ دیں، اور اس نے حمام میں بدکاری کے ساتھ داخل ہونے کا اپنا عزم پورا کیا، پس وہ داخل ہوگیا اور وہ دونوں اکٹھے اس میں مرگئے اور اس حواری اور اس کے ساتھیوں پر ان دونوں کے قتل کی تہمت لگائی گئی، نتیجتاً وہ سارے کے سارے بھاگ گئے یہاں تک کہ ایک غار میں داخل ہوگئے۔ ان کے نکلنے کے بارے علاوہ ازیں بھی کئی اقوال کہے گئے

ہیں۔ اور رہا کتا! تو اس کے بارے روایت ہے کہ ان کا یہ شکاری کتا تھا، اور یہ بھی روایت ہے کہ انہوں نے اپنے راستے میں ایک چرواہے کو پایا اس کا کتا بھی تھا پس چرواہے نے ان کی رائے پر ان کی اتباع اور پیروی کی اور کتا بھی ان کے ساتھ چلا گیا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور کتے کا نام حمران تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام قطمیر تھا (1)۔

اور رہے اہل کہف کے اسماء تو وہ عجمی تھے، اور ان کی معرفت کی سند انتہائی کمزور اور ضعیف ہے۔ اور وہ جو علامہ طبری نے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے: مکسلمینا یہ ان میں سے بڑا تھا اور ان کی طرف سے بات کرتا تھا، محسیملنینا، یملیخا اور یہ وہ ہے جو چاندی لے کر شہر گیا تھا جس وقت وہ اپنی نیند سے اٹھے، مرطوس، کشوطوش، دینموس، یطونس اور بیرونس۔ مقاتل نے کہا ہے: کتا مکسلمینا کا تھا، اور یہ ان میں سے عمر کے لحاظ سے بڑا اور بکریوں کا مالک تھا۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت دین کے لئے فرار اختیار کرنے اور گھر والوں، اولاد، رشتہ داروں، دوستوں، اوطان اور اموال کے چھوڑنے کے بارے صریح ہے جبکہ فتنہ کا خوف ہو اور آدمی کو مشقت اور تکلیف میں سے پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم دین کی خاطر اپنے شہر سے ہجرت فرما ہوئے، اور اسی طرح آپ کے اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین، اور غار میں جا کر بیٹھ گئے جیسا کہ سورۃ النحل میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے سورۂ براۃ میں اس پر نص بیان کی ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور انہوں نے اپنے اوطان سے ہجرت کی اور اپنی زمین، اپنے گھر، اہل خانہ، اولاد، اپنے رشتہ دار اور اپنے بھائی سب دین کی سلامتی کی امید پر اور کافروں کے فتنہ سے نجات پانے کی خاطر چھوڑ دیئے۔ اور پہاڑوں میں سکونت اختیار کی، غاروں میں داخل ہوئے، مخلوق سے علیحدگی اختیار کی اور خالق کے ساتھ انفرادی طور پر خلوت میں رشتہ جوڑا۔ اور ظالم سے راہ فرار اختیار کرنے کا جواز تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات اور اولیاء کی سنت اور ان کا طریقہ ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنہائی کو فضیلت دی ہے، اور علماء کی ایک جماعت نے بھی اسے فضیلت دی ہے بالخصوص جس وقت فتنے اور لوگوں کے درمیان فساد ظاہر ہو رہا ہو، اور اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنی کتاب میں نص بیان کی ہے اور فرمایا ہے: فَأْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ۔ علماء نے کہا ہے: لوگوں سے جدائی اور علیحدگی کبھی پہاڑوں اور گھاٹیوں میں ہوتی ہے، اور کبھی سواحل اور سرحدوں کے قریب اور کبھی گھروں میں ہوتی ہے، تحقیق حدیث میں ہے: ''جب فتنہ برپا ہو تو اپنے رہنے کی جگہ کو مخفی رکھو اور اپنی زبان کو روک لو'' (2)۔ اور یہ کسی جگہ کے ساتھ خاص نہیں۔ اور علماء کی ایک جماعت نے عزلت اور تنہائی کو شر اور برائی سے علیحدگی قرار دیا ہے (اس طرح) کہ تو شر پھیلانے والوں سے اپنے دل اور اپنے عمل کے ساتھ علیحدہ اور جدا رہے اگرچہ تو ان کے درمیان رہ رہا ہو۔ اور ابن المبارک نے عزلت کی تفسیر میں کہا ہے کہ تو قوم کے ساتھ ہو پس جب وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مستغرق ہوں تو تو بھی ان کے ساتھ ذکر میں لگ جا، اور اگر وہ اس کے سوا کسی اور کام میں مصروف ہو جائیں تو تو خاموش رہ۔ اور علامہ بغوی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ مومن جو لوگوں کے ساتھ میل جول رکھتا ہے اور ان کی اذیت اور تکلیف رسانی پر صبر کرتا ہے وہ اس مومن سے افضل ہے جو ان کے ساتھ میل

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 499

2۔ سنن ابی داؤد، باب الامر والنھی، حدیث نمبر 3780، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جول نہیں رکھتا اور ان کی اذیت رسانی پر صبر نہیں کرتا''(1)۔ اور حضور نبی مکرم ﷺ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''مومنوں کے رہنے کی جگہیں ان کے گھر کتنے اچھے ہیں(2)''۔ یہ حسن وغیرہ کی مرسل روایات میں سے ہے۔ اور حضرت عقبہ بن عامر نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ نجات کس میں ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے عقبہ! اپنی زبان کو اپنے پاس روک کر رکھ، چاہیے کہ تیرا گھر تیرے لئے وسیع ہو اور تو اپنے گناہ اور خطا پر رویا کر(3)''۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا مسلمان آدمی کا بہترین مال ریوڑ ہو گا وہ ان کے پیچھے پہاڑوں کی گھاٹیوں اور بارش کی جگہوں کی طرف جائے گا اور اپنے دین کو فتنوں سے بچالے گا(4)''۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

اور علی بن سعد نے حسن بن واقد سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب ۱۸۰ھ ہوگا تو میری امت کے لئے (شہروں سے) دور پہاڑوں کی چوٹیوں میں خلوت گزینی اور رہبانیت اختیار کرنا حلال ہو گا(5)''۔ اور علی بن سعد ہی عبداللہ بن مبارک سے انہوں نے مبارک بن فضالہ سے اور انہوں نے حضرت حسن سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ تک مرفوع روایت بیان کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا اس میں کسی دیندار کا دین سلامت نہیں رہے گا سوائے اس کے جو اپنا دین لے کر ایک بلند جگہ سے دوسری بلند جگہ کی طرف یا ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف چلا گیا، فرار ہو گیا۔ پس جب ایسا ہوا تو معیشت نہیں پائی جائے گی مگر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور معصیت کے ساتھ۔ پس جب ایسا ہوا تو (شہروں سے) دور بھاگنا حلال ہو گا(6)''۔ صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ دور بھاگنا کیسے حلال ہو گا حالانکہ آپ تو ہمیں ترویج اور اشاعت کا حکم دیتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب ایسا ہو گا تو آدمی کا فساد اور اس کی بربادی اس کے والدین کے سامنے ہوگی اور اگر اس کے والدین نہ ہوئے تو اس کی ہلاکت اس کی بیوی کے سامنے ہوگی اور اگر اس کی بیوی نہ ہوئی تو اس کی ہلاکت اس کی اولاد کے سامنے ہوگی اور اگر اس کی اولاد نہ ہوئی تو اس کی ہلاکت رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے سامنے ہوگی''۔ انہوں نے عرض کی: یہ کیسے ہو گا یا رسول اللہ ﷺ؟ فرمایا: وہ اسے معیشت کی تنگی کی مار دلائیں گے اور اسے ایسی چیز کا مکلف اور پابند بنائیں گے جس کی اس میں طاقت نہ ہوگی تو اس وقت اپنے آپ کو ایسی جگہوں میں لے آئے گا جہاں وہ ہلاک ہو جائے گا(7)''۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: لوگوں کے احوال اس باب میں مختلف ہوتے ہیں، پس کتنے لوگ ہوتے ہیں جن میں پہاڑوں کی غاروں اور کھوؤں میں سکونت اختیار کرنے کی قوت اور طاقت ہوتی ہے، اور یہ احوال میں سے سب سے ارفع اور اعلیٰ ہے کیونکہ یہ وہ حالت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے لئے آپ کی نبوت کے آغاز اور شروع میں پسند فرمایا، اور اس پر جوانوں سے

1۔ جامع ترمذی، باب فی صفة أوانی الحوض، حدیث نمبر 2431۔ ایضاً سنن ابن ماجہ، باب الصبر علی البلاء، حدیث 4021، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، الصبر علی البلاء، صفحہ 301

3۔ جامع ترمذی، کتاب الزھد، ما جاء فی حفظ اللسان، جلد 2، صفحہ 63۔ ایضاً، حدیث نمبر 2330، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، من الدین الفرار من الفتن، جلد 1، صفحہ 7

5۔ الفردوس بماثور الخطاب، جلد 5، صفحہ 448-447، حدیث 8697 6۔ ایضاً 7۔ ایضاً

بارے خبر دیتے ہوئے اپنی کتاب میں نص بیان فرمائی ہے، اور ارشاد فرمایا: وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ (اور جب تم الگ ہو گئے ہو ان (کفار) سے اور ان معبودوں سے جن کی یہ پوجا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا تو اب پناہ لو غار میں۔) اور کئی لوگ ہوتے ہیں جن کے لئے اپنے گھر میں عزلت اور علیحدگی اختیار کرنا زیادہ آسان اور سہل ہوتا ہے، اہل بدر میں سے کتنے لوگ تھے جنہوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اپنے گھروں کو لازم پکڑ لیا اور پھر وہ اپنی قبروں کی طرف جانے سے پہلے اپنے گھروں سے نہیں نکلے۔ اور کچھ لوگ ان دونوں قسم کے لوگوں کے درمیان ہوتے ہیں اور ان میں اتنی قوت ہوتی ہے جس کے ساتھ وہ لوگوں کے ساتھ ملتے جلتے بھی ہیں اور ان کی اذیت رسانی پر صبر بھی کرتے ہیں۔ پس وہ بظاہر ان کے ساتھ ہوتے ہیں اور باطن میں ان کے مخالف ہوتے ہیں۔ اور ابن مبارک نے ذکر کیا ہے کہ وہیب بن الورد نے ہمیں بیان کیا ہے کہ ایک آدمی حضرت وہب بن منبہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا: بے شک لوگ اس میں واقع ہو گئے ہیں جس میں وہ واقع ہو گئے ہیں! اور میں نے اپنے دل میں خیال کیا ہے کہ میں ان سے نہیں ملوں گا۔ تو آپ نے فرمایا: تو ایسا نہ کر۔ بلاشبہ تیرے لئے لوگوں سے کوئی چارہ نہیں ہے، اور نہ ہی ان کا تجھ سے کوئی چارہ ہے، تیری ان کے ساتھ حاجات دضروریات ہیں، اور ان کی تجھ سے حاجات ہیں، لیکن تو ان میں اس طرح رہ کہ تو سننے سے بہرہ ہو، دیکھنے سے اندھا ہو، اور بولنے کے اعتبار سے ساکن اور خاموش ہو۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک ہر جگہ جس میں آدمی لوگوں سے دور رہتا ہے وہ پہاڑوں اور گھاٹیوں کے معنی میں ہے، مثلاً مساجد میں اعتکاف کرنا، ساحلوں کو رہائش اور ذکر کے لئے لازم پکڑنا، اور لوگوں کے شر سے بچنے کے لئے گھروں میں بیٹھ رہنا وغیرہ۔ اور احادیث میں گھاٹیوں، پہاڑوں، اور ریوڑ کے پیچھے جانے کا جو ذکر آیا ہے...... واللہ اعلم...... وہ اس لئے ہی ہے کہ یہ اغلباً وہ جگہیں ہیں جن میں خلوت اور علیحدگی اختیار کی جاتی ہے، پس ہر وہ جگہ جو لوگوں سے دور رکھتی ہے تو وہ اس معنی میں داخل ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ واللہ الموفق وبہ العصمۃ۔

اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''تیرا رب اس سے راضی اور خوش ہوتا ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر بکریاں چراتا ہے، نماز کے لئے اذان کہتا ہے اور نماز پڑھتا ہے تو اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے: دیکھو میرے بندے کی طرف وہ اذان کہہ رہا ہے، اور نماز قائم کر رہا ہے، وہ مجھ سے ڈرتا ہے تحقیق میں نے اپنے بندے کو بخش دیا اور میں نے اسے جنت میں داخل کر لیا(1)''۔ اسے نسائی نے نقل کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا جب وہ اس سے بھاگ نکلے جو انہیں تلاش کر رہا تھا تو وہ دعا میں مشغول ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پناہ لی اور عرض کی: رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً یعنی اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنی جناب سے مغفرت اور رزق عطا فرما۔ وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا اور ہمیں ہدایت کی توفیق عطا فرما۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ہمیں سلامتی کے ساتھ غار سے نکلنے کی راہ عطا فرما۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہمارے اس کام میں درست (سمت) عطا فرما۔ اور اسی معنی کے مطابق جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی پریشان کن اور غمزدہ کر دینے والا

1۔ سنن نسائی، کتاب الاذان، جلد 1، صفحہ 108۔ ایضاً سنن ابی داؤد، باب الأذان فی السفر، حدیث نمبر 1017، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

امر پیش آتا، تو آپ نماز کی طرف متوجہ ہوتے اور (اللہ کریم کی بارگاہ میں دعا کرتے۔)

فَضَرَبْنَا عَلَىٰٓ اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ﴿۱۱﴾

”پس ہم نے بند کر دیئے ان کے کان (سننے سے) اس غار میں کئی سال تک جو گنے ہوئے تھے۔“

یہ ان پر اللہ تعالیٰ کے نیند مسلط کر دینے سے عبارت ہے۔ اور یہ قرآن کریم کی ان فصیح آیات میں سے ہے جن کی مثل لانے سے قاصر ہونے کے بارے میں عربوں نے اقرار کیا۔ زجاج نے کہا ہے: یعنی ہم نے انہیں اس سے روک دیا کہ وہ کوئی آواز سنیں، کیونکہ سونے والا جب کوئی سنتا ہے تو وہ بیدار ہو جاتا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ہم نے ان کے کان نیند کے ساتھ بند کر دیئے، یعنی ہم نے ان کے کان بند کر دیئے اس سے کہ ان تک آوازیں پہنچیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے فَضَرَبْنَا عَلَىٰٓ اٰذَانِهِمْ یعنی ہم نے ان کی دعا قبول کر لی، اور ان سے ان کی قوم کا شر پھیر دیا اور ہم نے انہیں سلا دیا۔ اور یہ تمام معنی باہم قریب قریب ہیں۔ اور قطرب نے کہا ہے: یہ عربوں کے اس قول کی طرح ہے ضرب الامیر علی ید الرعیة (یہ تب کہا جاتا ہے) جب وہ انہیں فساد اور بگاڑ سے روک دے، اور ضرب السید علی ید عبدہ المأذون لہ فی التجارة (یہ تب کہا جاتا ہے) جب وہ اسے تصرف سے روک دے۔

اسود بن یعفر نے کہا ہے اور وہ اندھا تھا:

و من الحوادث لا أبالك أنني ضُرِبَتْ علی الأرضُ بالأسدادِ

اور رہی کانوں کی ذکر کے ساتھ تخصیص تو یہ وہ عضو ہے جس کے ساتھ نیند میں بہت بڑا فساد اور خرابی لازم آتی ہے۔ اور اکثر اوقات سونے والے کی نیند اس کے کان کی جہت سے ہی ختم ہوتی ہے، اور نیند مستحکم اور پختہ نہیں ہوتی مگر اسی کی جس کا آواز کو سننا معطل اور بند ہو جائے۔ اور نیند میں کانوں کے ذکر کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ذاك رجل بال الشیطان فی أذنه(1) (وہ آدمی ہے جس کے کان میں شیطان نے پیشاب کر دیا) اسے صحیح نے نقل کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے طویل نیند سونے والے آدمی کی طرف اشارہ کیا ہے، جو رات کو نہیں اٹھتا۔ اور عَدَدًا یہ سنین کی صفت اور نعت ہے(2)، یعنی سال گنے ہوئے ہیں۔ اور اس سے مقصود کثرت کو بیان کرنا ہے، کیونکہ قلیل تو عدد کا محتاج نہیں ہوتا کیونکہ وہ معروف ہے۔ اور العَدُّ مصدر ہے، اور العدد معدود کا اسم ہے جیسا کہ النفض اور الخَبَط ہیں۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: عَدَدًا مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ پھر ایک قوم نے کہا ہے: اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان سالوں کی تعداد بیان فرمائی اور ارشاد فرمایا: وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿﴾ (الکہف) (اور (اہل کتاب کہتے ہیں کہ) ٹھہرے رہے اپنے غار میں تین سو سال اور زیادہ کئے انہوں نے (اس پر) نو سال۔)

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ﴿۱۲﴾

1۔ صحیح بخاری، کتاب التہجد، إذا نام لم یصل بال الشیطان فی أذنه، جلد 1، صفحہ 153

2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 500

''پھر ہم نے انہیں بیدار کر دیا تا کہ ہم دیکھیں کہ ان دو گروہوں میں سے کون صحیح شمار کر سکتا ہے اس مدت کا جو وہ (غار میں) ٹھہرے تھے''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ پھر ہم نے انہیں نیند سے بیدار کر دیا۔ اور جس آدمی کو نیند سے اٹھایا یا بیدار کیا جائے تو اسے مبعوث کہا جاتا ہے، کیونکہ اسے اٹھنے اور تصرف کرنے سے روک دیا گیا تھا۔

قولہ تعالیٰ: لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰى، لِنَعْلَمَ یہ اس شے کے وجود اور مشاہدہ کی طرف نکلنے سے عبارت ہے؛ اور یہ عرب کلام کے طریقہ پر ہے، یعنی تا کہ ہم جان لیں وہ موجود ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے دو گروہوں میں سے کون صحیح شمار کر سکتا ہے۔ اور زہری نے لیعمم یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور الحزبان کا معنی دو فریق ہیں۔ اور آیت سے یہ ظاہر ہے کہ ایک گروہ ان نوجوانوں کا ہے جنہوں نے یہ گمان کیا کہ وہ تھوڑا سا ٹھہرے ہیں۔ اور دوسرا فریق ان شہر والوں کا ہے جن کے عہد میں ان جوانوں کو بیدار کیا گیا، اس وقت ان کے پاس جوانوں کے معاملے کی تاریخ تھی۔ یہ جمہور مفسرین کا قول ہے۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: یہ کافروں کے دو گروہ ہیں، جنہوں نے اصحاب کہف کی مدت میں اختلاف کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ دونوں مومنین کے گروہ ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں جن کا آیت کے الفاظ کے ساتھ کوئی ربط نہیں۔ اور اَحْصٰى فعل ماضی ہے۔ اور اَمَدًا مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے(1)؛ یہ ابوعلی نے کہا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: یہ تمیز کی بنا پر منصوب ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ ظرف کی بنا پر منصوب ہے، یعنی دو گروہوں میں سے کون سے گروہ نے ان کے ٹھہرنے کی انتہائی مدت شمار کی ہے، اور الامد کا معنی غایت اور انتہا ہے۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: اَمَدًا اس کا معنی عدداً (گننا) ہے، اور یہ تفسیر قریبی معنی کے اعتبار سے ہے(2)۔ اور علامہ طبری نے کہا ہے: اَمَدًا، لَبِثُوْٓا کی وجہ سے منصوب ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قابل توجہ نہیں ہے(3)۔ اور رہا وہ جس نے کہا ہے کہ یہ تفسیر کی بنا پر منصوب ہے تو اس نے اسے اس اختلال اور خرابی کے ساتھ ملا دیا ہے کہ اُفعل کا صیغہ فعل رباعی سے نہیں آتا مگر شاذ صورت میں، اور اَحْصٰى فعل رباعی ہے۔ اور اس کے لئے یہ کہہ کر استدلال کیا جاتا ہے: بے شک رباعی میں اُفعل کا صیغہ کثیر ہوتا ہے، جیسے تیرا یہ قول: ما أعطاه للمال و آتاه للخير (اس نے اسے مال نہیں دیا اور اسے خیر اور بھلائی دی) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حوض کی صفت میں فرمایا: ماؤہ أبيض من اللبن(4) (اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید ہوگا)۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: فهو لما سواها أضيع(5) (پس وہ اس کے ماسوا کو زیادہ ضائع کرنے والا ہے)۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْیَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًی ۝۱۳

''(اے حبیب!) ہم بیان کرتے ہیں آپ سے ان کی خبر ٹھیک ٹھیک، بے شک وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کے (نور) ہدایت میں اضافہ کر دیا''۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 500　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً
4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزهد، ذکر الحوض، صفحہ 328　5۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 500

قولہ تعالیٰ: نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ جب قول باری تعالیٰ: لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى نوجوانوں کے ٹھہرے رہنے کی مدت میں واقع ہونے والے اختلاف کا تقاضا کرتا ہے، اس کے پیچھے یہ خبر بیان کی کہ اللہ عزوجل ان کے بارے اس حق کو جانتا ہے جو امر واقع ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ یعنی وہ جوان اور نئی عمر کے لوگ ہیں ان کے لئے جوانی کا حکم تھا اس وقت جب وہ بلا واسطہ ایمان لائے، اسی طرح اہل زبان نے کہا ہے: الفتوۃ (سخاوت) اصل ایمان ہے۔ اور حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: الفتوۃ کا معنی سخاوت کرنا، اذیت کو روکنا اور شکایت کو ترک کرنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الفتوۃ کا معنی محارم سے اجتناب کرنا اور مکارم اور فیاضی میں جلدی کرنا۔ اور اس کے علاوہ بھی اقوال کہے گئے ہیں۔

اور یہ قول بہت اچھا ہے؛ کیونکہ یہ ان تمام معانی کو جامع ہے جو الفتوۃ کے ضمن میں کہے گئے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَزِدْنٰهُمْ هُدًى یعنی ہم نے ان کے لئے عمل صالح آسان کر دیا، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے، لوگوں سے دوری اختیار کرنے، اور دنیا میں زہد اختیار کرنے کے سبب۔ اور یہی ایمان پر زیادتی ہے۔ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ کریم نے چرواہے کے کتے کے ساتھ ان کے نور ہدایت میں اضافہ کر دیا جس وقت انہوں نے اسے بھگایا اور اس خوف سے اسے پتھر مارے کہ وہ ان پر بھونکے گا اور ان کے بارے آگاہ کر دے گا، پس کتے نے دعا مانگنے والے کی طرح اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے تو اللہ تعالیٰ نے اسے قوت گویائی عطا فرما دی، تو اس نے کہا: اے قوم! تم مجھے کیوں بھگاتے ہو؟ تم مجھ پر کیوں پتھر پھینکتے ہو؟ تم مجھے کیوں مارتے ہو؟ قسم بخدا! تحقیق میں نے اللہ تعالیٰ کو تمہارے اسے پہچاننے سے چالیس سال پہلے پہچان لیا تھا، پس اس کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان کے نور ہدایت میں اضافہ کر دیا۔

وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ۝

”اور ہم نے مضبوط کر دیا ان کے دلوں کو جب وہ راہ حق میں کھڑے ہو گئے تو انہوں نے (برملا) کہہ دیا ہمارا پروردگار وہ ہے جو پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا ہم ہرگز نہیں پکاریں گے اس کے سوا کسی معبود کو (اگر ہم ایسا کریں) تو گویا ہم نے ایسی بات کہی جو حق سے دور ہے۔“

قولہ تعالیٰ: وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ یہ پختہ عزم اور قوت صبر سے عبارت ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ عطا فرمایا یہاں تک کہ انہوں نے کفار کے سامنے کہہ دیا: رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا اور جب گھبراہٹ اور سانس کا ٹوٹنا، کمزور ہو جانا تناسب کے اعتبار سے کھلنے کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے تو پھر سانس کی مضبوطی اور قوت ارادی کی شدت کا ربط (باندھنے) کے مشابہ ہونا زیادہ حسین ہے، اور اسی سے کہا جاتا ہے: فلان رابط الجاش، جب گھبراہٹ اور جنگ وغیرہ کے وقت اس کا سانس متفرق نہ ہو۔ اور اسی سے الربط علی قلب ام موسیٰ بھی ہے۔ اور قول باری تعالیٰ بھی ہے: وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ۝ (الانفال) (اور مضبوط کر دے تمہارے دلوں کو اور جما دے اس سے تمہارے قدموں کو)۔ اس کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا یہ تین معنوں کا احتمال رکھتا ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ کافر بادشاہ کے سامنے ان کے کھڑے ہونے کا وصف اور بیان ہو...... جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، اور یہ وہ مقام ہے جہاں دل کو مضبوط کرنے کی حاجت اور ضرورت تھی جہاں انہوں نے اس کے دین کی مخالفت کی، اور اللہ تعالیٰ کی ذات کی خاطر اس کے خوف اور ڈر کو چھوڑ دیا۔ اور اس میں دوسرا معنی یہ ہے جو کہا گیا ہے: بے شک وہ اس شہر کے اشراف کے بچے تھے، پس وہ نکلے اور اس شہر سے باہر بغیر کسی وعدہ کے اکٹھے ہوئے، تو ان میں سے عمر کے اعتبار سے جو بڑا تھا اس نے کہا: بلاشبہ میں اپنے دل میں یہ پا رہا ہوں کہ میرا رب وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، تو انہوں نے کہا: ہم بھی اپنے نفسوں میں اسی طرح پاتے ہیں۔ پس وہ سارے کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا: رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا یعنی اگر ہم اس کے سوا کسی الٰہ کو پکاریں تو ہم کہتے ہیں کہ وہ ظلم اور محال ہے۔ اور تیسرا معنی یہ ہے کہ ان کے پورے عزم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے لئے اٹھ کر راہ فرار اختیار کرنے اور لوگوں کو چھوڑ دینے کو قیام (کھڑا ہونے) کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: قام فلان إلی أمر کذا (یہ تب کہا جاتا ہے) جب آدمی انتہائی کوشش کے ساتھ کسی کام کے لئے پرعزم ہو جائے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: قیام اور قوم میں صوفیہ نے اس قول کے ساتھ تعلق قائم کیا ہے: اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔(1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ تعلق صحیح نہیں ہے۔ وہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر اس کا ذکر کیا، اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اس دولت اور انعام و فضل کا شکر ادا کیا جو اس نے ان پر فرمایا، پھر انہوں نے لوگوں سے تعلق توڑ کر اپنے رب کی طرف اپنے چہروں کو موڑنے کا قصد کیا اس حال میں کہ وہ اپنی قوم سے خوفزدہ تھے، اور انبیاء و رسل علیہم الصلوات والتسلیمات اور اولیاء وفضلاء میں یہی اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ یہ زمین پر پاؤں مارنے اور آستینوں کے ساتھ رقص کرنے سے کہاں حاصل ہوتا ہے اور بالخصوص اس زمانے میں بے ریش بچوں اور عورتوں کی حسین اور خوبصورت آوازیں سننے کے وقت (جو کیفیت ہوتی ہے)۔ قسم بخدا! ان دونوں کے درمیان اتنا بعد ہے جتنا زمین و آسمان کے درمیان ہے۔ پھر یہ علماء کی ایک جماعت کے نزدیک حرام ہے، اس کا بیان سورۂ لقمان میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور سورۂ سبحان میں قول باری تعالیٰ: وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا (الاسراء: 37) کے تحت گزر چکا ہے۔ جو کافی ہے۔

اور امام ابو الطرسوی نے اس وقت کہا جب ان سے صوفیہ کے مذہب کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: رہا رقص اور وجد کرنا سب سے پہلے سامری کے ساتھیوں نے اس کا آغاز کیا، جب اس نے ان کے لئے بچھڑے کا جسم بنایا اور وہ ڈکارنے لگا تو وہ کھڑے ہوئے اور اس کے اردگرد رقص کرنے لگے اور مل کر وجد کرنے لگے، پس یہ کفار کا دین ہے اور بچھڑے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 501

کی پرستش کرنے والوں کا دین ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ لَوْ لَا یَاْتُوْنَ عَلَیْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَیِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ﴿۱۵﴾

''یہ ہماری قوم ہے جنہوں نے بنالیا ہے اس کے سوا غیروں کو (اپنے) خدا، کیوں نہیں پیش کرتے ان (کی خدائی) پر کوئی ایسی دلیل جو روشن ہو، ورنہ پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً یعنی ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: ہماری قوم ہے، یعنی یہ ہمارے زمانے اور ہمارے شہر کے لوگ ہیں، بتوں کی عبادت کرتے ہیں بغیر حجت کے محض تقلید کرتے ہوئے۔ لَوْ لَا یعنی ھلا (کیوں نہیں) یَاْتُوْنَ عَلَیْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَیِّنٍ یعنی اپنے بتوں کی عبادت کرنے پر کوئی دلیل کیوں نہیں پیش کرتے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: عَلَیْهِمْ یہ ضمیر ان کے الہوں کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی وہ بتوں کے الٰہ ہونے پر کوئی دلیل کیوں نہیں قائم کرتے، پس ان کا قول: لَوْ لَا یہ تخصیص یعنی تعجیز ہے، اور جب ان کے لئے یہ ممکن نہیں تو پھر واجب نہیں کہ ان کے دعویٰ کی طرف توجہ کی جائے۔

وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ یَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ یُهَیِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿۱۶﴾

''اور جب تم الگ ہو گئے ان (کفار) سے اور ان معبودوں سے جن کی یہ پوجا کرتے ہیں اللہ کے سوا، تو اب پناہ لو غار میں پھیلا دے گا تمہارے لئے تمہارا رب اپنی رحمت (کا دامن) اور مہیا کر دے گا تمہارے لئے تمہارے اس کام میں آسانیاں۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ کہا گیا ہے کہ یہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، یعنی جب تم ان سے الگ ہو گئے تو غار میں پناہ لو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کے سردار تملیخا کا قول ہے؛ جیسا کہ ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے۔ اور غزنوی نے کہا ہے: ان کا رئیس مکسلمینا تھا، اس نے ان کو یہ کہا، یعنی جب تم ان سے الگ ہو گئے ہو اور تم ان سے الگ ہو گئے ہو جن کی وہ عبادت کرتے ہیں۔ پھر استثنا کی اور کہا اِلَّا اللّٰهَ یعنی بے شک تم اس (اللہ تعالیٰ) کی عبادت کو نہ چھوڑو، پس یہ استثنا منقطع ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اور یہ اس تقدیر پر ہے کہ بے شک وہ لوگ جن سے اصحاب کہف فرار ہوئے وہ اللہ تعالیٰ کو نہ پہچانتے تھے، اور نہ انہیں اس کے بارے کوئی علم تھا اور وہ صرف بتوں کی خدائی کے بارے اعتقاد رکھتے تھے۔ اور اگر ہم فرض کریں کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پہچانتے تھے جیسا کہ عرب کرتے ہیں لیکن وہ اپنے بتوں کو اس کے ساتھ عبادت میں شریک ٹھہراتے تھے تو پھر استثنا متصل ہوگا، کیونکہ جدائی ہر اس کے حق میں واقع ہوئی جس کی کفار عبادت کرتے ہیں سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں وَ مَا یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے (1): یہ اس کی تفسیر ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 502

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور اس پر وہ دلالت کرتا ہے جو ابونعیم الحافظ نے عطا خراسانی سے قول باری تعالیٰ: وَ اِذِ اعۡتَزَلۡتُمُوۡهُمۡ وَ مَا يَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ کے تحت ذکر کیا ہے انہوں نے کہا ہے: یہ اس قوم کے جوان تھے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر معبودان باطلہ کی بھی عبادت کرتے تھے پس وہ جوان ان معبودوں کی عبادت سے الگ ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت سے الگ نہ ہوئے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے (1): پس اس بنا پر جو قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اِلَّا بمعنی غیر ہوگا، اور قول باری تعالیٰ: وَ مَا يَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ میں مَا محل نصب میں ہوگا اور اس کا عطف اعۡتَزَلۡتُمُوۡهُمۡ کی ضمیر پر ہوگا۔ اور یہ آیت اس معنی کو متضمن ہوگی کہ ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: جب ہم کفار سے جدا اور الگ ہو گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لئے منفرد ہو گئے ہیں تو ہمیں چاہئے کہ ہم غار کو پناہ گاہ بنالیں اور ہم اللہ تعالیٰ پر توکل کریں، کیونکہ وہ ہمارے لئے اپنی رحمت پھیلا دے گا، اور اسے ہمارے اوپر بکھیر دے گا اور ہمارے لئے ہمارے معاملہ میں آسانی مہیا فرما دے گا۔ اور یہ سب کی سب دنیا کے اعتبار سے دعا ہے۔ اور انہیں اپنی آخرت کے بارے میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور یقین تھا۔ ابوجعفر محمد بن علی بن حسین رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اصحاب کہف تلواریں صیقل اور تیز کرتے تھے اور اس غار کا نام حیوم تھا۔ مِّرۡفَقًا اسے میم کے کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے مراد وہ چیز ہے جس کے ساتھ ٹیک لگائی جاتی ہے۔ اس طرح مِرفق الانسان اور مَرفِق الانسان ہے (آدمی کی کہنی) اور ان میں سے بعض المرفق میم کے فتحہ اور فا کے کسرہ کے ساتھ اس کو امر سے بناتے ہیں اور المرفق من الانسان کہا گیا ہے کہ اگر میم کے فتحہ کے ساتھ ہو تو یہ ظرف مکان ہے جیسا کہ مسجد اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔

وَ تَرَى الشَّمۡسَ اِذَا طَلَعَتۡ تَّزٰوَرُ عَنۡ كَهۡفِهِمۡ ذَاتَ الۡيَمِيۡنِ وَ اِذَا غَرَبَتۡ تَّقۡرِضُهُمۡ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمۡ فِىۡ فَجۡوَةٍ مِّنۡهُ‌ ؕ ذٰلِكَ مِنۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ‌ ؕ مَنۡ يَّهۡدِ اللّٰهُ فَهُوَ الۡمُهۡتَدِ‌ ۚ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرۡشِدًا ﴿۱۷﴾ وَتَحۡسَبُهُمۡ اَيۡقَاظًا وَّهُمۡ رُقُوۡدٌ ۖ ۗ وَّنُقَلِّبُهُمۡ ذَاتَ الۡيَمِيۡنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ‌ ۖ وَكَلۡبُهُمۡ بَاسِطٌ ذِرَاعَيۡهِ بِالۡوَصِيۡدِ‌ ؕ لَوِ اطَّلَعۡتَ عَلَيۡهِمۡ لَوَلَّيۡتَ مِنۡهُمۡ فِرَارًا وَّلَمُلِئۡتَ مِنۡهُمۡ رُعۡبًا ﴿۱۸﴾

''اور تو دیکھے گا سورج کو جب وہ ابھرتا ہے تو وہ ہٹ کر گزرتا ہے ان کی غار سے دائیں جانب اور جب وہ ڈوبتا ہے تو بائیں طرف کتراتا ہوا ڈوبتا ہے، اور وہ (سو رہے) ہیں ایک کشادہ جگہ غار میں، (سورج کا) یوں (طلوع وغروب) اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے، (حقیقت یہ ہے) کہ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ گمراہ کردے تو تو نہیں پائے گا اس کے لئے کوئی مددگار (اور) رہنما۔ اور (اگر تو دیکھے تو) تو انہیں بیدار خیال کرے گا حالانکہ وہ سو رہے ہیں، اور ہم ان کی کروٹ بدلتے رہتے ہیں (کبھی) دائیں جانب اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 502

(کبھی) بائیں جانب اوران کا کتا پھیلائے بیٹھا ہے اپنے دونوں بازوان کی دہلیز پر، اگر تو جھانک کر انہیں دیکھے
توان سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑا ہو اور تو بھر جائے ان کے (منظر) کو دیکھ کر ہیبت سے۔"

قولہ تعالیٰ: وَ تَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ یعنی اے مخاطب! تو سورج کو دیکھے گا کہ وہ اپنے طلوع کے وقت ان کی غار سے جھک کر اور ہٹ کر گزرتا ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے: بلاشبہ اگر تو انہیں دیکھے تو یقیناً تو انہیں اسی طرح دیکھے نہ یہ کہ مخاطب نے انہیں فی الحقیقت دیکھا۔ اور تَّزٰوَرُ کا معنی دور ہٹ جانا اور مائل ہونا، جھک جانا ہے، یہ الازورار سے ماخوذ ہے۔ اور الزّوَر کا معنی جھکنا ہے۔ اور الأزور فی العین نظر سے ایک طرف ہٹ جانے والا، اور غیرعین میں بھی یہ استعمال ہوسکتا ہے، جیسا کہ ابن ابی ربیعہ نے کہا ہے:

وَ جَنْبِي خِيفَةَ الْقَوْمِ أَزْوَرُ (میرا پہلو قوم کے خوف سے ایک طرف جھک گیا ہے)۔

اور عنترہ کے قول کے لفظ ہیں:

فازور من وقع القَنَا بلبانه(1) (وہ اپنے سینے کے بل گر پڑے جسے نیزہ لگا)

اور غزوہ موتہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی چارپائی کو حضرت جعفر اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کی چارپائی سے دور ہٹا ہوا (ایک طرف پڑا ہوا) دیکھا۔ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رأى فی سریر عبداللہ بن رواحہ ازورارا عن سریر جعفر و زید بن حارثہ (2)۔ اہل حرمین اور ابوعمر نے تزّاور تا کو زاء میں ادغام کر کے پڑھا ہے، اور یہ اصل میں تتزاور ہے۔ اور عاصم، حمزہ اور کسائی نے تَزَاوَرُ زا کو مخفف پڑھا ہے۔ اور ابن عامر نے تَزْوَرُّ، تحمر کی مثل پڑھا ہے۔ اور فراء نے تزوَاز، تحمار کی مثل بیان کیا ہے، تمام ایک ہی معنی میں ہیں۔ وَ اِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ جمہور نے اسے تا کے ساتھ تترکھم کے معنی میں پڑھا ہے (اور جب وہ غروب ہوتا ہے تو وہ انہیں چھوڑ دیتا ہے)! یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے(3)۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: بمعنی تدعھم (4) (وہ انہیں چھوڑ دیتا ہے) نحاس نے کہا ہے: یہی معنی لغت میں معروف ہے، بصریوں نے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: قرضہ یقرضہ جب وہ اسے ترک کر دے اور اس کا معنی ہے کہ اس کی عزت و تکریم کے لئے انہیں دھوپ بالکل نہیں پہنچتی، اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے، یعنی سورج جب طلوع ہوتا ہے تو ان کی غار سے دائیں جانب ہٹ جاتا ہے، اور جب غروب ہوتا ہے تو غار کے بائیں جانب سے ہو کر ان سے گزر جاتا ہے، پس انہیں دھوپ نہیں لگتی نہ دن کے ابتدائی حصہ میں اور نہ دن کے آخری حصہ میں اور ان کی غار سرزمین روم میں بنات نعش (قطب شمالی کے قریب سات ستارے) کے سامنے تھی۔ پس سورج طلوع وغروب اور چلتے وقت ان سے ہٹ جاتا تھا ان تک نہ پہنچتا تھا کہ انہیں اپنی گرمی اور حرارت سے اذیت پہنچائے، ان کے رنگوں کو متغیر کرے اور ان کے کپڑوں کو بوسیدہ کرے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک ان کی غار کے لئے ایک پردہ جنوب کی جانب سے تھا اور ایک پردہ دبور (پچھوائی ہوا) کی جہت سے تھا اور وہ اس کے کونے میں تھے۔ اور زجاج اس طرف گئے ہیں کہ سورج کا یہ فعل اللہ تعالیٰ کی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 502 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 503 3۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 245 4۔ ایضاً

طرف سے ایک نشانی ہے، نہ یہ کہ غار کا دروازہ اس جانب تھا جو یہ ثابت کرتی ہے (1)۔ اور ایک گروہ نے یَقْرِضُھم یا کے ساتھ قرأت کی ہے اور یہ القرض سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی قطع کرنا، کاٹنا ہے، یعنی غار اپنے سائے کے ساتھ سورج کی روشنی سے انہیں بچاتی ہے (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ یعنی جب وہ ڈوبتا ہے تو اس کی تھوڑی سی دھوپ انہیں لگتی ہے، یہ قُراضة الذهب والفضة (سونے اور چاندی کے ریزے) سے ماخوذ ہے، یعنی سورج اپنی تھوڑی سی شعاعیں انہیں پہنچاتا ہے۔ اور انہوں نے کہا: شام کے وقت دھوپ کے ان کو مس کرنے اور پہنچنے میں ان کے بدنوں کی اصلاح تھی۔ المختصر اس میں آیت اور علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی غار میں پناہ دی جس کی کیفیت اور حالت یہ تھی نہ کہ کسی دوسری غار میں جس میں بڑے دنوں میں سورج کی شعاعیں پڑنے سے وہ اذیت اور تکلیف محسوس کرتے۔ اور اس پر یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ سورج کا ان سے پھرنا، ایک طرف ہٹنا بادلوں کے سایہ کرنے یا کسی دوسرے سبب سے ہو، اور مقصود ان تک کسی بلا اور مصیبت کے راہ پانے، بدنوں اور رنگوں کے متغیر اور تبدیل ہونے، اور گرمی یا سردی کے ساتھ اذیت پہنچنے سے انہیں بچانے اور ان کی حفاظت کرنے کا بیان ہے۔ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ اور وہ غار کی ایک کشادہ جگہ میں سو رہے ہیں۔ اور الفجوة کا معنی وسیع اور کھلی جگہ ہے، اور اس کی جمع فجوات اور فِجَاء ہے، جیسا کہ رَكْوَة کی جمع رِكاء اور رکوات ہے۔

اور شاعر نے بھی کہا ہے:

و نحن ملأنا كل واد و فجوة رجالا و خيلا غير ميل ولا عزل

یعنی وہ ایسی جگہ تھے جہاں انہیں بادِ نسیم لگتی تھی۔ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ یہ ان پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اس کا لطف و کرم ہے، اور یہ معنی زجاج کے قول کو تقویت دیتا ہے۔ اور اہل تفسیر نے کہا ہے کہ ان کی آنکھیں کھلی تھیں حالانکہ وہ سوئے ہوئے تھے، پس اسی طرح انہیں دیکھنے والا بیدار گمان کر سکتا ہے (3)۔ اور کہا گیا ہے: تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا کثرت سے ان کے کروٹ بدلنے کے سبب (تو انہیں بیدار خیال کرے گا) جیسا کہ بیدار آدمی اپنے بستر پر پہلو بدلتا ہے۔ اور اَيْقَاظًا، یقظ اور یقظان کی جمع ہے، اور اس سے مراد بیدار ہونے والا ہے وَّهُمْ رُقُوْدٌ (حالانکہ وہ سو رہے ہیں) اور یہ ان کے اس قول کی طرح ہے: وهم ركوع و سجود وقعود (درآنحالیکہ وہ رکوع، سجود اور قعدہ میں تھے۔) پس مصدر کے ساتھ جمع کی صفت بیان کی گئی۔ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تاکہ زمین ان کے گوشت کو نہ کھائے (4)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہر سال میں دو بار ان کی کروٹ بدلی جاتی رہی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ ہر سال میں ایک بار۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ہر سات سال میں ایک بار کروٹ بدلی جاتی تھی۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: بلاشبہ آخری نو سالوں میں ان کی کروٹ بدلی گئی، اور رہے تین سو سال تو ان میں کروٹ نہیں بدلی گئی (5)۔ اور مفسرین کے کلام کا ظاہر یہ ہے کہ کروٹ بدلنا اللہ تعالیٰ کے فعل میں سے ہے، اور یہ بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوئی فرشتہ مقرر ہو، اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جا رہی ہو۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 503 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 504 5۔ ایضاً

قولہ تعالیٰ: وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ كَلْبُهُمْ حضرت عمرو بن دینار نے کہا ہے: بے شک اس میں سے جو بچھو کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ کسی کو ضرر اور نقصان نہ پہنچائے تو (چاہیے کہ) وہ اپنی رات یا دن کے وقت یہ کہے: صلی اللہ علی نوح۔ اور بے شک جو کتے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ کتا اسے نقصان نہ پہنچائے جو اس پر حملہ آور ہو تو (چاہیے کہ) وہ یہ کہے: وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ۔

اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ وہ حقیقتاً کتا تھا، اور وہ ان میں سے کسی ایک کے شکار یا کھیتی کی حفاظت یا اس کے ریوڑ کے لئے تھا؛ جیسا کہ مقاتل نے کہا ہے۔ اور اس کے رنگ میں بہت سا اختلاف کیا گیا ہے، اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے، اس کا ماحصل یہ ہے: جو رنگ بھی تو ذکر کر دے وہی صحیح ہے، یہاں تک کہ کہا گیا ہے: وہ پتھر کے رنگ کا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ آسمان کے رنگ کا تھا۔ اور اس کے نام میں بھی اختلاف کیا گیا ہے، پس حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس کا نام ریان تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قطمیر تھا۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: مشیر تھا، حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا: بسیط تھا، حضرت کعب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: صہیا تھا، حضرت وہب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: نقیا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام قطفیر تھا؛ اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ اور ان کے وقت میں کتا رکھنا جائز تھا، جیسا کہ ہمارے نزدیک آج ہماری شریعت میں جائز ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: وہ رات کے وقت بھاگ کر نکلے اور وہ سات آدمی تھے وہ ایک چرواہے کے پاس سے گزرے اس کے ساتھ ایک کتا بھی تھا پس اس نے بھی ان کے دین میں ان کی اتباع کی۔ اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: وہ ایک کتے کے پاس سے گزرے اور وہ انہیں بھونکنے لگا تو انہوں نے اسے بھگایا وہ پھر لوٹ آیا تو انہوں نے اسے بار بار بھگایا، تو کتا اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے ہاتھ دعا مانگنے والے کی طرح آسمان کی طرف اٹھا دیئے، اور بول پڑا، اس نے کہا: تم مجھ سے نہ ڈرو! بلاشبہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنے والوں سے محبت کرتا ہوں پس تم سو جاؤ میں تمہاری حفاظت کروں گا۔ (لاتخافوا منی! أنا احبّ احباء الله تعالى فنا موا حتى أحرسكم)

مسئلہ نمبر 2۔ صحیح میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کتا رکھا سوائے شکاری کتے کے یا جانوروں کی حفاظت والے کتے کے تو ہر روز اس کے اجر سے دو قیراط کم ہو جائیں گے (1)''۔ اور صحیح میں ہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کوئی کتا رکھا سوائے جانوروں کی حفاظت یا شکار یا کھیتی کی نگرانی والے کتے کے تو ہر روز اس کے اجر سے ایک قیراط کم کر دیا جائے گا۔'' زہری نے کہا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ذکر کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ابو ہریرہ پر رحم فرمائے! وہ کھیت کے مالک تھے (2)، تحقیق شکار، کھیتی، اور جانوروں کی حفاظت کے لئے کتا رکھنے پر سنت ثابتہ دلالت کرتی ہے۔ اور جس نے اس کے سوا کسی منفعت کے لئے کتا رکھا انہوں نے اس کے اجر میں کمی رکھ دی ہے؛ یہ یا تو کتے کے مسلمانوں کو

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، الامر بقتل الکلاب، جلد 2، صفحہ 21 | 2۔ ایضاً

ڈرانے اور ان پر بھونکنے کے سبب ان کو پریشانی اور تشویش میں مبتلا کرنے کی وجہ سے ہے یا ملائکہ کو گھر میں داخل ہونے سے روکنے کی وجہ سے یا پھر اس کی نجاست کی وجہ سے، جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے یا اس نہی کی وجہ سے ہے جو بغیر کسی منفعت کے اسے رکھنے کے بارے ہے۔ واللہ اعلم۔ اور آپ نے دو روایتوں میں سے ایک میں دو قیراط اور دوسری میں ایک قیراط ذکر کیا ہے۔ اور اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ یہ کتوں کی دو قسموں کے بارے میں ہو ان میں سے ایک دوسری کی نسبت زیادہ اذیت رساں ہو، جیسا کہ وہ سیاہ (کتا) جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کر دینے کا حکم دیا اور اسے استثنا میں داخل نہیں کیا جس وقت ان کے قتل سے منع فرمایا جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بیان کیا گیا ہے؛ اسے صحیح نے نقل کیا ہے اور فرمایا: ''تم پر دو نقطوں والے سخت سیاہ جانور کو (قتل کرنا) لازم ہے کیونکہ وہ شیطان ہے (1)''۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جگہوں کے اختلاف کی وجہ سے ہو، پس جو اسے مدینہ طیبہ یا مکہ مکرمہ میں روکے رکھے گا اس کے دو قیراط کم ہوں گے اور ان کے سوا دوسرے شہروں میں ایک قیراط کم ہوگا۔ اور رہیں وہ صورتیں جن میں اسے رکھنا مباح ہے تو ان میں کچھ کم نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ گھوڑا اور بلی وغیرہ۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ اور جانوروں کے لئے کتا رکھنا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مباح ہے وہ وہ ہے جو ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے، نہ کہ وہ ہے جو گھروں میں چوروں سے ان کی حفاظت کرتا ہے۔ اور کھیتی کا کتا وہ ہے جو رات یا دن کے وقت وحشی جانوروں سے اس کی حفاظت کرتا ہے نہ کہ چوروں سے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے سوا دوسروں نے جانوروں اور کھیتی کی چوروں سے حفاظت کے لئے بھی کتا رکھنے کو جائز قرار دیا ہے۔ سورۃ المائدہ میں کتوں کے احکام پہلے گزر چکے ہیں جو کافی ہیں، والحمدللہ۔

مسئلہ نمبر 4۔ ابن عطیہ نے بیان کیا ہے: میرے باپ رضی اللہ عنہ نے مجھے بتایا انہوں نے کہا میں نے ۴۶۹ھ میں جامع مصر میں ابوالفضل جوہری کو منبر پر وعظ کرتے ہوئے سنا: بے شک جس نے اہل خیر سے محبت کی اس نے ان کی برکت کو پا لیا، ایک کتے نے اہل فضل سے محبت کی اور ان کی سنگت اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی محکم کتاب میں ذکر فرمایا (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جب کتوں میں سے بعض نے صلحاء و اولیاء کے ساتھ ملنے اور ان کی صحبت اختیار کرنے کے سبب اتنا بلند درجہ پا لیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی کتاب جل وعلا میں اس کی خبر دی ہے تو ان موحد مومنین کے بارے تیرا کیا خیال ہے جو اولیاء اور صالحین سے ملتے اور ان سے محبت کرتے ہیں، بلکہ اس میں درجہ کمال سے قاصر رہنے والے مومنین اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی بہترین آل سے محبت کرنے والوں کے لئے تسلی اور انس (کا پیغام) ہے۔

صحیح نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اس اثنا میں کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے باہر نکلے تو مسجد کے دروازے کے پاس ہمیں ایک آدمی ملا اور اس نے کہا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کب آئے گی؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو نے اس کے لئے کیا تیاری کی ہے؟'' راوی نے کہا: تو گویا وہ آدمی ساکن سا ہو گیا، پھر عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے اس کے لئے کوئی زیادہ نمازیں، روزے اور صدقہ وغیرہ تیار نہیں کیا، لیکن میں

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، الامر بقتل الکلاب، جلد 2، صفحہ 20
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 504

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہوں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فأنت مع من أحببت (پس تو اسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ تو محبت کرتا ہے)۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم اسلام کے بعد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے زیادہ کبھی کسی سے خوش نہیں ہوئے: فأنت مع من أحببت۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پس میں اللہ تعالیٰ، اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت کرتا ہوں تو میں امید رکھتا ہوں کہ میرا انجام ان کے ساتھ ہوگا اگرچہ میں نے ان کے اعمال کی مثل عمل نہیں کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور یہ جو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اس سے استدلال کیا ہے یہ مسلمانوں میں سے ہر ذی روح کو شامل ہے، پس اسی لئے ہماری حرص اور طمع اس کے ساتھ متعلق ہے اگرچہ ہم کوتاہی کرنے والے اور کمزور ہیں، اور ہم رحمن کی رحمت کے امیدوار ہیں اگرچہ ہم اس کی اہلیت نہیں رکھتے، ایک کتے نے ایک قوم سے محبت کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر ان کے ساتھ کیا! تو ہمارے ساتھ اس کا کیسا سلوک ہوگا جبکہ ہمارے پاس ایمان کا معاہدہ اور کلمہ اسلام، اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝

(الاسراء) (اور بے شک ہم نے بڑی عزت بخشی اولاد آدم کو اور ہم نے سوار کیا انہیں (مختلف سواریوں پر) خشکی میں اور سمندر میں اور رزق دیا انہیں پاکیزہ چیزوں سے اور ہم نے فضیلت دی انہیں بہت سی چیزوں پر جن کو ہم نے پیدا فرمایا نمایاں فضیلت)۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: وہ حقیقی کتا نہ تھا، بلکہ وہ ان میں سے ایک تھا (یعنی اصحاب کہف میں سے) وہ ان کی حفاظت کی خاطر غار کے دروازے کے پاس بیٹھ گیا تھا، جیسا کہ جوزاء کے پیچھے آنے والے ستارے کو کلب کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ وہاں انسانوں میں سے کتے کی مثل تھا اور اس کو کہا جاتا ہے: کلب الجبار۔ ابن عطیہ نے کہا ہے (1): پس اسے اس حیوان کا نام دے دیا گیا ہے جو اس جگہ کو لازم پکڑنے والا ہے، لیکن اس قول کو بازوؤں کے پھیلا دینے کا ذکر کمزور کرتا ہے کیونکہ عرف میں یہ حقیقی کتے کی صفت میں ہے۔ اور اس سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی ہے: ولا يبسط أحد كم ذراعيه انبساط الكلب (2) (تم میں سے کوئی اپنے بازو کتے کے پھیلانے کی طرح نہ پھیلائے)۔ ابو عمر مطرز نے کتاب الیواقیت میں بیان کیا ہے کہ اسے وكالبهم باسط ذراعيه بالوصيد پڑھا گیا ہے۔ پس اس میں یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ کالب سے مراد وہ آدمی ہو جیسا کہ روایت کیا گیا ہے، جب اس نے بازو پھیلا دیئے اور زمین کے ساتھ چمٹ گیا اس کے ساتھ ساتھ چہرے کو اٹھائے رکھا اطلاع پانے کے لئے اور یہی حالت اس مشکوک کی ہوتی ہے جو اپنے آپ کو چھپانے والا ہوتا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ کالب سے مراد کلب (3) (کتا) ہو اور جعفر بن محمد صادق رضی اللہ عنہ نے وكالبهم پڑھا اور مراد کتے کا مالک لیا۔

قولہ تعالیٰ: بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ اسم فاعل عمل کر رہا ہے اور یہ ماضی کے معنی میں ہے، کیونکہ یہ حکایت حال ہے۔ کتے کے فعل کے بارے خبر دینا مقصود نہیں ہے۔ اور الذراع سے مراد کہنی کی طرف سے لے کر درمیانی انگلی کے کنارے تک کا حصہ اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 504
2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، الاعتدال فی السجود، جلد 1، صفحہ 193
3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 504

مقدار ہے۔ پھر کہا گیا ہے: اس نے طویل مدت کے لئے اپنا بازو پھیلائے رکھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کتا سو گیا، اور وہ بھی علامات میں سے تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ آنکھیں کھول کر سویا رہا۔ اور الوصید سے مراد فناء (صحن) ہے؛ یہ حضرت ابن عباس، حضرت مجاہد اور حضرت ابن جبیر نے کہا ہے۔ مراد غار کا صحن ہے، اور اس کی جمع وصائد اور وُصُد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الوصید سے مراد دروازہ ہے۔ اور یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے (1)۔

اور شعر بھی ہے:

بأرض فضاءٍ لا یُسَدّ و صِیدُھا علیّ و معروفی بھا غیر منکر (2)

اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضرت عطا نے کہا ہے: الوصید سے مراد دروازے کی دہلیز ہے، اور الباب الموصد سے مراد بند دروازہ ہے۔ اور أوصدت الباب و آصدته کا معنی ہے میں نے دروازہ بند کر دیا۔ اور الوصید سے مراد ایسی بوٹیاں بھی ہیں جن کی جڑیں باہم قریب قریب ہوں، پس یہ لفظ مشترک ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ جمہور نے واؤ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اعمش اور یحییٰ بن وثاب نے اسے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا یعنی اگر تو ان پر جھانک کر دیکھے تو تو یقیناً ان سے بھاگ آئے۔ وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا یعنی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں رعب سے گھیر رکھا ہے اور ہیبت اور خوف سے ان کا احاطہ کر رکھا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کی جگہ کی وحشت کی وجہ سے (تو بھاگ آئے) گویا اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی جگہ میں پناہ دی ہے جو بظاہر وحشت ناک ہے تاکہ لوگ وہاں سے دور بھاگیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لوگوں کو ان سے رعب کے ساتھ روک دیا گیا تھا، ان میں سے کوئی بھی ان کے قریب جانے کی جسارت نہ کرتا تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ان سے فرار ان کے بالوں اور ان کے ناخنوں کے بڑھنے اور لمبا ہونے کی وجہ سے تھا؛ اسے مہدوی، نحاس، زجاج اور قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بعید از حقیقت ہے (3)، کیونکہ وہ جب بیدار ہوئے تو ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے اور یہ اس پر دلیل ہے کہ ان کے بال اور ان کے ناخن اپنی حالت پر تھے، مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے ناخنوں اور اپنے بالوں کی طرف دیکھنے سے پہلے یہ کہا ہو۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ان کے معاملہ میں صحیح یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے ان کی اسی حالت پر حفاظت فرمائی جس پر وہ سوئے تھے تاکہ وہ ان کے لئے اور ان میں دوسروں کے لئے علامت اور نشانی ہو جائے۔ پس نہ ان کے کپڑے بوسیدہ اور پرانے ہوئے اور نہ ان کی کوئی حالت تبدیل ہوئی، اور شہر کی طرف اٹھ کر جانے والے نے زمین اور عمارتوں کے نشانات کے سوا کسی چیز کا انکار نہیں کیا (اور نہ اس پر تعجب کیا) اور اگر اس کی ذات میں کوئی ایسی حالت ہوتی جس کا وہ انکار کرتا (اور اسے عجیب سمجھتا) تو یقیناً یہ اس پر زیادہ اہم تھا (4)۔ نافع، ابن کثیر، حضرت ابن عباس اور اہل مکہ و مدینہ نے مُلِّئْتَ مِنْهُمْ مبالغہ و مضاعف کی بنا پر لام کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ملئت ثم ملئت (تجھے بھر دیا جائے پھر تجھے بھر دیا جائے) اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 504
2۔ ایضاً
3۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 292
4۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 505-504

باقیوں نے لملئت تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، اور لغت میں تخفیف زیادہ مشہور ہے۔

اور مخبل سعدی کے قول میں بھی تثقیل (تشدید) آئی ہے۔

وإذ فَتكَ النُّعمان بالناس مُحْرِمًا فملِئ من كعب بن عوف سلاسه(1)

اور جمہور نے رُعْبًا عین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابو جعفر نے اسے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابو حاتم نے کہا ہے: یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اور فِرَارًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور رُعْبًا مفعول ثانی یا تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے(2)۔

وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْۤا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَاۤ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَ لْيَتَلَطَّفْ وَ لَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ۝ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَ لَنْ تُفْلِحُوْۤا اِذًا اَبَدًا ۝

"اور اسی طرح ہم نے انہیں بیدار کر دیا تا کہ وہ ایک دوسرے سے آپس میں پوچھیں، کہنے لگا ایک کہنے والا ان سے کہ تم یہاں کتنی مدت ٹھہرے ہو۔ بعض نے کہا: ہم ٹھہرے ہوں گے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ دوسروں نے کہا تمہارا رب بہتر جانتا ہے جتنی مدت تم ٹھہرے ہو، پس بھیجو کسی کو اپنے ساتھیوں سے اپنے ایک سکہ کے ساتھ شہر کی طرف پس وہ دیکھے کہ کس کے ہاں عمدہ پاکیزہ کھانا ملتا ہے پس وہ لے آئے تمہارے پاس کھانا وہاں سے، اسے چاہئے کہ خوش خلقی سے کام لے اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے۔ وہ لوگ اگر آگاہ ہو گئے تم پر تو وہ تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دیں گے یا تمہیں (جبرا) لوٹا دیں گے اپنے (جھوٹے) مذہب میں اور (اگر تم نے ایسا کیا) تو تم کبھی بھی فلاح نہیں پاسکو گے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ، البعث سے مراد سکون سے حرکت دینا ہے۔ اور اس کا معنی ہے: جیسا کہ ہم نے ان کے کان سننے سے بند کر دیئے، اور ہم نے ان کے لئے نور ہدایت میں اضافہ کیا، اور ہم نے ان کی کروٹیں بدلیں (اسی طرح) ہم نے انہیں ان کی نیند سے بیدار بھی کر دیا، درآنحالیکہ وہ اپنے کپڑوں اور دیگر احوال میں اپنی پہلی حالت پر ہی تھے۔

شاعر نے کہا ہے:

و فِتْيانِ صِدقٍ قد بَعثتُ بِسُحْرَةٍ فقاموا جميعا بين عاثٍ و نَشْوانِ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 504 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 505

یعنی میں نے بیدار کر دیا۔ اور قول باری تعالیٰ: لِيَتَسَآءَلُوْا میں لام صیرورت ہے اور یہی لام عاقبت ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں لام عاقبۃ ہے: لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا (القصص: 8) (تا کہ (انجام کار) وہ ان کا دشمن اور باعث رنج والم بنے)۔ پس اس کا بیدار ہونا باہم ایک دوسرے سے سوال کرنے کے لئے نہ تھا۔

قولہ تعالیٰ: قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ اور وہ یہ کہ وہ صبح کے وقت اس میں داخل ہوئے اور دن کے آخر میں الله تعالیٰ نے انہیں بیدار کر دیا، تو ان کے رئیس تملیخا یا مکسلمینا نے کہا: مدت کے بارے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: ان کا سکہ موسم ربیع میں پیدا ہونے والے اونٹ کے پاؤں کی مثل تھا، اسے نحاس نے ذکر کیا ہے، اور ابن کثیر، نافع، ابن عامر، کسائی اور حفص نے حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہ سے بِوَرِقِكُمْ را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابو عمرو، حمزہ اور ابوبکر نے عاصم سے بوَرْقِكم را کے سکون کے ساتھ قرأت کی ہے، انہوں نے ثقل کی وجہ سے کسرہ کو حذف کر دیا ہے، اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اور زجاج نے بِوِرْقِكُمْ واؤ کو کسرہ اور را کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے(1)۔ اور روایت کی جاتی ہے کہ وہ اس حال میں بیدار ہوئے کہ انہیں بھوک لگی ہوئی تھی، اور جسے (شہر کی طرف) بھیجا گیا تھا وہ تملیخا تھا، اور یہی ان میں (عمر کے اعتبار سے) چھوٹا تھا، جیسا کہ غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ اور وہ شہر افسوس تھا۔ اور کہا جاتا ہے: کہ وہ طرسوس تھا، زمانہ جاہلیت میں اس کا نام اُفسوس تھا اور جب اسلام آیا تو انہوں نے اس کا نام طرسوس رکھ دیا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: ان کے پاس دراہم تھے ان پر اس بادشاہ کی تصویر تھی جوان کے زمانے میں تھا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ ذبیحہ کو حلال قرار دے، کیونکہ ان کے شہر والے بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے اور ان میں ایک قوم تھی جو اپنا ایمان چھپا کر رکھتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان میں سے عام مجوسی تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اَزْكٰى طَعَامًا یعنی جس میں برکت زیادہ ہو۔ کہا گیا ہے کہ انہوں نے اسے حکم دیا کہ وہ اتنی مقدار میں خریدے جسے یہ خیال کیا جا سکتا ہو کہ یہ دو یا تین آدمیوں کا کھانا ہے تا کہ وہ ان پر اطلاع نہ کر سکے، پھر جب اسے پکایا جائے تو وہ جماعت کو کافی ہو جائے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ وہ کھانا چاول تھے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ کشمش تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ وہ کھجوریں تھیں۔ فاللہ اعلم۔

اور کہا گیا ہے کہ اَزْكٰى بمعنی اطیب (زیادہ پاکیزہ) ہے اور یہ قول بھی ہے کہ یہ بمعنی ارخص (سستا) ہے۔ فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ پس چاہئے کہ وہ تمہارے لئے خوراک لے آئے۔ وَلْيَتَلَطَّفْ اور چاہئے کہ وہ شہر میں داخل ہونے اور کھانا خریدنے میں خوش خلقی سے پیش آئے۔

وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا یعنی وہ قطعاً تمہارے بارے میں کسی کو خبر نہ ہونے دے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اگر اس پر غلبہ پا لیا جائے (یعنی اگر اسے پکڑ لیا جائے) تو وہ اپنے بھائیوں کو اس آزمائش میں واقع نہ کرے جس میں وہ خود واقع ہوا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 505

اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی پتھر ہے، اور یہ خبیث ترین اور انتہائی قبیح قتل کی صورت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ تمہیں سب وشتم، گالی گلوچ دیں گے؛ اور یہ پہلا معنی زیادہ صحیح ہے (یعنی وہ تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دیں گے)، کیونکہ وہ ان کے قتل کا ارادہ رکھتا تھا جیسا کہ ان کے واقعہ میں گزر چکا ہے۔ اور رجم جیسا کہ گزر چکا ہے یہ ایک سزا ہے جو لوگوں کے دین (اور رائے) کے خلاف تھی، جب کہ یہ اس دین کے ماننے والے تمام لوگوں کے لئے مناسب تھی اس حیثیت سے کہ وہ اس میں شریک تھے۔

مسئلہ نمبر 3۔ سکہ دے کر اس کو بھیجنے میں وکالت اور اس کے صحیح ہونے پر دلیل ہے۔ تحقیق حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی حضرت عقیل رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس وکیل بنا کر بھیجا اور اس میں فی الجملہ کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور وکالت جاہلیت اور اسلام میں معروف ہے، کیا آپ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی طرف نہیں دیکھتے کہ انہوں نے امیہ بن خلف کو کیسے مکہ مکرمہ میں اپنے اہل خانہ اور اپنے رشتہ داروں کے لئے وکیل مقرر کیا، یعنی وہ ان کی حفاظت کرے گا۔ اور امیہ مشرک تھا، اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے امیہ کے لئے اس کا انتظام کیا جو مدینہ طیبہ میں اس کے رشتہ داروں کی اسی طرح حفاظت کرے گا اور یہ اس کے عمل کی جزا اور بدلہ ہوگا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ (1) سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں رحمن کو نہیں پہچانتا! میری طرف اپنا وہ نام لکھو جو جاہلیت میں تھا، چنانچہ میں نے عبد عمرو لکھا ..... اور آگے حدیث ذکر کی۔ اصمعی نے کہا ہے: صاغیۃ الرجل سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اس کے پاس آتے ہیں اور یہ صغا يَصْغُوْ اور يَصْغَىٰ سے ماخوذ ہے۔ جب وہ مائل ہو، اور ہر وہ جو کسی شے کی طرف مائل ہو یا اس کے ساتھ ہو (تو اسی کے لئے کہا جائے گا) صغا الیہ و أصغی، یہ کتاب الافعال سے ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ وکالت عقد نیابت ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حاجت اور ضرورت کے تحت اس کی اجازت دی ہے اور اس میں مصلحت رکھ دی ہے، کیونکہ ہر ایک اپنے امور سرانجام دینے پر قادر نہیں ہوتا مگر دوسرے کی معاونت کے ساتھ یا راحت اور سہولت دینے کے ساتھ پس وہ اسے اپنا نائب بنالیتا ہے جو اسے راحت وسکون پہنچا سکتا ہے۔

تحقیق ہمارے علماء نے اس کے صحیح ہونے پر کتاب اللہ کی کئی آیات سے استدلال کیا ہے، ان میں سے ایک یہ آیت ہے، اور قول باری تعالیٰ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا (التوبہ: 60) اور اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا (یوسف: 93) (لے جاؤ میرا یہ پیراہن) ہیں۔ اور رہی سنت! تو وہ کثیر احادیث ہیں۔ ان میں سے عروہ البارقی کی حدیث ہے، اور وہ سورۃ الانعام کے آخر میں گزر چکی ہے۔ اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی ہے کہ میں نے خیبر کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور آپ سے عرض کی: میں خیبر کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب تو میرے وکیل کے پاس پہنچے تو اس سے پندرہ وسق لے لینا اور اگر وہ تجھ سے کوئی نشانی طلب کرے تو اپنا ہاتھ اس کے گلے پر رکھنا“ (2)۔ اسے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الوکالۃ، إذا وکل المسلم حربیاً فی دار الحرب، جلد 1، صفحہ 308

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ، باب فی الوکالۃ، جلد 2، صفحہ 155

ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ اور اس معنی میں کثیر احادیث ہیں، اور اس کے جواز کے بارے اجماع امت ہونا ہی کافی ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ ہر اس حق میں وکالت جائز ہے جس میں نیابت جائز ہوتی ہے، پس اگر غاصب نے کسی کو وکیل بنایا تو یہ جائز نہیں، حالانکہ وہ وکیل ہے، کیونکہ ہر وہ کام جسے کرنا حرام قرار دیا گیا ہے اس میں نیابت جائز نہیں ہوتی۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس آیت میں ایک عمدہ نکتہ ہے کہ وکالت بچاؤ کے ساتھ ساتھ خوف بھی ہے کہ کوئی انہیں اس کے بارے احساس دلاتا ہے جو انہیں اپنی جانوں پر خوف نہیں ہے۔ اور صاحب عذر کیلئے کسی کو وکیل بنانے کا جواز تو متفق علیہ ہے اور رہا وہ جس کو کوئی عذر نہیں تو جمہور اس کے جواز کے قائل ہیں۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور سحنون نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: گویا سحنون نے اسے اسد بن فرات سے لیا ہے اور اس نے اپنے ایام قضا میں اس کا فیصلہ کیا، اور شاید وہ ظلم و جبر کرنے والوں کے ساتھ ایسا کرتے تھے، ان سے انصاف لینے کے لئے اور ان کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے، اور یہی حق ہے؛ کیونکہ وکالت تو معاونت اور مدد کرنا ہے اور یہ اہل باطل کے لئے نہیں ہو سکتی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اچھا ہے، پس جہاں تک اہل دین اور اہل فضل کا تعلق ہے تو ان کے لئے جائز ہے کہ وہ وکیل بنائیں اگرچہ وہ حاضر اور صحتمند ہوں۔ اور وکالت کے جواز کے صحیح ہونے پر دلیل وہ شاہد صحیح ہے جسے صحیحین وغیرہما نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ ایک آدمی کا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ایک سال کا اونٹ تھا پس وہ آیا اور اس کا تقاضا کرنے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اسے عطا کرو''۔ پس انہوں نے اس کے لئے ایک سال کا اونٹ تلاش کیا لیکن انہوں نے نہ پایا مگر وہ جس کی عمر اس سے زیادہ تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اسے دے دو''۔ تو اس نے کہا: آپ نے میرا حق پورا کر دیا ہے اللہ تعالیٰ آپ کا حق پورا کر دے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک تم میں سے بہتر اور اچھا وہ ہے جو تم میں سے قضا کے اعتبار سے اچھا اور حسین ہو (1)''۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔ پس یہ صحیح حدیث صحیح البدن حاضر آدمی کے وکیل بنانے کے جواز پر دلیل ہے کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ آپ کی طرف سے اس عمر کا اونٹ دے دیں جو آپ پر لازم ہے اور یہ آپ کی طرف سے ان کو اس پر وکیل بنانا ہی ہے، اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم مریض تھے نہ مسافر۔ اور یہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور سحنون کے ان دونوں کے بارے میں اس قول کو رد کرتی ہے کہ صحیح البدن حاضر آدمی کے لئے اپنے خصم کی رضا کے بغیر کسی کو وکیل بنانا جائز نہیں ہے اور یہ حدیث ان دونوں کے قول کے خلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: یہ آیت شرکت کے جواز کو متضمن ہے کیونکہ وہ سکہ ان تمام کا تھا۔ اور وکالت کے جواز کو بھی متضمن ہے کیونکہ انہوں نے اسے بھیجا جسے انہوں نے خریدنے کے لئے وکیل بنایا اور یہ ساتھیوں کے کھانے اور ان کا ایک ساتھ اپنے کھانے کو ملانے اور جمع کرنے کو متضمن ہے، اگرچہ ان میں سے بعض دوسروں سے زیادہ کھانا کھائیں؛ اور اس کی مثل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ (البقرہ: 220) (اور اگر (کاروبار میں) تم انہیں ساتھ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں) جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اسی لئے ہمارے اصحاب نے مسکین کے بارے میں کہا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الوکالۃ، وکالۃ الشاهد والغائب جائزۃ، جلد 1، صفحہ 309

ہے اس پر صدقہ کیا جاتا ہے پھر وہ اسے غنی کے کھانے کے ساتھ ملا دیتا ہے پھر اس کے ساتھ مل کر کھاتا ہے، بلاشبہ یہ جائز ہے۔ اور انہوں نے مضارب کے بارے میں کہا ہے جو اپنا کھانا دوسرے کے کھانے کے ساتھ ملا دیتا ہے پھر اس کے ساتھ مل کر کھاتا ہے: بے شک یہ جائز ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے وکیل بنایا جس نے آپ کے لئے قربانی کا جانور خریدا۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: آیت میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے، کیونکہ اس میں یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے وہ انفرادی طور پر دیا ہو تو پھر اس میں اشتراک نہیں ہوگا۔ اور اس مسئلہ میں تعویل نہیں کی جاسکتی مگر دو حدیثوں کی بنا پر: ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ایک قوم کے پاس سے گزرے۔ وہ کھجوریں کھا رہے تھے تو آپ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح اقتران اور ملنے سے منع فرمایا ہے مگر یہ کہ آدمی اپنے بھائی سے اجازت طلب کرے (1)۔ اور دوسری یہ ہے ابو عبیدہ کی جیش الخبط کے بارے میں حدیث ہے۔ اور یہ ظہور میں پہلی سی کم ہے، کیونکہ اس میں احتمال ہوسکتا ہے کہ ابو عبیدہ انہیں اس خوراک میں سے حاجت اور ضرورت کے مطابق دیتا ہو اور وہ انہیں اس پر جمع نہ کرتا ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کتاب اللہ میں سے جو اس کے خلاف پر دلالت کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ (البقرہ: 220) اور قول باری تعالیٰ ہے: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا (النور: 61) (نہیں ہے تم پر کوئی حرج اگر تم کھاؤ سب مل کر یا الگ الگ۔) جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْۤا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ؕ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰۤى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ۝۲۱

''اور بستی والوں کو ہم نے اچانک آگاہ کر دیا ان (اصحاب کہف) پر تاکہ وہ جان لیں کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور بلاشبہ قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، جب وہ بستی والے جھگڑ رہے تھے آپس میں ان کے معاملہ میں تو بعض نے کہا کہ (بطور یادگار) تعمیر کر دو ان کے غار پر کوئی عمارت ان کا رب ان کے احوال سے خوب واقف ہے، کہنے لگے وہ لوگ جو غالب تھے اپنے کام پر کہ بخدا! ہم تو ضرور ان پر ایک مسجد بنائیں گے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ یعنی ہم نے ان پر اطلاع کر دی اور ہم نے ان پر ظاہر کر دیا۔ اور اَعْثَرَ یہ عَثَرَ سے ہمزہ کے ساتھ متعدی بنایا گیا ہے۔ اور عثار کا اصل معنی تو پاؤں کا پھسلنا ہے۔ لِيَعْلَمُوْۤا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ یعنی تاکہ وہ امت مسلمہ جان لے جن کے عہد میں اصحاب کہف کو بیدار کیا گیا۔ اور وہ یہ کہ دقیانوس فوت ہوگیا اور صدیاں گزر گئیں اور اس علاقے کا بادشاہ ایک صالح اور نیک آدمی بنا، اور وہاں کے باسیوں کا حشر اور قبروں سے جسموں کے اٹھائے جانے کے بارے اختلاف ہوگیا، اور بعض لوگ اس میں شک کرنے لگے اور انہوں نے اسے بعید از حقیقت سمجھا اور کہنے لگے: بے شک ارواح کو اٹھایا جائے گا اور جسم کو تو زمین کھا جائے گی۔ اور ان میں سے بعض نے کہا: روح اور جسم دونوں کو اکٹھا اٹھایا جائے گا؛ پس یہ اس بادشاہ

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاطعمۃ، النہی عن قران التمر، صفحہ 247

پر گراں گزرا اور وہ حیران رہنے لگا اور وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ان کے لئے اس معاملہ کی وضاحت کیسے کرے، یہاں تک کہ ٹاٹ پہن لیا اور وہ ریت پر بیٹھ گیا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حجت و بیان کے لئے تضرع اور زاری کرنے لگا، تو اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف پر آگاہ کر دیا، پس کہا جاتا ہے کہ جب انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو سکے دے کر شہر کی طرف بھیجا کہ وہ ان کیلئے وہاں سے کھانا لے آئے تو اس شخص کو اجنبی سمجھا گیا اور بہت طویل زمانہ گزرنے کی وجہ سے اس کے دراہم پر بھی اظہار تعجب کیا گیا، اور اسے بادشاہ کے پاس اٹھا کر لے جایا گیا اور وہ صالح آدمی تھا تحقیق وہ بھی ایمان لے آیا تھا اور جو اس کے ساتھ تھے وہ بھی ایمان لے آئے تھے۔ پس جب اس نے اس کی طرف دیکھا تو کہا: شاید یہ ان جوانوں میں سے ہے جو بادشاہ دقیانوس کے زمانے میں نکلے تھے، تحقیق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہا ہوں کہ وہ مجھے وہ دکھائے۔ پھر اس نے جوان سے پوچھا تو اس نے اسے اس کی خبر دی، پس بادشاہ اس سے بہت خوش ہوا اور اس نے کہا: شاید اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے نشانی بھیج دی ہے، پس ہمیں چاہئے کہ ہم اس کے ساتھ غار کی طرف چلیں، چنانچہ وہ شہر والوں سمیت ان کی طرف سوار ہو کر گیا، اور جب غار کے قریب پہنچے تو تملیخا نے کہا: میں ان پر داخل ہوتا ہوں تاکہ وہ خوفزدہ نہ ہو جائیں چنانچہ وہ اندر ان کے پاس گیا اور صورت حال سے انہیں آگاہ کیا اور یہ کہ یہ امت امت اسلام ہے، پس روایت ہے کہ انہیں اس سے ازحد خوشی ہوئی، اور وہ بادشاہ کی طرف باہر آئے اور انہوں نے اس کی عزت و تکریم کی اور وہ ان کی تعظیم بجالایا پھر وہ اپنے غار کی طرف لوٹ گئے۔ اور اکثر روایات میں یہ ہے کہ جس وقت تملیخا نے انہیں یہ بتایا تو اس وقت وہ حقیقی موت کے ساتھ فوت ہو گئے، جیسا کہ اس کا بیان آرہا ہے۔ اور جنہیں جسموں کے اٹھائے جانے میں شک تھا انہیں اس کا یقین حاصل ہو گیا۔ پس اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ کا یہی معنی ہے یعنی تاکہ بادشاہ اور اس کی رعایا جان لے کہ قیامت حق ہے اور دوبارہ زندہ کیا جانا (یعنی بعث) بھی حق ہے۔ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ بلاشبہ انہوں نے اس ایک سے ان کی خبر پر استدلال کیا اور وہ ان پر داخل ہونے سے ڈر گئے تو بادشاہ نے کہا: تم ان پر (بطور یادگار) ایک عمارت تعمیر کر دو؛ اور جو ان جوانوں کے دین پر تھے انہوں نے کہا: ان پر مسجد بنا دو۔ اور روایت ہے کہ ایک کافر گروہ نے کہا: ہم ان پر اپنی عبادتگاہ یا مہمان خانہ بنا لیتے ہیں، تو مسلمانوں نے انہیں روک دیا اور کہا: ہم ان پر ضرور مسجد بنائیں گے۔ اور روایت ہے کہ بعض لوگ ان پر غار کو بند کرنے کے لئے گئے اور انہوں نے انہیں اس میں اس حال میں چھوڑا کہ وہ غائب کر دیئے گئے ہیں۔ اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت لوگوں پر ان کے اثر اور نشان کو اوجھل کر دیا اور انہیں ان سے چھپا دیا، پس اسی لئے بادشاہ نے عمارت بنانے کے لئے کہا تاکہ وہ ان کی نشانی ہو جائے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک بادشاہ نے ارادہ کیا کہ وہ انہیں سونے کے صندوق میں دفن کرے تو حالت خواب میں ان سے کوئی آنے والا اس کے پاس آیا اور کہا: تو نے ہمیں سونے کے صندوق میں دفن کرنے کا ارادہ کیا ہے پس تو اس طرح نہ کر، کیونکہ ہم مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں اور اسی کی طرف ہم لوٹ رہے ہیں پس تو ہمیں چھوڑ دے۔

یہاں کئی ممنوع اور جائز مسائل پیدا ہوتے ہیں، پس قبروں پر مساجد بنانا اور ان میں نماز پڑھنا اور ان پر کوئی عمارت بنانا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 507

اور علاوہ ازیں وہ جنہیں سنت کی نہی متضمن ہے وہ ممنوع ہیں اور جائز نہیں ہیں، جیسا کہ ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبور کی زیارت کرنے والیوں پر اور ان پر مساجد بنانے والوں پر اور ان پر چراغ جلانے والوں پر لعنت کی ہے(1)۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس باب میں حضرت ابوہریرہ، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث مروی ہے اور وہ حدیث حسن ہے۔ اور صحیحین نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت ام حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک کنیسہ (گرجا گھر) کا ذکر کیا۔ انہوں نے اسے حبشہ میں دیکھا تھا اس میں تصاویر تھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بیشک یہ وہ لوگ ہیں جن میں کوئی صالح آدمی ہوتا اور وہ فوت ہو جاتا تو وہ اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے اور اس میں اس کی تصویریں لگا دیتے تو قیامت کے دن وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مخلوق میں سے بدترین لوگ ہوں گے(2)'' یہ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ مسلمانوں پر حرام کیا گیا ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام اور علماء کی قبروں کو مساجد (سجدہ گاہ) بنائیں۔ اور ائمہ نے ابو مرثد غنوی سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''تم قبروں کی طرف (متوجہ ہو کر) نماز نہ پڑھو اور نہ ان پر بیٹھو(3)''۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں، یعنی تم انہیں قبلہ نہ بناؤ کہ تم ان پر یا ان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے کیا ہے، کیونکہ یہ قبر والوں کی عبادت تک پہنچا دیتا ہے جیسا کہ بتوں کی پرستش کا سبب یہی بنا۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مثل سے ڈرایا، اور اس تک پہنچانے والے ذرائع کو بند کر دیا۔ اور فرمایا: ''اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا شدید غضب ہوگا جنہوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام اور صالحین کی قبروں کو مساجد بنایا(4)''۔ اور صحیحین نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ ان دونوں نے کہا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی آتی تو آپ اپنا جبہ اپنے چہرے پر ڈال لیتے اور جب اس کے سبب گرمی اور حدت محسوس کرنے لگتے تو اسے اپنے چہرے سے اتار دیتے ایسے معاملہ میں اسی طرح ہوتا ہے: ''اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے انہوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو مساجد بنا لیا ہے(5)''۔ تو آپ اس سے ڈرا رہے ہیں جو کچھ انہوں نے کیا۔

اور امام مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے کہ قبر پر چونا کیا جائے اور اس پر بیٹھا جائے اور اس پر کوئی عمارت بنائی جائے(6)۔ اور اسے ابوداؤد اور ترمذی نے بھی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو چونا کرنے، ان پر کچھ لکھنے، ان پر عمارت

1۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، ما جاء فی کراھیۃ ان یتخذوا القبر مسجدا، جلد 1، صفحہ 43

ایضاً، حدیث نمبر 294۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، باب زیارۃ النساء، حدیث نمبر 2817، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، النھی عن بناء المسجد علی القبور، جلد 1، صفحہ 201

3۔ ایضاً، کتاب الجنائز، فصل فی تسویۃ القبر، جلد 1، صفحہ 312

4۔ مؤطا امام مالک، فی قصر الصلوٰۃ، صفحہ 159

5۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، النھی عن بناء المسجد علی القبور، جلد 1، صفحہ 201

6۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، فصل فی تسویۃ القبر، جلد 1، صفحہ 312

بنانے اور انہیں روندنے سے منع فرمایا ہے۔ ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔ اور صحیح نے ابو الہیاج اسدی سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا مجھے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا میں تجھے اس پر آگاہ نہ کروں جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آگاہ کیا: خبردار سنو کوئی بت نہ چھوڑ مگر تو اسے مٹا دے اور کوئی بلند قبر نہ چھوڑ مگر تو اسے ہموار کر دے۔ اور ایک روایت میں ہے اور کوئی تصویر نہ چھوڑ مگر تو اسے مٹا دے (2)۔ اسے ابوداؤد اور ترمذی نے نقل کیا ہے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: اس کا ظاہر تو اس پر دال ہے کہ آپ نے قبروں کو کوہان کی مثل بنانے اور ان کو بلند کرنے سے منع کیا ہے اور یہ کہ وہ (زمین کے ساتھ) چپکی ہوئی ہوں۔ اور بعض اہل علم نے یہی کہا ہے۔ اور جمہور نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وہ بلندی جسے زائل کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ وہ ہے جو کوہان کی مثل سے زیادہ ہو، اور قبر کے لئے اتنی بلندی باقی رہے گی جس سے اسے پہچانا جا سکتا ہو اور اس کا احترام کیا جائے، اور یہی ہمارے نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر انور اور آپ کے صاحبین رضی اللہ عنہما کی قبروں کی کیفیت اور حالت ہے جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے موطا میں اسے ذکر کیا ہے...... اور اسی طرح ہمارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی قبر بھی ہے، جیسا کہ اسے دارقطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ اور رہی زمانہ جاہلیت کی طرز پر بنائی جانے والی کثیر عمارتوں کی بلندی جو ان کی تفخیم شان اور تعظیم کے لئے ہوتی ہے تو اسے گرا دیا جائے گا اور زائل کر دیا جائے گا، کیونکہ اس میں آخرت کی منازل میں سے پہلی منزل میں دنیوی زینت کا استعمال ہے، اور ان کے ساتھ تشبیہ اور موافقت ہے جو قبروں کی تعظیم کرتے ہیں اور ان کی عبادت کرتے ہیں، اور ان معانی کے اعتبار سے اور نہی کے ظاہر کے اعتبار سے یہ کہا جانا چاہئے کہ یہ حرام ہے۔ اور قبر میں کوہان کی شکل میں اس کی بلندی ایک بالشت کی مقدار ہے، یہ سنام البعیر (اونٹ کی کوہان) سے ماخوذ ہے۔ اور اس پر پانی چھڑکا جائے گا تاکہ ہوا کے ساتھ وہ اڑ نہ جائے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قبر کو گارے کے ساتھ لیپ دینے میں کوئی حرج نہیں (3)۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قبر کو چونا نہیں کیا جائے گا اور نہ اسے گارے کے ساتھ لیپ کیا جائے گا اور نہ اس پر کوئی عمارت بنائی جائے گی کہ وہ گر پڑے۔ اور پتھر رکھنے میں کوئی حرج نہیں تاکہ وہ علامت بن جائیں، کیونکہ اسے ابوبکر الاثرم نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: ہمیں مسدد نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں نوح بن دراج نے ابان بن تغلب سے اور انہوں نے جعفر بن محمد سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر جمعہ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی قبر کی زیارت کرتی تھیں اور آپ نے اسے پتھر کی نشانی اور علامت لگا رکھی تھی؛ اسے ابو عمر نے ذکر کیا ہے (4)۔

اور رہے وہ امور جو جائز ہیں۔ ...پس تابوت میں دفن کرنا جائز ہے بالخصوص جب (قبر) نرم زمین میں ہو اور روایت ہے کہ حضرت دانیال علیہ السلام پتھر کے تابوت میں دفن ہوئے، اور حضرت یوسف علیہ السلام نے وصیت فرمائی کہ ان کے لئے

1۔ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، فی کراھیۃ تجصیص القبور والکتابۃ علیھا، جلد 1، صفحہ 125۔ ایضاً، حدیث 972، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، فصل فی تسویۃ القبر، جلد 1، صفحہ 312۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، باب فی تسویۃ القبر، حدیث 2801، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، فی کراھیۃ تجصیص القبور، جلد 1، صفحہ 125 4۔ التمہید، جلد 3، صفحہ 233-234

شیشے کا تابوت بنایا جائے اور پھر انہیں کنوئیں میں ڈال دیا جائے اس خوف سے کہ کہیں ان کی عبادت (نہ) کی جائے، اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک اسی طرح باقی رہے، اور پھر ایک بڑھیا نے اس پر آپ کی راہنمائی کی تو انہوں نے آپ کو اٹھایا اور انہیں حضرت اسحاق علیہ السلام کے حظیرہ میں دفن کر دیا۔ اور صحیح میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے اس مرض میں کہا جس میں ان کا وصال ہوا کہ تم میرے لئے لحد بنانا اور مجھ پر کچی اینٹیں کھڑی کر کے لگانا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کیا گیا (1)۔ اللحد: یہ ہے کہ زمین میں گڑھا کھودا جاتا ہے پھر اس گڑھے میں قبلہ کی جانب سے دوسری قبر کھودی جاتی ہے اگر زمین سخت ہو تو اس میں میت کو داخل کر دیا جاتا ہے اور اسے کچی اینٹوں کے ساتھ بند کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ ہمارے نزدیک شق سے افضل ہے، کیونکہ یہی وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پسند فرمایا۔ اور اسی طرح امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ سنت لحد بنانا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: شق ہے۔ اور لحد میں پکی اینٹیں لگانا مکروہ ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ یہ بھی پتھر کی ایک قسم ہے۔ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے اسے مکروہ قرار دیا ہے، کیونکہ پکی اینٹیں تو عمارت کو پختہ کرنے کے لئے ہیں، اور قبر اور جو کچھ اس میں ہے وہ آزمائش کے لئے ہے لہٰذا اس میں پختگی مناسب نہیں ہے اور اسی بنا پر پتھر اور پکی اینٹ کو برابر قرار دیا جاتا ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ پکی اینٹ میں آگ کا اثر ہوتا ہے، پس وہ بطور فال مکروہ ہے، اور اسی بناء پر پتھر اور پکی اینٹ کے درمیان فرق کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: کچی اینٹیں اور کانے لگانا مستحب ہے جیسا کہ روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر کانوں کا ایک گٹھا لگایا گیا۔ اور شیخ امام ابو بکر محمد بن فضل حنفی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے ان کے شہروں میں زمین کے نرم ہونے کی وجہ سے تابوت بنانے کو جائز قرار دیا ہے اور کہا ہے: اگر لوہے کا تابوت بنایا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں ہے، لیکن یہ چاہئے کہ اس میں مٹی بچھائی جائے اور اوپر والا وہ حصہ جو میت کے ساتھ ملتا ہے اسے مٹی کے ساتھ لیپ کر دیا جائے۔ اور میت کی دائیں اور بائیں جانب پر ہلکی سے کچی اینٹیں رکھ دی جائیں تا کہ وہ لحد کے قائم مقام ہو جائے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی وجہ سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک میں چادر رکھی گئی، کیونکہ مدینہ طیبہ کی زمین شور یلی ہے۔ شقران نے کہا ہے: قسم بخدا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نیچے قبر شریف میں چادر رکھی گئی۔ ابو عیسیٰ ترمذی نے کہا ہے: شقران کی حدیث حسن [صحیح] اور غریب ہے (2)۔

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۭ قُلْ رَّبِّيْۤ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۣ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۠ وَّ لَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، فصل فی الدعاء للمیت، جلد 1، صفحہ 311

2۔ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، ما جاء فی الثوب الواحد یلقی تحت المیت فی القبر، جلد 1، صفحہ 124

''کچھ کہیں گے: اصحاب کہف تین تھے چوتھا ان کا کتا تھا، کچھ کہیں گے: وہ پانچ تھے چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب تخمینے ہیں بن دیکھے۔ اور کچھ کہیں گے: وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ آپ فرمائیے (اس بحث کو رہنے دو) میرا رب بہتر جانتا ہے ان کی تعداد کو (اور) نہیں جانتے ان (کی صحیح تعداد) کو مگر چند آدمی، سو بحث نہ کرو ان کے بارے میں بجز اس کے کہ سرسری سی گفتگو ہو جائے، اور نہ دریافت کرو ان کے متعلق (اہل کتاب) میں سے کسی اور سے۔''

قولہ تعالیٰ: سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ، سَيَقُوْلُوْنَ میں ضمیر سے مراد اہل تورات اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمعصر ہیں۔ اور انہوں نے اصحاب کہف کی تعداد میں یہ اختلاف کیا جو بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد نصاریٰ ہیں، کیونکہ ان کی ایک جماعت نجران سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور آپ نے اصحاب کہف کا ذکر چلا دیا تو یعقوبیہ نے کہا: وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ اور نسطوریہ نے کہا: وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔ اور مسلمانوں نے کہا: وہ سات تھے آٹھواں ان کا کتا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان یہودیوں کے بارے خبر دی جا رہی ہے جنہوں نے مشرکین کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اصحاب کہف کے بارے سوال کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور قول باری تعالیٰ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ میں واؤ نحویوں کے طریقہ پر واؤ عطف ہے جو ان کی تعداد کے بارے اخبار کے آخر میں داخل ہے؛ تاکہ ان کا معاملہ جدا اور الگ ہو جائے، اور یہ اس پر دلالت کرے کہ یہ اس کی غایت ہے جو اس بارے میں کہا گیا ہے، اور اگر یہ ساقط بھی ہو جائے تو بھی کلام صحیح ہے۔ اور ایک فرقہ نے کہا ہے ان میں سے ابن خالویہ بھی ہیں: یہ واؤ ثمانیہ ہے۔ ثعلبی نے ابوبکر بن عیاش سے بیان کیا ہے کہ قریش ان کی تعداد بیان کرتے وقت کہتے تھے: ستة سبعة وثمانية (چھ، سات اور آٹھ) پس وہ آٹھ کے عدد میں واؤ داخل کرتے تھے (1)۔ اور قفال نے بھی اسی طرح کہا ہے، پس انہوں نے کہا ہے: بے شک ایک قوم نے کہا ہے کہ عربوں کے نزدیک عدد کی انتہا سات پر ہو جاتی ہے، اور جب اس سے زیادہ کی ضرورت پیش آئے تو واؤ ذکر کر کے دوسری خبر نئے سرے سے لائی جاتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ (التوبہ: 112) پھر فرمایا وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ (التوبہ: 112) اور اس پر یہ بھی دلالت کرتا ہے کہ جب جہنم کے دروازوں کا ذکر کیا تو بغیر واؤ کے فرمایا حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا (الزمر: 71) اور جب جنت کا ذکر کیا تو فرمایا: فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا (الزمر: 71) یعنی اسے واؤ کے ساتھ ذکر کیا۔ مزید فرمایا: خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ (التحریم: 5) پھر فرمایا: وَّاَبْكَارًا پس سات ان کے نزدیک آخری عدد ہے جیسا کہ اب ہمارے نزدیک دس آخری عدد ہے۔ علامہ قشیری ابونصر نے کہا ہے: اس کلام کی مثل لانا تحکم (یعنی مرضی کا فیصلہ) ہے، ان کے نزدیک سات کہاں آخری عدد ہے پھر یہ (کلیہ) اس قول باری تعالیٰ کے ساتھ ٹوٹ جاتا ہے: هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ (الحشر: 23) اور اس میں آٹھواں اسم واؤ کے ساتھ مذکور نہیں۔ اور ان میں سے ایک قوم نے کہا ہے جو اس طرف گئے ہیں کہ ان کی تعداد سات تھی کہ قول باری

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 508

تعالیٰ: سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ میں واؤ ذکر کی گئی ہے تا کہ وہ اس پر آگاہ کرے کہ یہ عدد ہی حق اور صحیح ہے، اور یہ کہ یہ ان دوسرے اعداد سے جدا اور الگ کرنے والی ہے جو اس کے بارے میں اہل کتاب نے کہے ہیں، اسی لئے پہلے دو جملوں میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ (یہ بن دیکھے تخمینے ہیں) اور تیسرے جملے میں اسے ذکر نہیں کیا اور اس میں کسی شے سے کوئی قدح اور اعتراض نہیں، تو گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ اور الرجم سے مراد قول بالظن (یعنی محض وہم وگمان اور اندازے سے بات کرنا) ہے، ہر وہ شے جس کے لئے اندازہ اور تخمینہ لگایا جاتا ہے اس کے لئے کہا جاتا ہے: رَجَمَ فیہ و مرجومر و مُرَجَّم۔

جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

وما الحرب إلّا ما علمتم و ذُقْتُمُ   وما هو عنها بالحديث المُرَجَّم

میں (مفسر) کہتا ہوں: ماوردی اور غزنوی نے ذکر کیا ہے کہ ابن جریج اور محمد بن اسحاق نے کہا ہے: وہ آٹھ تھے، اور ان دونوں نے قول باری تعالیٰ: وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ کو صاحب کلبھم قرار دیا ہے(1) (یعنی آٹھواں کتے کا مالک تھا) اور یہ اس میں سے ہے جو واؤ کے بارے میں نحویوں کے طریقہ کو تقویت دیتا ہے، اور یہ اسی طرح ہے جیسے انہوں نے کہا۔ اور قشیری نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے قول: رَّابِعُهُمْ اور سَادِسُهُمْ میں واؤ ذکر نہیں کی، اور اگر اس کے برعکس بھی ہو تو یقیناً وہ جائز ہے، پس اس جیسی واؤ میں حکمت اور علت تلاش کرنا ایک ایسا تکلف ہے جو حقیقت سے دور ہے، اور یہ اسی قول کی طرح دوسرے مقام پر ہے: وَمَاۤ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ (الحجر) اور ایک اور مقام پر ہے: اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ۝ ذِكْرٰى (الشعراء) (یعنی ایک آیت میں واؤ مذکور ہے اور دوسری میں نہیں ہے۔)

قولہ تعالیٰ: قُلْ رَّبِّيْۤ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت میں حکم ارشاد فرمایا کہ وہ ان کی تعداد کا علم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹا دیں، بعد ازاں اس کی خبر دی کہ انسانوں میں سے اسے جاننے والے چند لوگ ہیں اور اس سے مراد اہل کتاب کا گروہ ہے؛ یہ حضرت عطا کے قول میں ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ان چند آدمیوں میں سے میں بھی ہوں، وہ سات آدمی تھے اور ان میں آٹھواں ان کا کتا تھا(2)، پھر آپ نے ان سات کے ناموں سمیت ذکر کیا۔ اور رہا کتا تو اس کا نام قطمیر کلب انمر ہے، جو قلطی سے بڑا اور کردی سے چھوٹا تھا۔ اور محمد بن سعید بن مسیب نے کہا ہے: وہ چینی کتا تھا۔ اور صحیح یہ ہے کہ وہ زبیری تھا۔ اور بیان کیا کہ نیشاپور میں کوئی محدث باقی نہیں رہا مگر اس نے یہ حدیث مجھ سے لکھی ہے سوائے اس کے جو اس پر قادر نہ ہوسکا۔ فرمایا: اسے ابوعمر وحیری نے مجھ سے لکھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا یعنی اصحاب کہف کے بارے میں آپ جھگڑا اور بحث نہ کریں مگر اسی کے ساتھ جو ہم نے آپ کی طرف وحی کردی ہے، اور وہ ان کی تعداد کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: المراء الظاہر کا معنی یہ ہے کہ آپ کہیں: ایسا نہیں ہے جیسے تم کہتے ہو، اور اسی طرح کی گفتگو، اور اس میں مقدر امر پر آپ استدلال نہ

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 297 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 508

کریں۔ اور اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعداد کسی کے لئے بیان نہیں فرمائی پس اسی لئے فرمایا اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا یعنی اسے جانے دو۔

جیسا کہ کسی نے کہا:

وتلك شكاةٌ ظاهرٌ عنك عارُها	(وہ عیب ہے اس کی عار تجھ سے ظاہر ہے)

اس آیت میں کسی کے لئے مباح نہیں ہے کہ وہ شک کرے، لیکن قول باری تعالیٰ: اِلَّا مِرَآءً یہ استعارہ ہے اس حیثیت سے کہ اہل کتاب اس میں شک کرتے ہیں۔ اور آپ کے ان کی طرف رجوع کرنے کو مِرَآءً کا نام دیا گیا ہے پھر اسے ظاہر کے ساتھ مقید کر دیا گیا ہے، پس یہ مراد حقیقی سے جو کہ مذموم ہے جدا ہو گیا۔ اور قول باری تعالیٰ فِيْهِمْ میں ضمیر اصحاب کہف کی طرف لوٹ رہی ہے اور قول باری تعالیٰ: مِّنْهُمْ میں ضمیر معارض اہل کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ میں مراد فی عدتھم (پس آپ ان کی تعداد میں شک نہ کریں)؛ اور لفظ عدۃ کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ ظاہر قول اس پر دلالت کرتا ہے۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں سے ان کے بارے پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سوال سے منع کر دیا۔ اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ مسلمانوں کے لئے کسی چیز کو جاننے کے لئے اہل کتاب کی طرف رجوع کرنا ممنوع ہے۔

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿٢٣﴾ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ۫ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ وَقُلْ عَسٰۤى اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿٢٤﴾

''ہرگز نہ کہنا کسی چیز کے متعلق کہ میں اسے کرنے والا ہوں کل، مگر (یہ کہ ساتھ یہ بھی کہو) اگر چاہا اللہ تعالیٰ نے اور یاد کر اپنے رب کو جب تو بھول جائے (یہ بھی) کہو کہ مجھے امید ہے کہ دکھا دے گا مجھے میرا رب اس سے بھی قریب تر ہدایت کی راہ۔''

قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿٢٣﴾ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ علماء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت عتاب فرمایا جب کفار نے آپ سے روح، نوجوانوں اور ذوالقرنین کے بارے سوال کیا تو آپ نے انہیں فرمایا: میں تمہارے سوالات کے جوابات کے بارے کل تمہیں آگاہ کروں گا اور آپ نے اس میں ان شاء اللہ تعالیٰ نہ کہا۔ پس پندرہ دن تک آپ سے وحی رک گئی یہاں تک کہ آپ پر یہ شاق اور گراں گزرا اور کفار بھی آپ کے بارے باتیں کر کے آپ کو پریشان کرنے لگے، پس اس اضطراب اور پریشانی کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ سورت نازل فرمائی۔ اور اس آیت میں آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ کسی کام کے بارے یہ نہ کہا کریں کہ میں کل اس اس طرح کر دوں گا، مگر یہ کہ آپ اسے اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ معلق کریں تاکہ آپ خبر کے حکم کو ثابت کرنے والے نہ ہوں، کیونکہ جب کوئی یہ کہے: میں یہ ضرور کروں گا اور پھر وہ نہ کرے تو وہ جھوٹا ہوتا ہے، اور جب وہ یہ کہے میں ضرور اس طرح کروں گا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو وہ مخبر عنہ کو ثابت کرنے کے حکم سے نکل گیا۔ پس قول

باری تعالیٰ: لِشَایۡءٍ میں لام قائم مقام فی کے ہے یا گویا کہ یہ کہا لأجل شئ۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابن عطیہ نے کہا ہے(1): اس آیت میں لوگوں نے قسم میں ان شاء اللہ کہنے کے بارے گفتگو کی ہے، حالانکہ یہ آیت قسم کے بارے نہیں ہے بلکہ یہ قسم کے سوا عام کلام میں ان شاء اللہ کہنے کے بیان میں ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰهُ اس کلام میں حذف ہے ظاہر اس کا تقاضا کرتا ہے اور ایجاز (اختصار) اسے حسین بنا رہا ہے، تقدیر کلام یہ ہے: الا ان تقول إلا أن یشاء اللہ یا إلا أن تقول إن شاء اللہ۔ پس اس کا معنی یہ ہے: مگر یہ کہ آپ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا ذکر کریں۔ پس اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰهُ اس قول سے نہیں ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جسے ابن عطیہ نے اختیار اور پسند کیا ہے وہی کسائی، فراء، اور اخفش کا قول ہے۔ بصریوں نے کہا ہے: اس کا معنی ہے الا بمشیۃ اللہ۔ پس جب کوئی انسان کہے أنا أفعل ھذا إن شاء اللہ تو اس کا معنی ہوتا ہے میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ یہ کام کروں گا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے(2): اور ایک جماعت نے کہا ہے: اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰهُ یہ قول باری تعالیٰ: وَ لَا تَقُوۡلَنَّ سے استثنا ہے۔ انہوں نے کہا: اس قول کو علامہ طبری نے بیان کیا ہے اور اس کا رد بھی کیا گیا ہے، اور یہ فساد میں سے ہے اس حیثیت سے یہ لازم ہے کہ اسے بیان نہ کیا جائے۔ اور استثناء فی الیمین اور اس کے حکم کے بارے بحث سورۃ المائدہ میں گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اذۡکُرۡ رَّبَّکَ اِذَا نَسِیۡتَ اس میں ایک مسئلہ ہے، اور وہ ہے نسیان کے بعد ذکر کا امر اور مامور بہ کے ذکر میں اختلاف ہے، پس کہا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ قُلۡ عَسٰۤی اَنۡ یَّهۡدِیَنِ رَبِّیۡ لِاَقۡرَبَ مِنۡ هٰذَا رَشَدًا، محمد الکوفی مفسر نے کہا ہے: بے شک یہ اپنے الفاظ کے ساتھ ان میں سے ہے جس کے بارے حکم دیا گیا ہے کہ ہر وہ انہیں کہے جو ان شاء اللہ نہ کہے، اور بلاشبہ یہ ان شاء اللہ بھول جانے کا کفارہ ہے۔ اور جمہور نے کہا ہے: یہ دعا ہے جس کے بارے حکم دیا گیا ہے نہ کہ یہ تخصیص ہے(3)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اس کا قول وہ ان شاء اللہ ہے جسے قسم کے وقت وہ بھول گیا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا گیا ہے کہ اگر وہ ان شاء اللہ بھول گیا پھر اسے یاد آ گیا اگرچہ سال بعد تو وہ حانث نہیں ہوا اگر وہ قسم اٹھانے والا تھا(4)، اور یہی حضرت مجاہد کا قول ہے۔ اور اسماعیل بن اسحاق نے اسے ابو العالیہ سے قول باری تعالیٰ: وَ اذۡکُرۡ رَّبَّکَ اِذَا نَسِیۡتَ کے تحت بیان کیا ہے۔ فرمایا: وہ ان شاء اللہ کہہ دے جب اسے یاد آ جائے۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: (وہ کہہ دے) جب تک وہ مجلس ذکر میں ہو(5)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: دو سال (بعد تک کہہ سکتا ہے): اسے غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے کہا: پس اسے گناہ سے خلاصی پانے کے لئے ان شاء اللہ کے ساتھ برکت حاصل کرنے کے تدارک پر محمول کیا جائے گا۔ اور رہا وہ ان شاء اللہ کہنا جو حکماً مفید ہو تو وہ صرف متصل کہنا ہی صحیح ہوتا ہے۔ سدی نے کہا ہے: مراد ہر وہ نماز ہے جسے آدمی بھول جائے جب وہ اسے یاد آ جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تو اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ استثنا کرتا کہ تو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 509 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 509-508 3۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 509

4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

نہ بھولے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا ذکر کرو جب تک تم اسے بھول نہ جاؤ۔ اور یہ قول بھی ہے: جب تو کسی شے کو بھول جائے تو تو اس کا ذکر کر وہ تجھے اس کی یاد دلادے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تو اس کا ذکر کر جب تو اس کے غیر کو بھول جائے یا تو اپنے آپ کو بھول جائے، پس وہی ذکر کی حقیقت ہے۔ اور اس آیت میں خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، اور اصح قول کے مطابق یہ استفتاح کلام (آغاز کلام) ہے، اور استثناء فی الیمین میں سے اس میں کوئی شے نہیں ہے، اور یہ اس کے بعد آپ کی تمام امت کو عام ہے، کیونکہ یہ ایسا حکم ہے جو اپنے کثرت سے واقع ہونے کے سبب لوگوں میں متردد رہتا ہے۔ واللہ الموفق۔

وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ۝

''اور (اہل کتاب کہتے ہیں کہ) وہ ٹھہرے رہے اپنے غار میں تین سو سال اور زیادہ کیے انہوں نے (اس پر) نو سال''۔

یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے غار میں ٹھہرنے کی مدت کے بارے خبر ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں وَقَالُوْا لَبِثُوا ہے۔ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بیشک بنی اسرائیل نے اس مدت میں اختلاف کیا جو مدت ان پر ان کے اظہار کے بعد سے لے کر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی مدت تک گزر چکی تھی، پس ان میں سے بعض نے کہا: بے شک وہ تین سو نو سال تک ٹھہرے رہے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ یہ مدت ان کے سوئے رہنے کی ہے، اور وہ جو اس کے بعد ہے وہ آدمی کے لئے مجہول ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ وہ اس کا علم اس کی طرف لوٹا دے۔ (یعنی یہ کہ اس مدت کے بارے رب کریم بہتر جانتا ہے)۔ ابن عطیہ نے کہا ہے(1): پس اس بنا پر قول باری تعالیٰ میں پہلا لَبِثُوْا غار میں سونے کی مدت بیان کرنے کے لئے ہے۔ اور دوسرے لَبِثُوْا سے مراد اظہار کے بعد سے لے کر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی مدت تک کا بیان ہے، یا اس وقت تک جب تک وہ بوسیدہ ہو کر معدوم نہیں ہوئے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: نزول قرآن کے وقت تک۔ حضرت ضحاک نے کہا ہے: ان کے فوت ہونے کی مدت تک۔ اور ان میں سے بعض نے کہا ہے: بے شک جب فرمایا وَازْدَادُوْا تِسْعًا لوگوں کو معلوم نہ ہوا کہ یہ نو ساعتیں ہیں یا دن ہیں یا جمعے ہیں یا مہینے ہیں یا نو سال ہیں۔ اور بنی اسرائیل نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے اس نو کے بارے میں علم اپنی طرف لوٹانے کا حکم ارشاد فرمایا، پس یہ اس بنا پر مبہم ہے۔ اور ظاہر کلام عرب کے مطابق جو اس سے سمجھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ سال ہیں۔ اور ان کے معاملے میں سے ظاہر یہ ہے کہ وہ کھڑے ہوئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تھوڑا بعد غار میں داخل ہوئے درآنحالیکہ حواریوں میں سے ابھی کچھ باقی تھے۔ اور اس کے علاوہ بھی اقوال بیان کیے گئے ہیں جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

علامہ قشیری نے کہا ہے: التسع سے نو راتیں اور نو ساعتیں نہیں سمجھی جاسکتیں اس لئے کہ اس سے پہلے سنین (سالوں) کا ذکر ہے، جیسا کہ تو کہتا ہے: عندی مائۃ درھم و خمسۃ (میرے پاس ایک سو درہم اور پانچ ہیں) تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک سو پانچ درہم (یعنی پانچ سے مراد بھی درہم ہی ہیں)۔ اور ابو علی نے کہا ہے: وَازْدَادُوْا تِسْعًا یعنی ازدادوا لبث تسع

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 510

(انہوں نے ٹھہرنے میں نو زیادہ کیے) پس یہ (لبث) حذف کر دیا گیا۔ اور ضحاک نے کہا ہے: جب آیت: وَ لَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ نازل ہوئی تو انہوں نے کہا: یہ تین سو سال ہیں یا مہینے ہیں یا جمعے ہیں (مراد ہفتے ہیں) یا دن ہیں تب اللہ تعالیٰ نے سِنِيْنَ نازل فرمایا(1) (یعنی یہ تین سو سال ہیں)۔ نقاش نے بیان کیا ہے: اس کا یہ معنی نہیں کہ وہ دنوں کے حساب سے تین سو شمسی سال ٹھہرے رہے، کیونکہ جب یہاں عربی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی جارہی ہے اور تسعًا (نو) کا ذکر کیا گیا ہے، تو آپ کے نزدیک سنین سے بھی قمری سال ہی سمجھے گئے اور یہ زیادتی وہ ہے(2) جو دو حسابوں (شمسی اور قمری سالوں) کے درمیان واقع ہے، اسی طرح غزنوی نے ذکر کیا ہے، یعنی شمسی سال اور قمری سال کے اختلاف کے سبب، کیونکہ ہر تینتیس سال اور ایک سال کے ثلث میں ایک سال کا فرق بنتا ہے پس تین سو سال میں نو سال کا فرق ہو جائے گا۔

اور جمہور نے ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ، مائۃ کو تنوین کے ساتھ اور سنین کو نصب کے ساتھ تقدیم و تاخیر کی بنا پر پڑھا ہے، ای سنین ثلثمائۃ پس صفت کو موصوف پر مقدم کیا گیا، تو اس بنا پر سِنِيْنَ بدل یا عطف بیان بن جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تفسیر اور تمیز کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور سِنِيْنَ، سنۃ کے محل میں ہے۔ اور حمزہ اور کسائی نے مائۃ کو سنین کی طرف مضاف کر کے پڑھا ہے، اور تنوین کو ترک کر دیا ہے، گویا انہوں نے سنین کو بمنزلہ سنۃ کے بنایا کیونکہ دونوں کا معنی ایک ہے۔ ابو علی نے کہا ہے: یہ وہ اعداد ہیں جو مشہور روایت کے مطابق آحاد کی طرف مضاف ہوتے ہیں، جیسے ثلثمائۃ رجلٍ و ثوبٍ اور کبھی جمع کی طرف بھی مضاف ہوتے ہیں۔ اور مصحف عبداللہ میں ثلثمائۃ سنۃ ہے(3)۔ اور ضحاک نے ثلثمائۃ سنون واؤ کے ساتھ قرآت کی ہے۔ اور ابو عمرو نے اس کے خلاف تَسْعًا کو تا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور جمہور نے اسے تا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے(4)۔ اور فراء، کسائی اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے ولبثوا فی کھفھم سنین ثلثمائۃ۔

قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۫ وَّ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾

”آپ فرمایئے: اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جتنی مدت وہ ٹھہرے، اسی کے لئے (علم) غیب ہے آسمانوں اور زمین کا، وہ بڑا دیکھنے والا ہے اور سب باتیں سننے والا ہے، نہیں ان کا اس کے سوا کوئی دوست اور وہ نہیں شریک کرتا اپنے حکم میں کسی کو۔“

قولہ تعالیٰ: قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے اس مدت کے بارے میں جوان کی موت کے بعد سے لے کر ان کے بارے میں قرآن کریم نازل ہونے تک ہے، یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی بنا پر ہے یا ان کے فوت ہونے تک کی مدت مراد ہے، یہ حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یا بوسیدہ ہو کر ان کے متغیر ہونے کے وقت تک کی مدت مراد ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس مدت کے بارے میں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے جتنی مدت وہ غار میں ٹھہرے رہے۔ اور یہ وہ مدت ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یہود کی جانب سے کیا ہے اگرچہ انہوں نے زیادہ یا کم ذکر کی،

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 267 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 510 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

یعنی اللہ تعالیٰ یا اس کے سوا جسے اللہ تعالیٰ نے اس کا علم دیا ہے، اس کے بارے کوئی نہیں جانتا، لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اسی کے لئے آسمانوں اور زمین کا علم غیب ہے)۔

قولہ تعالیٰ: اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ یعنی وہ کتنا دیکھنے والا اور کتنا سننے والا ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ سے زیادہ نہ کوئی دیکھنے والا ہے اور نہ سننے والا ہے۔ یہ ادراک سے متعلقہ عبارات ہیں۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اَبْصِرْ بِهٖ کا معنی ہو یعنی آپ دیکھیں اس کی وحی کے ساتھ اور اس کی راہنمائی کے ساتھ جو اس نے آپ کی طرف فرمائی اور آپ کو دلائل اور حجتیں عطا فرمائیں اور امور کے حقائق سے آپ کو آگاہ کیا، اور اسی کے ساتھ عالم کو سنائیں، تو اس صورت میں یہ دونوں امر کے صیغے ہوں گے نہ کہ یہ صیغہ تعجب ہوں گے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے آپ انہیں دکھائیں اور انہیں وہ سنائیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے۔ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ یعنی اصحاب کہف کے لئے کوئی ولی نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے جو ان کی حفاظت کا ولی اور نگران ہو۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ لَهُمْ کی ضمیر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمعصر کفار کی طرف لوٹ رہی ہو، اور اس کا معنی ہو: ان کے ٹھہرنے کی مدت میں ان اختلاف کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ولی نہیں جو ان کے معاملے کی تدبیر کر سکتا ہو، پس وہ اس سے زیادہ عالم کیسے ہو سکتے ہیں، یا اس کے انہیں سکھائے بغیر وہ اسے کیسے جان سکتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَّ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا اسے یا اور کاف کے رفع کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر کے معنی پر ہے۔ اور ابن عامر، حسن، ابو رجا، قتادہ اور جحدری رحمہم اللہ تعالیٰ نے ولا تشرك تا کے ساتھ اور کاف کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے، اور اس کا قول ولا تشرك کا اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ پر عطف ہوگا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے یشرك یا اور جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعقوب نے کہا ہے: میں اس کی وجہ نہیں جانتا۔

مسئلہ: اصحاب کہف کے بارے میں یہ اختلاف ہے کہ کیا وہ فوت ہو گئے اور فناہ ہو گئے، یا وہ سوئے پڑے ہیں اور ان کے جسم محفوظ ہیں، پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ اپنے کسی غزوہ میں لوگوں کے ساتھ اصحاب کہف کی جگہ اور ان کے پہاڑ کے پاس سے گزرے، تو لوگ آپ کی معیت میں اس کی طرف چل کر گئے تو انہوں نے وہاں ہڈیاں پائیں تو انہوں نے کہا: یہ اصحاب کہف کی ہڈیاں ہیں۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے انہیں کہا: وہ تو ایسی قوم ہے جو طویل مدت سے فناہ اور معدوم ہو گئے ہیں، پس یہ بات ایک راہب نے سنی تو اس نے کہا: میں عربوں میں سے کسی کے بارے میں یہ خیال نہیں کرتا کہ وہ اسے جانتا ہو، تو اس کو بتایا گیا کہ یہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا کے بیٹے ہیں۔ اور ایک گروہ نے روایت کیا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ضرور حج کریں گے اور ان کے ساتھ اصحاب کہف ہوں گے کیونکہ انہوں نے ابھی تک حج ادا نہیں کیا۔" اسے ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اور یہ کہ آپ حج یا عمرہ کرنے کے لئے روحاء سے گزریں گے یا اللہ تعالیٰ آپ کے لئے ان (دونوں) کو جمع کر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 510　2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 511

دے گا۔ پس اللہ تعالیٰ اصحاب کہف اور رقیم کو آپ کا حواری بنا دے گا، پس وہ حج کرتے ہوئے گزریں گے کیونکہ نہ انہوں نے حج کیا ہے اور نہ وہ فوت ہوئے ہیں اور ہم نے یہ روایت مکمل طور پر کتاب "التذکرہ" میں ذکر کی ہے۔ پس اس بنا پر تو وہ سوئے پڑے ہیں اور یوم قیامت تک نہیں مریں گے، بلکہ قیامت سے تھوڑا پہلے انہیں موت آئے گی۔

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝

"اور پڑھ سنایئے (انہیں) جو وحی کیا جاتا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی کتاب سے، کوئی بدلنے والا نہیں اس کے ارشادات کا، اور نہیں پائیں گے آپ اس کے سوا کوئی پناہ گاہ۔"

قولہ تعالیٰ: وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ کہا گیا ہے: یہ اصحاب کہف کے تمام قصہ کے بارے ہے، یعنی آپ قرآن کریم کی اتباع اور پیروی کریں پس اللہ تعالیٰ کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں اور نہ اس کے خلاف ہو سکتا ہے جو اس نے اصحاب کہف کے واقعہ کے بارے خبر دی ہے۔ اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے ان کلمات کے ساتھ گنہگاروں اور اس کی کتاب کی مخالفت کرنے والوں کو وعید سنائی ہے (1) انہیں کوئی تبدیل کرنے والا نہیں۔ وَلَنْ تَجِدَ اور آپ ہرگز نہیں پائیں گے مِنْ دُوْنِهٖ اس کے سوا (کوئی پناہ گاہ) اگر آپ نے قرآن کریم کی اتباع اور پیروی نہ کی اور آپ نے اس کی مخالفت کی۔ مُلْتَحَدًا یعنی پناہ گاہ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے مائل ہونے کی جگہ۔ اور اس کی اصل المیل (مائل ہونا، جھکنا) ہے؛ اور یہ لجأت الیہ سے ہے یعنی میں اس کی طرف مائل ہوا۔ (میں نے اس کے پاس پناہ لی۔) قشیری ابو نصر عبد الرحیم نے کہا ہے: یہ اصحاب کہف کے قصہ کا آخر ہے، جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ روم کی طرف غزوۃ المضیق پر گئے اور آپ کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی تھے پس وہ اس غار کے پاس جا کر رکے جس میں اصحاب کہف تھے، تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر ہمارے لئے انہیں ظاہر کر دیا جائے تو ہم انہیں دیکھ لیں، ان کی زیارت کر لیں، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تحقیق اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے روک دیا ہے جو آپ سے بہتر اور افضل ہے، اور ارشاد فرمایا: لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا (اگر تو جھانک کر انہیں دیکھے تو ان سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑا ہو۔) تو انہوں نے کہا: میں باز نہیں آؤں گا یہاں تک کہ میں ان کے بارے جان لوں اور اس کام کے لئے انہوں نے ایک جماعت بھیجی، پس جب وہ غار میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ہوا بھیج دی تو اس نے انہیں باہر نکال دیا (2)، اسے ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ذکر کیا ہے اور یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ وہ آپ کو ان کی زیارت کرائے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بلاشبہ آپ انہیں دار دنیا میں نہیں دیکھ سکتے بلکہ آپ اپنے اخیار صحابہ کرام میں سے چار کو ان کی طرف بھیجئے تا کہ وہ آپ کی رسالت کا پیغام ان تک پہنچائیں اور انہیں ایمان کی دعوت دیں؛ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا: "میں انہیں کیسے بھیج سکتا ہوں؟" تو انہوں نے کہا: آپ اپنی چادر بچھائیں اور اس کی اطراف میں سے ایک طرف

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 269 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 293، مفہوم

پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو، دوسری طرف پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اور اس کی تیسری طرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اور چوتھی طرف پر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو بٹھا دیں، پھر اس نرم ہوا کو بلایئے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر کی گئی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے حکم دے رہا ہے کہ وہ آپ کی اطاعت اور پیروی کرے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا ہی کیا تو ہوا انہیں اٹھا کر غار کے دروازے تک لے گئی، پس انہوں نے اس کا ایک پتھر اکھیڑ دیا تو کتے نے ان پر حملہ کر دیا لیکن جب اس نے انہیں دیکھا تو وہ اپنا سر اور اپنی دم ہلانے لگا اور ان کی طرف اپنے سر سے اشارہ کیا کہ داخل ہو جاؤ چنانچہ وہ غار میں داخل ہوئے اور انہوں نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، تو اللہ تعالیٰ نے ان جوانوں کی طرف ان کی ارواح کو لوٹایا اور وہ تمام کے تمام کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کہا: علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، تو انہوں نے ان کو کہا: اے جوانوں کے گروہ! بے شک نبی محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو سلام فرماتے ہیں اور انہوں نے کہا: اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی سلام ہو جب تک زمین و آسمان قائم ہیں، اور تم پر بھی اس کے عوض جو تم نے پیغام پہنچایا ہے، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین قبول کر لیا اور وہ اسلام لے آئے، پھر انہوں نے کہا: ہماری طرف سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلام پیش کرنا، انہوں نے اپنے بستر لے لئے اور آخر زمانہ میں امام مہدی علیہ السلام کے ظہور تک اپنی نیند میں ہو گئے۔ پس کہا جاتا ہے کہ امام مہدی علیہ السلام انہیں سلام فرمائیں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں زندہ کر دے گا (بیدار کر دے گا) پھر وہ اپنی نیند کی طرف لوٹ جائیں گے اور پھر وہ قیامت قائم ہونے تک نہیں اٹھیں گے، پس حضرت جبرائیل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کے بارے خبر دی جو ان کے متعلق تھا، پھر ہوا انہیں لوٹا لائی تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم نے انہیں کیسے پایا ہے؟'' تو انہوں نے آپ کو پوری خبر سے آگاہ کیا، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ''اے اللہ! میرے درمیان اور میرے اصحاب اور میرے سسرال کے درمیان تفریق نہ کرنا اور اسے بخش دے جس نے مجھ سے محبت کی اور میرے اہل بیت، میرے خواص اور میرے اصحاب کے ساتھ محبت کی (1)''۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اصحاب کہف حضرت مسیح علیہ السلام سے پہلے غار میں داخل ہوئے، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو ان کے بارے خبر دی پھر انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے درمیان زمانہ فترت میں اٹھایا گیا، بیدار کیا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے تھے اور یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تورات میں ان کا ذکر کیا ہے، اسی وجہ سے یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کے بارے سوال کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد غار میں داخل ہوئے، پس ان کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

''اور روکے رکھیے اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام طلب گار ہیں اس کی رضا

1۔ عرائس المجالس، صفحہ 431

کے اور نہ ہٹیں آپ کی نگاہیں ان سے، کیا آپ چاہتے ہیں دنیوی زندگی کی زینت، اور نہ پیروی کیجئے اس (بدنصیب) کی غافل کر دیا ہے ہم نے جس کے دل کو اپنی یاد سے اور وہ اتباع کرتا ہے اپنی خواہش کا اور اس کا معاملہ حد سے گزر گیا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ (الانعام:52) (اور نہ دور ہٹاؤ انہیں جو پکارتے رہتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام) یہ سورۃ الانعام میں ہے اور اس کے بارے کلام گزر چکی ہے۔ اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مولفۃ قلوب آئے، یعنی عیینہ بن حصن اور اقرع بن حابس اور انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اگر آپ صدر مجلس میں تشریف رکھیں اور آپ ہم سے انہیں اور ان کے جبوں کی بو کو دور کریں مراد حضرت سلمان، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہما اور مسلمان فقراء ہیں، وہ اون کے جبے پہنے ہوئے تھے اور ان پر ان کے سوا کچھ نہ تھا تو ہم آپ کے پاس بیٹھتے ہیں اور آپ سے گفتگو کرتے ہیں اور آپ سے کچھ لیتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: وَاتْلُ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۗ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا یعنی اللہ تعالیٰ انہیں آگ سے ڈرا رہا ہے اور اس کی دھمکی دے رہا ہے۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں تلاش کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے یہاں تک کہ جب آپ نے انہیں مسجد کے آخر میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوئے پایا تو کہا: ''سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے مجھے موت نہیں دی یہاں تک کہ مجھے حکم فرمایا کہ میں اپنے آپ کو اپنی امت کے ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھوں، تمہارے ساتھ ہی جینا ہے اور تمہارے ساتھ ہی مرنا ہے۔''

(الحمد لله الذی لم يُمِتْنی حتی أمرنی أن أصبر نفسی مع رجال من أمتی، معكم المحيا و معكم الممات) (1)

يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وہ اللہ تعالیٰ کی طاعت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور نصر بن عاصم، مالک بن دینار، اور ابوعبدالرحمن نے وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ (الانعام:52) پڑھا ہے۔ اور ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ عام لوگوں میں واؤ کے ساتھ ہے۔ اور ابوجعفر نحاس نے کہا ہے: یہ ان کے حیاۃ اور صلاۃ واو کے ساتھ لکھنے سے لازم نہیں آتا، اور نہ قریب قریب عرب الغدوۃ کہتے ہیں کیونکہ یہ معروف ہے۔ اور حسن سے روایت ہے وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ یعنی آپ کی آنکھیں ان کے سوا کی طرف تجاوز نہ کریں جو کہ دنیا کے بیٹے ہیں اور اس کی زینت کے طلبگار ہیں، اسے یزیدی نے بیان کیا ہے (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ کی آنکھیں انہیں حقیر نہ جانیں، جیسا کہ کہا جاتا ہے: فلان تنبوعنه العين یعنی فلاں کو حقیر جانتے ہوئے آنکھ اس سے دور ہو گئی۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 272

2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 302، مفہوم

تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی کیا آپ ان سرداروں کے ساتھ بیٹھنے کو زینت بخشیں گے جنہوں نے آپ کو اپنی مجلس سے فقراء کو دور ہٹانے کی تجویز دی ہے، حالانکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے کا ارادہ نہیں فرمایا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس طرح کرنے سے منع کر دیا، تو یہ اس قول سے زیادہ نہیں ہے: لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (الزمر:65) (کہ اگر (بفرض محال) آپ نے بھی شرک کیا تو ضائع ہو جائیں گے آپ کے اعمال) اگرچہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شرک سے محفوظ اور بچا کر رکھا ہے۔ اور تُرِيْدُ فعل مضارع حال کے محل میں ہے، یعنی آپ کی آنکھیں تجاوز نہ کریں درآنحالیکہ آپ ارادہ رکھتے ہوں۔ (لا تعد عيناك مريدا)۔

جیسا کہ امری القیس کا قول ہے:

فقلتُ له لا تبكِ عَيْنُك إنّما نحاول مُلْكا أو نموتَ فنُعْذَرا

اور بعض نے کہا ہے کہ اصل کلام یہ ہے: لا تعد عينيك عنهم (یعنی آپ ان سے اپنی آنکھیں نہ پھیریں) کیونکہ تعد بذات خود متعدی ہے۔ آپ کو کہا گیا ہے: وہ جس کے سبب رفع عینین کی آیت نازل ہوئی وہ دونوں میں معنی نصب کی طرف راجع ہے، کیونکہ لا تعد عيناك عنهم قائم مقام لا تنصرف عيناك عنهم کے ہے، تو لا تنصرفُ عيناك عنهم کا معنی ہے لا تنصرف عينيك عنهم، یعنی آپ کی آنکھیں ان سے نہ پھریں کا معنی ہے آپ ان سے اپنی آنکھیں نہ پھیریں؛ پس فعل کی نسبت عینین (آنکھوں) کی طرف کی گئی ہے اور یہ فی الحقیقت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف توجہ کی گئی ہے؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ (التوبہ:55) (سو نہ تعجب میں ڈال دیں تمہیں ان کے مال)۔ تو اس میں الاعجاب کی نسبت اموال کی طرف کی گئی ہے، اور اس کا معنی ہے: لا تعجبك يا محمد أموالهم (اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ان کا مال آپ کو تعجب میں نہ ڈالے) اور آپ کے لئے مزید وضاحت زجاج کا قول کرتا ہے: بے شک اس کا معنی ہے آپ اپنی نگاہیں ان سے ان کے غیر کی طرف نہ پھیریں جو کہ صاحب حیثیت و زینت ہیں۔ (لا تصرف بصرك عنهم إلى غيرهم من ذوي الهيئات والزينة)

قولہ تعالیٰ: وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا جویبر نے ضحاک سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ: وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا کے بارے میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: کہ یہ ارشاد امیہ بن خلف جمحی کے بارے نازل ہوا، وہ اس لئے کہ اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایسے امر کی دعوت دی جسے آپ نے ناپسند کیا اور وہ یہ کہ آپ فقراء کو اپنے آپ سے دور کر دیں اور اہل مکہ کے سرداروں کو اپنے قریب کریں، تب اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا یعنی آپ اس کی پیروی نہ کریں جس کے دل پر ہم نے مہر لگا دی ہے اس سے کہ وہ توحید قبول کرے۔ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ (اور وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے) یعنی شرک کرتا ہے(1)۔ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا کہا گیا ہے: کہ فُرُطًا اس تفریط سے ہے جس کا معنی تقصیر (کمی کرنا، کوتاہی کرنا) ہے اور ایمان ترک کرنے کے سبب عجز کو مقدم کرنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ یہ افراط اور حد سے تجاوز کرنے سے ہے، اور اس قوم نے کہا تھا: ہم مضر کے

1۔ اسباب نزول، صفحہ 216، قدیمی کتب خانہ کراچی

اشراف اور سردار ہیں اگر ہم اسلام لے آئے تو بہت سے لوگ بھی اسلام قبول کرلیں گے۔ اور انہوں نے تکبر اور قول میں افراط اور زیادتی کے سبب یہ کہا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ فُرُطًا سے مراد شر میں واقع ہونا ہے۔ یہ ان کے اس قول سے ہے: فرط منه أمر یعنی معاملہ اس سے بڑھ گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ کا معنی ہے ہم نے اسے غافل پایا، جیسا کہ تو کہتا ہے: لقیت فلانا فاحمدته، یعنی میں نے اسے محمود (قابل تعریف) پایا۔ اور عمرو بن معدیکرب نے بنی حارث بن کعب کو کہا: قسم بخدا! ہم نے تم سے مانگا اور تمہیں بخیل نہ پایا، اور ہم نے تمہارے ساتھ قتال کیا اور ہم نے تمہیں بزدل نہ پایا، اور ہم نے تمہیں جوش دلایا اور تمہیں خاموش نہ پایا (والله لقد سألنا کم فما أبخلنا کم و قاتلنا کم فما أجبنا کم و ھاجینا کم فما أفحمنا کم یعنی ما وجدنا کم بخلاء ولا جبناء ولا مفحمین) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت عیینہ بن حصن فزاری کے بارے میں نازل ہوئی، یعنی وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا اسے عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے، اور اسے نحاس نے حضرت سفیان ثوری سے بیان کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ؕ وَ اِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ؕ بِئْسَ الشَّرَابُ ؕ وَ سَآءَتْ مُرْتَفَقًا ۝

''اور فرمائیے: حق تمہارے رب کی طرف سے ہے، پس جس کا جی چاہے وہ ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر کرتا رہے، بے شک ہم نے تیار کر رکھی ہے ظالموں کے لئے آگ، گھیر لیا ہے انہیں اس آگ کی دیوار نے۔ اور اگر وہ فریاد کریں گے تو ان کی فریاد رسی کی جائے گی ایسے پانی کے ساتھ جو پیپ کی طرح (غلیظ) ہے (اور اتنا گرم کہ) بھون ڈالتا ہے چہروں کو یہ مشروب بڑا ناگوار ہے، اور یہ قرارگاہ بڑی تکلیف دہ ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ اس میں الْحَقُّ مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، ای قل ھو الحق۔ (فرمائیے وہ حق ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، اور اس کی خبر قول باری تعالیٰ مِنْ رَّبِّكُمْ ہے۔ اور آیت کا معنی ہے: اے محمد ﷺ آپ فرمائیے ان لوگوں کو جن کے دلوں کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے: اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے ہی حق ہے اور اسی کے پاس توفیق عطا کرنا اور رسوا کرنا ہے، اسی کے دست قدرت میں ہدایت دینا اور گمراہ کرنا ہے، وہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے پس وہ ایمان لے آتا ہے اور وہ گمراہ کر دیتا ہے جسے چاہتا ہے پس وہ کافر ہو جاتا ہے، اس میں سے میرے پاس کوئی شے نہیں ہے، پس اللہ تعالیٰ حق عطا فرما دیتا ہے جسے چاہتا ہے اگرچہ وہ ضعیف اور کمزور ہو، اور جسے چاہتا ہے محروم کر دیتا ہے اگرچہ وہ طاقتور اور غنی ہو، اور میں تمہاری خواہش اور پسند پر مومنین کو نہیں بھگا سکتا (انہیں اپنے سے دور نہیں ہٹا سکتا) لہٰذا اگر تم چاہو تو ایمان قبول کر لو اور اگر چاہو تو کافر ہو۔ اور یہ ایمان اور کفر کے درمیان کوئی اختیار دینا اور رخصت دینا نہیں، بلکہ یہ تو وعید اور جھڑک ہے، یعنی اگر تم نے کفر اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جہنم تیار کر رکھی ہے، اور اگر تم ایمان لے آئے تو تمہارے لئے جنت ہوگی۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا یعنی ہم نے تیار کر رکھی ہے۔ لِلظّٰلِمِیْنَ یعنی کفر کرنے والوں اور انکار کرنے والوں کے لئے نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا علامہ جوہری نے کہا ہے: السرادق السرادقات کی واحد ہے وہ جو گھر کے صحن میں پھیلائے جاتے ہیں (خیمے، ٹینٹ) اور ہر وہ گھر جو روئی سے بنایا جائے وہی سرادق کہلاتا ہے۔

جیسا کہ رؤبہ نے کہا ہے:

یا حَکَمَ بنَ المنذر بن الجارود سُرادِقُ المجد علیك مَمْدُوْدُ

کہا جاتا ہے: بیت مُسَرْدَقٌ۔ اور سلامہ بن جندل اُبرویز کا ذکر کرتا ہے اور اسے نعمان بن منذر نے ہاتھی کے پاؤں کے نیچے روند کر قتل کر دیا تھا۔

هو المُدْخِل النعمانَ بیتاً سماؤہ صُدُوْرُ الفیول بعد بَیْتٍ مُسَرْدَقٍ

ابن اعرابی نے کہا ہے: سُرَادِقُهَا اس (آگ) کی فصیل۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا(1): آگ کی دیوار۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: آگ سے ایک گردن سی نکلے گی اور وہ کفار کو باڑ کی طرح گھیر لے گی(2)۔ قتبی نے کہا ہے: السرادق سے مراد وہ رکاوٹ اور باڑ ہے جو خیمے کے ارد گرد لگائی جاتی ہے، اور یہی ابن عزیز نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد وہ دھواں ہے جو قیامت کے دن کافروں کو گھیر لے گا(3)، اور یہ وہی ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ المرسلات میں کیا ہے اس حیثیت سے کہ وہ فرماتا ہے: اِنْطَلِقُوْۤا اِلٰى ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۝ (المرسلات) (چلو اس سایہ کی طرف جو تین شاخوں والا ہے) اور ارشاد گرامی ہے: وَّ ظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ ۝ (الواقعہ) (اور سیاہ دھوئیں کے سایہ میں ہوں گے)، یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ وہ سمندر ہے جو دنیا کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور یعلی بن امیہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: البحر وہ جہنم ہے...... پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی...... نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا پھر فرمایا: قسم بخدا! میں اس میں کبھی داخل نہیں ہوں گا جب تک میں زندہ رہا اور نہ اس سے کوئی قطرہ مجھے پہنچے گا۔'' اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ اور ابن المبارک نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جہنم کے سرادق چار مضبوط اور موٹی دیواریں ہیں ہر دیوار چالیس برس کی مسافت کی ہے(4)'' اسے ابو عیسیٰ ترمذی نے نقل کیا ہے، اور کہا ہے: یہ حدیث حسن، صحیح، غریب ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ وضاحت اس پر دلالت کرتی ہے کہ سرادق سے مراد وہ دھواں یا آگ، اور وہ دیواریں ہیں جن کا یہ وصف بیان کیا گیا ہے جو کفار پر غالب آ جائیں گے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا یُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ یَشْوِی الْوُجُوْهَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: المهل سے مراد گاڑھا پانی ہے جیسا کہ تیل کی تلچھٹ ہوتی ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس سے مراد پیپ اور خون ہے۔ حضرت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 513 2۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 584 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 303

4۔ جامع ترمذی، ابواب صفۃ جہنم، ما جاء فی صفۃ شراب اہل النار، جلد 2، صفحہ 82۔ ایضاً، حدیث نمبر 2508، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ کالے رنگ کا پانی ہے، بلاشبہ جہنم (تاریک) اور سیاہ ہے، اس کا پانی سیاہ ہے، اس کے درخت سیاہ ہیں اور اس کے باسی بھی سیاہ ہوں گے۔ اور ابوعبیدہ نے کہا ہے: زمین کے جواہر میں سے ہر وہ شے جسے پگھلا دیا جائے مثلاً لوہا، سیسہ، تانبہ اور قذویر (ایک دھات) اور وہ ابلنے کے سبب کھول رہی ہو تو وہی مہل ہے۔ اور اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے بیان کیا ہے: مراد وہ ہے جس کی گرمائش اور حرارت انتہا کو پہنچی ہوئی ہو۔ اور کہا ہے کہ المهل تارکول کی ایک قسم ہے، کہا جاتا ہے: مَهلت البعير فهو ممهول (میں نے اونٹ پر تارکول ملا تو وہ تارکول والا ہوگیا)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ زہر ہے۔ اور ان تمام اقوال میں معنی قریب قریب ہے۔ اور ترمذی میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قول باری تعالیٰ: كَالْمُهْلِ کے بارے میں روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''یہ تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوتا ہے پس جب کوئی اسے اپنے چہرے کے قریب کرے گا تو اس کے چہرے کی چمک اور رونق ختم ہو جائے گی (1)''۔ ابوعیسیٰ نے کہا ہے: اس حدیث کو ہم صرف رشدین بن سعد کی حدیث سے پہچانتے ہیں اور رشدین اپنی قوت حفظ کے اعتبار سے متکلم فیہ راوی ہے۔ اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قول باری تعالیٰ: وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ۝ (ابراہیم) (پلایا جائے گا اسے خون اور پیپ کا پانی وہ بمشکل ایک ایک گھونٹ بھرے گا۔) کے بارے میں روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اسے اس کے منہ کے قریب کیا جائے گا تو وہ اسے ناپسند کرے گا پس جب اسے اس کے قریب کیا جائے گا تو یہ اس کے چہرے کو بھون ڈالے گا اور اس کے سر کی کھال بالوں سمیت ادھڑ جائے گی اور جب وہ اسے پیئے گا تو یہ اس کی آنتوں کو کاٹ دے گا یہاں تک کہ اس کی دبر سے نکل جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ۝ (محمد) (اور انہیں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا اور وہ کاٹ دے گا ان کی آنتوں کو)۔ مزید فرماتا ہے: وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ؕ بِئْسَ الشَّرَابُ ؕ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ۝ فرمایا: یہ حدیث غریب ہے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ روایت ان اقوال کے صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہے، اور اس پر کہ یہی مراد ہے۔ واللہ اعلم۔ اسی طرح اہل لغت نے بھی اسے بیان کیا ہے۔ صحاح میں ہے المهل سے مراد پگھلا ہوا تانبہ ہے۔ ابن اعرابی نے کہا ہے: المهل سے مراد پگھلایا ہوا سیسہ ہے۔ اور ابوعمرو نے کہا ہے: المهل سے مراد تیل کی تلچھٹ ہے۔ اور المهل سے مراد پیپ بھی ہے، اور حضرت ابوبکر کی حدیث میں ہے: تم مجھے میرے انہی دو کپڑوں میں دفن کرنا کیونکہ یہ دونوں مہل اور مٹی کے لئے ہیں۔ اور مُرْتَفَقًا حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے (3): اس کا معنی ہے مجتمعا (جمع کیا ہوا)، گویا آپ مرافقت کے معنی کی طرف گئے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: اس سے مراد منزل (ٹھکانا) ہے۔ حضرت عطا نے کہا ہے: اس کا معنی قرارگاہ ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس کا معنی مهادا (بچھونا) ہے۔ اور قتبی نے کہا ہے: مراد مجلس (بیٹھنے کی جگہ) ہے۔ اور یہ تمام معنی باہم متقارب ہیں، اور اس کی اصل المتكا (وہ شے جس سے ٹیک لگائی جائے) ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: ارتفقت

1۔ جامع ترمذی، ابواب صفة جهنم، ما جاء فی صفة شرب اهل النار، جلد 2، صفحہ 82

2۔ ایضاً۔ ایضاً، باب صفة شراب اهل النار، حدیث نمبر 2504، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 514

یعنی میں نے کہنی پر ٹیک لگائی۔

شاعر نے کہا ہے:

قالت له وارتفقت ألا فتى يسوق بالقوم غزالاتِ الضُحا

اور کہا جاتا ہے: بَارتفق الرجل جب آدمی اپنی کہنی پر سوئے اسے نیند نہیں آتی۔

ابوذؤیب ہذلی نے کہا ہے:

نام الخلىّ و بِتُّ الليل مُرتَفِقا كأن عيني فيها الصّاب مَذبُوحُ(1)

اور الصاب سے مراد کڑوے درخت کا نچوڑ اور جوس ہے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيۡعُ اَجۡرَ مَنۡ اَحۡسَنَ عَمَلًا ۚ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهِمُ الۡاَنۡهٰرُ يُحَلَّوۡنَ فِيۡهَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَهَبٍ وَّيَلۡبَسُوۡنَ ثِيَابًا خُضۡرًا مِّنۡ سُنۡدُسٍ وَّاِسۡتَبۡرَقٍ مُّتَّكِـِٕـيۡنَ فِيۡهَا عَلَى الۡاَرَآئِكِ ؕ نِعۡمَ الثَّوَابُ ؕ وَحَسُنَتۡ مُرۡتَفَقًا ۝

''بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے (تو ہمارا یہ دستور ہے کہ) ہم ضائع نہیں کرتے کسی کا اجر جو عمدہ اور (مفید) کام کرتا ہے۔ یہی وہ (خوش نصیب) ہیں جن کے لئے ہمیشگی کے جنت ہیں رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں، انہیں پہنائے جائیں گے ان جنتوں میں کنگن سونے کے اور پہنیں گے سبز رنگ کا لباس جو باریک ریشمی کپڑے اور موٹے ریشمی کپڑے کا بنا ہوا ہوگا تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے وہاں مرصع پلنگوں پر کتنا اچھا ہے یہ اجر، اور کتنی عمدہ ہے یہ آرام گاہ۔''

جب اللہ تعالیٰ نے اس ذلت ورسوائی کا ذکر کیا جو اس نے کافروں کے لئے تیار کر رکھی ہے تو پھر اس اجر وثواب کا بھی ذکر کیا جو اس نے مومنوں کے لئے تیار کیا ہے۔ اور اس کلام میں اضمار ہے؛ یعنی لا نضيع أجر من أحسن منهم عملا، فأما من أحسن عملا من غير المؤمنين فعمله محبط۔ (ہم اس کا اجر ضائع نہیں کرتے جو ان میں سے اچھا کام کرتا ہے اور رہا وہ جو مومنوں کے سوا کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اس کا عمل ضائع اور رائیگاں چلا جاتا ہے۔) اور عَمَلًا تمیز ہونے کی بنا پر منصوب ہے، اور اگر تو چاہے تو اس پر اَحسن کو واقع کر کے اسے نصب دے دے۔ اور کہا گیا ہے کہ اِنَّا لَا نُضِيۡعُ اَجۡرَ مَنۡ اَحۡسَنَ عَمَلًا کلام معترض ہے، اور خبر قول باری تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ ہے۔ اور جَنّٰتُ عَدۡنٍ جنت کے درمیان میں ہے اور باقی تمام جنات اس کے اردگرد ہیں۔ اور اس کی وسعت کے سبب اسے لفظ جمع کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ اس کا ہر حصہ اور ٹکڑا جنت ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: العدن کا معنی اقامت اختیار کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: عدن بالمكان

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 304

جب وہ اس جگہ اقامت اختیار کر لے۔ اور عَدَنَتِ البلد میں نے شہر کو وطن بنالیا۔ عَدَنَتِ الاِبِلُ بمکان کذا یعنی اونٹ نے اسے لازم پکڑ لیا پس وہ مسلسل وہاں رہا۔ اور اسی سے جَنّٰتُ عَدْنٍ یعنی جنات اقامۃ ہے۔ اور اسی سے معدن (دال کے کسرہ کے ساتھ) نام رکھا گیا ہے، کیونکہ لوگ اس میں موسم گرما اور موسم سرما میں مقیم ہوتے ہیں۔ اور ہر شے کا مرکز اس کا معدن ہوتا ہے۔ اور العادن وہ اونٹنی ہے جو چراگاہ میں مقیم ہو اور عدن شہر بھی ہے؛ یہ جوہری نے کہا ہے۔ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ کئی مقامات پر اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ اس میں اساوِر سِوار کی جمع ہے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ان میں سے ہر ایک تین کنگن پہنے ہوگا: ایک سونے کا ہوگا، ایک چاندی کا ہوگا، اور ایک موتیوں کا ہوگا (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے، یہاں فرمایا: مِنْ ذَهَبٍ سونے کا اور سورۃ الحج اور فاطر میں فرمایا: مِنْ فِضَّةٍ (چاندی کا) اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے، میں نے اپنے خلیل حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''مومن کا زیور وہاں تک پہنچے گا جہاں تک وضو (کا پانی) پہنچتا ہے (2)''۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

اور فراء نے بیان کیا ہے: یحلون یہ یا کے فتحہ، حا کے سکون، اور لام کے فتحہ خفیفہ کے ساتھ ہے۔ کہا جاتا ہے: حَلِیَت المرأۃ تَحْلیٰ فھی حالیۃ جب عورت زیور پہن لے۔ اور حَلِیَ الشیٔ بعینی یَحْلیٰ (چیز میری آنکھوں میں بھلی معلوم ہوئی)؛ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور السِّوار سے مراد عورت کے کنگن ہیں۔ اور اس کی جمع أسورۃ اور الجمع أساورۃ ہے۔ اور فَلَوْ لَاۤ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ (الزخرف: 53) بھی پڑھا گیا ہے اور کبھی جمع أساور آتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ یہ جوہری نے کہا ہے۔ اور عزیز نے کہا ہے: أساور أسورۃ کی جمع ہے، اور أسورۃ سِوار اور سُوار کی جمع ہے، اور یہ سونے کا وہ زیور ہے جو بازوؤں میں پہنا جاتا ہے، اور اگر یہ چاندی کا ہو تو پھر یہ قُلْب کہلاتا ہے اور اس کی جمع قِلَبَۃ ہے، اور اگر یہ سینگ یا ہاتھی دانت وغیرہ کا بنا ہوا ہو تو پھر یہ مَسَکَۃ کہلاتا ہے اور اس کی جمع مَسَک ہے۔ نحاس نے کہا ہے: اور قطرب نے الأساور کی واحد میں أسوار ذکر کیا ہے، اور قطرب شذوذ بیان کرنے والے ہیں، یعقوب وغیرہ نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ اور اسے ذکر نہیں کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق صحاح میں ہے اور ابو عمرو بن علاء نے کہا ہے: اس کی واحد إسوار ہے۔ اور مفسرین نے کہا ہے: جب بادشاہ دنیا میں کنگن اور تاج پہنتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اہل جنت کے لئے بنا دیا ہے۔ قولہ تعالیٰ: وَ یَلْبَسُوْنَ ثِیَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ، السندس سے مراد باریک اور کمزور ریشم ہے۔ اس کا واحد سندسۃ ہے؛ یہ کسائی نے کہا ہے۔ اور الاستبرق سے مراد موٹا ریشم ہے، یہ عکرمہ سے منقول ہے۔ اور یہ ریشم ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

تراهن يلبسن المشاعر مرّة واستبرقُ الديباج طورًا لباسُها (3)

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 565 2۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، فضل اسباغ الوضوء علی المکارہ، جلد 1، صفحہ 127

3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 305

پس استبرق سے مراد الدیباج (ریشم) ہے۔ ابن بحر نے کہا ہے: وہ جو سونے کی تاروں کے ساتھ بنا گیا ہے۔ اور قتبی نے کہا ہے: یہ لفظ فارسی سے معرب ہے۔ جوہری نے کہا ہے: اس کی تصغیر اُبَیْرِق ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ البریق سے باب استفعال ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ یہ دونوں لغتوں کے ساتھ موافقت رکھتا ہے، کیونکہ قرآن کریم میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو لغت عرب میں نہ ہو۔ جیسا کہ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور خاص طور پر سبز لباس کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ نگاہوں کے موافق ہوتا ہے، کیونکہ سفید نظر کو بکھیر دیتا ہے، متفرق کر دیتا ہے اور درد پہنچاتا ہے۔ اور سیاہ رنگ کی مذمت کی گئی ہے، اور سبز رنگ سفید اور سیاہ کے درمیان درمیان ہوتا ہے، اور یہ شعاعوں کو جذب کر لیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

نسائی نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: اس اثنا میں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھے جب کہ ایک آدمی آپ کے پاس آیا اور اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں جنت کے کپڑوں کے بارے میں بتایئے، کیا وہ مخلوق ہے جسے پیدا کیا جائے گا یا بنا ہوا ہے جسے بنا جائے گا؟ تو بعض لوگ ہنس پڑے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو فرمایا: ''تم اس جاہل سے کیوں ہنس رہے ہو جو عالم (جاننے والے) سے سوال کر رہا ہے؟'' پس آپ تھوڑی دیر بیٹھے رہے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جنت کے کپڑوں کے بارے سوال کرنے والا کہاں ہے؟'' تو اس نے عرض کی: یہ ہوں میں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، تو آپ نے فرمایا: ''نہیں بلکہ ان سے جنت کا پھل کٹ جائے گا''۔ آپ نے یہ تین بار فرمایا۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مومن کا گھر ایک موتی ہوگا جو درمیان سے خالی ہوگا اس کے درمیان ایک درخت ہے جو حلے اگاتا ہے اور آدمی ایک انگلی کے ساتھ یا فرمایا اپنی دو انگلیوں کے ساتھ ستر حلے پکڑ سکے گا درآنحالیکہ وہ موتیوں اور مرجان کے ساتھ آراستہ ہوں گے، یہ یحییٰ بن سلام نے اپنی تفسیر میں اور ابن مبارک نے اپنی رقائق میں ذکر کیا ہے۔ اور ہم نے اس کی اسناد کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کی ہے۔ اور حدیث میں مذکور ہے کہ ان میں سے ہر پر ایک حلہ ہوگا اس کے دو منہ ہوں گے ہر منہ کا ایک رنگ ہوگا، وہ دونوں آواز کے ساتھ گفتگو کریں گے جسے سننے والا انتہائی مستحسن قرار دیگا، دونوں چہروں میں سے ایک دوسرے کو کہے گا: میں اللہ تعالیٰ کے ولی پر تجھ سے زیادہ مکرم و معزز ہوں، میں اس کے جسم کے ساتھ ملا ہوا ہوں اور تو اس کے ساتھ ملا ہوا نہیں ہے۔ اور دوسرا کہتا ہے: میں اللہ تعالیٰ کے ولی پر تجھ سے زیادہ مکرم و معزز ہوں، میں اس کا چہرہ دیکھ رہا ہوں اور تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ قولہ تعالیٰ: مُّتَّكِـِٕیْنَ فِیْهَا عَلَى الْاَرَآىِٕكِ، الأرآئك، أريكة کی جمع ہے۔ اور ان سے مراد وہ پلنگ ہیں جو حجلہ عروسی میں ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد وہ قالینیں ہیں جو حجلہ عروسی میں بچھی ہوتی ہیں، یہ زجاج نے کہا ہے (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: یہ سونے کا پلنگ ہے، اور اسے حجلہ عروسی میں یاقوت اور موتیوں کے ساتھ مرصع اور آراستہ کیا جاتا ہے، الأريكة (ایک پلنگ) اتنا ہوگا جتنا صنعاء سے ایلہ تک کا سفر ہے اور جتنی عدن سے لے کر جابیہ تک کی مسافت ہے۔ اور متکئین کی اصل مُوتَكِئِين ہے، اور اسی طرح اتکا اصل میں اوتکا ہے، اور

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 305

التُّكَاةُ کی اصل وُكَاةٌ ہے، اور اسی سے التوکا کسی شے پر سہارا اور ٹیک لگانا، پس واؤ کو تا سے بدلا گیا اور پھر ادغام کر دیا گیا۔
اور رجل وُكَاةٌ بہت زیادہ ٹیک لگانے والا آدمی نِعْمَ الثَّوَابُ ؕ وَ حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا یعنی جنات کتنا اچھا اجر اور کتنی اچھی آرامگاہ
ہے، اور یہ وَ حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا کا عکس ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

اور اگر یہ نِعْمَتْ ہوتا تو بھی جائز ہوتا کیونکہ یہ جنت کا نام ہے۔ اور اسی بنا پر وَ حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ہے۔ اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ایک اعرابی حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا ہوا، اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت میدان عرفات میں اپنی ناقہ عضباء پر کھڑے تھے تو اس نے عرض کی: بلاشبہ میں مسلمان آدمی ہوں سو آپ مجھے اس آیت کے بارے آگاہ فرمائیے اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ الآیہ (البقرہ: 227) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو ان سے دور نہیں ہے اور نہ وہ تجھ سے دور ہیں وہ یہ چاروں ہیں یعنی حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ عنہم ہیں پس تو اپنی قوم کو یہ بتا کہ یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔'' اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے (1)، اور نحاس نے اسے کتاب ''معانی القرآن'' میں مسند بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا: ہمیں ابو عبداللہ احمد بن علی بن سہل نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں محمد بن حمید نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں یحییٰ بن ضریس نے زہیر بن معاویہ سے انہوں نے ابو اسحاق سے اور انہوں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بیان کیا انہوں نے فرمایا: ایک اعرابی کھڑا ہوا، اور اسے مکمل ذکر کیا۔ اور سہیلی نے اسے ''کتاب الاعلام'' میں مسند بیان کیا ہے۔ اور ہم نے ان تمام کو بالا جازۃ روایت کیا ہے۔ والحمدللہ۔

وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّ جَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿۳۲﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَ لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿۳۳﴾ وَّ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾

''اور بیان فرمائیے ان کے لئے مثال دو آدمیوں کی ہم نے دیئے تھے ان دونوں میں سے ایک کو دو باغ انگوروں کے اور ہم نے باڑ بنا دی ان دونوں کے ارد گرد کھجور (کے درختوں) کی اور اگا دی ان دونوں کے درمیان کھیتی۔ یہ دونوں باغ اپنے اپنے پھل لائے اور نہ کم ہوئی ان سے کوئی چیز اور ہم نے جاری کر دیں ان کے درمیان نہریں۔ اور (باغوں کے علاوہ) اور بھی اس کے اموال تھے، تو (ایک روز) اس نے اپنے ساتھی سے بحث مباحثہ کے دوران کہا کہ میں دولت کے لحاظ سے بھی تم سے زیادہ ہوں اور نفری کے لحاظ سے بھی تم سے طاقتور ہوں۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ یہ مثال ہے اس آدمی کے لئے جو دنیا کے ساتھ عزت حاصل کرتا ہے اور مومنین کے ساتھ بیٹھنا ناپسند کرتا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ کے ساتھ متصل ہے۔ اور ان دونوں آدمیوں

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 304

کے نام اور ان کی تعیین میں اختلاف ہے، پس کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ اہل مکہ میں سے دو مخزومی بھائیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، ان میں سے ایک مومن تھا اور وہ حضرت ابو سلمہ عبداللہ بن عبدالاسد بن ہلال بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم تھے۔ ام سلمہ کے خاوند نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو قبول کر لیا تھا۔ اور دوسرا کافر تھا اور وہ اسود بن عبدالاسد تھا(1)، ان دونوں بھائیوں کا ذکر سورہ الصافات میں اس قول باری تعالیٰ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِیْنٌ ۝ (الصافات) کے تحت کیا گیا ہے، ان دونوں میں سے ہر ایک کو چار ہزار دینار وراثت میں ملے تھے، پس ان میں سے ایک نے اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دیا اور اس نے اپنے بھائی سے کسی شے کا مطالبہ کیا تو پھر اس نے کہا جو کہا : اسے ثعلبی اور قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل مکہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لانے والے تمام لوگوں اور کفر کرنے والے تمام لوگوں کی مثال ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ عیینہ بن حصن اور اس کے ساتھیوں کی حضرت سلمان رضی اللہ عنہ، حضرت صہیب رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ مثال کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بنی اسرائیل کے دو آدمیوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے وہ دونوں بھائی تھے ان میں سے ایک مومن تھا اور اس کا نام یہوذا تھا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق ہے۔ اور حضرت مقاتل نے کہا ہے: اس کا نام تملیخا تھا، اور دوسرا کافر تھا(2) اور اس کا نام قرطوش تھا۔ اور یہی وہ دونوں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الصافات میں بیان کیا ہے۔ اور اسی طرح محمد بن حسن مقری نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے: ان دونوں میں سے جو نیک اور اچھا تھا اس کا نام تملیخا، اور دوسرے کا نام قرطوش تھا، اور یہ دونوں شریک تھے پھر انہوں نے مال تقسیم کر لیا تو ہر ایک کے حصہ میں تین ہزار دینار آئے، پس ان میں سے مومن نے ایک ہزار کے غلام خریدے اور انہیں آزاد کر دیا، اور دوسرے ہزار کے عوض کپڑے خریدے اور ننگوں کو پہنا دیئے، اور تیسرے ہزار کے عوض طعام خریدا اور بھوکوں کو کھلا دیا، اور مساجد بھی بنائیں اور نیکی اور خیر کا عمل کیا۔ اور رہا دوسرا تو اس نے اپنے مال کے عوض خوشحال اور مالدار عورتوں سے نکاح کیا اور چوپائے اور گائیں وغیرہ خریدیں اور ان سے ان کے بچے حاصل کئے تو اس طرح ان میں اس کے لئے خوب اضافہ ہو گیا، اور باقی ماندہ مال کے ساتھ اس نے تجارت کی اور اس سے نفع حاصل کیا یہاں تک کہ مال و دولت میں اپنے ہمعصروں سے سبقت لے گیا۔ اور پہلے آدمی کو کوئی حاجت پیش آ گئی، تو اس نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے آپ کو کسی باغ میں خدمت کے لئے خدمت پر دے دے کہ وہ اس کی خدمت کرتا رہے گا۔ تو اس نے کہا: اگر میں اپنے شریک اور اپنے ساتھی کے پاس جاؤں اور اس سے پوچھوں کہ وہ مجھے اپنے کسی باغ میں خدمت کے لئے اجرت پر رکھ لے تو مجھے امید ہے کہ وہ میرے لئے زیادہ نفع بخش اور مفید ہو گا، چنانچہ وہ اس کے پاس آیا تو موٹے پردوں اور رکاوٹوں کی وجہ سے وہ اس تک نہ پہنچ سکا، لیکن جب وہ اس پر داخل ہوا اور اسے پہچانا اور اپنی حاجت اور ضرورت کا اس کے سامنے ذکر کیا تو اس نے اسے کہا: کیا میں نے تجھے مال نصف نصف کر کے دے نہیں دیا تھا، تو تو نے اپنے مال کے ساتھ کیا کیا؟ اس نے کہا: میں نے اس کے عوض اللہ تعالیٰ سے وہ کچھ خرید لیا ہے جو اس سے بہتر اور اچھا ہے اور باقی رہنے والا ہے۔ تو

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 566
2۔ ایضاً

اس نے کہا: کیا تو یقینی تصدیق کرنے والوں میں سے ہے، میں خیال نہیں کرتا کہ قیامت قائم ہونے والی ہے اور میں تجھے تو فقط احمق اور بے وقوف دیکھ رہا ہوں، اور میرے پاس تیری سفاہت اور بے وقوفی کی جزا سوائے محرومی اور پشیمانی کے اور کچھ نہیں، کیا تو دیکھتا نہیں جو کام میں نے اپنے مال کے ساتھ کیا یہاں تک کہ میں اس خوشحالی اور دولتمندی تک پہنچ گیا ہوں جو تو دیکھ رہا ہے، اور یہ اس لئے ہے کہ میں نے کمایا اور تو نے بے قوفی کی تو میرے پاس سے نکل جا۔ پھر اس غنا اور دولتمندی سے قصہ میں سے وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ذکر کیا ہے کہ اس کے پھل کا احاطہ کیا اور اسے بالکل تباہ کر دیا اس عذاب کے ساتھ جو آسمان سے اس پر بھیجا گیا۔ اور ثعلبی نے یہ قصہ دوسرے لفظوں میں ذکر کیا ہے، اور معنوی اعتبار سے یہ دونوں قریب قریب ہیں۔ حضرت عطا نے بیان کیا ہے: وہ دونوں شریک تھے اور ان کے آٹھ ہزار دینار تھے۔ اور کہا گیا ہے: وہ دونوں اپنے باپ کی طرف سے اس کے وارث بنے تھے اور وہ دونوں بھائی تھے اور انہوں نے اسے تقسیم کر لیا، تو ان میں سے ایک نے ایک ہزار کے بدلے زمین خرید لی، تو اس کے ساتھی نے کہا: اے اللہ! بے شک فلاں نے ایک ہزار دینار کے عوض زمین خریدی ہے اور میں تجھ سے ایک ہزار دینار کے عوض جنت میں زمین خریدتا ہوں پس اس نے وہ صدقہ کر دیئے، پھر اس کے ساتھی نے ایک ہزار دینار کے عوض گھر بنایا تو اس نے کہا: اے اللہ! بے شک فلاں نے ایک ہزار دینار کے عوض گھر بنایا ہے اور میں تجھ سے ایک ہزار دینار کے عوض جنت میں گھر خریدتا ہوں، پھر ایک ہزار دینار صدقہ کر دیئے، پھر اس نے ایک عورت کے ساتھ شادی کی اور اس پر ایک ہزار دینار خرچ کئے، تو اس نے کہا: اے اللہ! بے شک فلاں نے ایک ہزار دینار کے عوض ایک عورت سے شادی کی ہے اور میں تجھ سے ایک ہزار کے عوض جنت کی عورتوں کا رشتہ طلب کرتا ہوں، اور پھر ایک ہزار دینار صدقہ کر دیئے، پھر اس نے ایک ہزار دینار کے بدلے خدام اور ساز و سامان خریدا ہے، اور میں تجھ سے ایک ہزار دینار کے عوض جنت کا ساز و سامان اور خادم خریدتا ہوں، چنانچہ ایک ہزار دینار صدقہ کر دیئے۔ پھر اسے کوئی شدید حاجت پیش آ گئی تو اس نے کہا: شاید میرا ساتھی میرے ساتھ نیکی کرے گا۔ چنانچہ وہ اس کے پاس آیا تو اس نے کہا: تیرے مال کو کیا ہوا ہے؟ تو اس نے اسے سارے واقعہ کی خبر دی تو اس نے کہا: بلاشبہ تو تصدیق کرنے والوں میں سے ہے اس بت کے بارے، قسم بخدا! میں تجھے کوئی شے نہ دوں گا۔ پھر اس نے اسے کہا: تو آسمان والے خدا کی عبادت کرتا ہے، اور میں صرف بت کی پرستش کرتا ہوں، تو اس کے ساتھی نے کہا: قسم بخدا! میں یقیناً اسے نصیحت کروں گا، پس اس نے وعظ و نصیحت کی، اور اسے یاد دلایا اور اسے خوفزدہ کیا۔ تو اس نے کہا: ہمارے ساتھ چل ہم مچھلی کا شکار کریں گے۔ پس جس نے زیادہ پکڑ لیں تو وہ حق پر ہوگا، تو اس نے اسے کہا: اے میرے بھائی! بے شک دنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت حقیر ہے اس سے کہ وہ اسے نیکی اور احسان کرنے والے کے لئے اجر و ثواب بنائے یا کافر کے لئے سزا۔ اس نے کہا: تو میں اس کے ساتھ نکلنے کو ناپسند کرتا ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ نے دونوں کو ابتلا میں ڈال دیا، پس کافر اپنا جال پھینکتا ہے اور ساتھ اپنے بت کا نام لیتا ہے۔ تو اس میں اچھی موٹی مچھلیاں آ جاتی ہیں، اور مومن اپنا جال پھینکتا ہے اور اس پر وہ اللہ تعالیٰ کا نام لیتا ہے تو اس کے لئے اس میں کوئی شے نہیں آتی، تو اس نے اس کو کہا: تو دیکھ رہا ہے! میں دنیا میں اپنے حصہ، مرتبہ اور افرادی قوت کے اعتبار سے تجھ سے زیادہ ہوں، اسی طرح

میں آخرت میں بھی تجھ سے افضل ہوں گا۔ اگر جو تو کہہ رہا ہے تیرے خیال کے مطابق وہ حق ہے، پس وہ فرشتہ جو ان دونوں کے ساتھ مقرر کیا گیا تھا اس نے شور مچایا، پس اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ اسے پکڑ لے اور اسے جنتوں کی طرف لے جائے اور اس میں اسے مومن کے مراتب اور گھر دکھائے پس جب اس نے دیکھا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے تیار کیا ہے تو اس نے کہا: تیری عزت کی قسم! اسے کوئی نقصان نہیں دے گا جو کچھ اس نے دنیا میں پالیا ہے اس کے بعد کہ اس کا انجام اور ٹھکانہ یہ ہے، اور اس نے اسے جہنم میں کافر کی منازل بھی دکھائیں تو اس نے کہا: تیری عزت کی قسم! اسے کوئی نفع نہیں دے گا جو کچھ دنیا میں اسے حاصل ہوا ہے اس کے بعد کہ اس کا ٹھکانہ یہ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مومن کو موت دے دی اور کافر کو اپنے عذاب کے ساتھ ہلاک کر دیا، پس جب مومن نے جنت میں اقامت اور ٹھکانا حاصل کر لیا اور وہ کچھ دیکھا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے تیار کیا تھا تو وہ اور اس کے ساتھی ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔ بس فرمایا: اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِیْنٌ ۙ یَّقُوْلُ اَىِٕنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِیْنَ ۝ الآیہ۔ (الصافات) (کہ میرا ایک جگری دوست ہوا کرتا تھا وہ (مجھے) کہا کرتا تھا کہ کیا تو (قیامت پر) ایمان لانے والوں سے ہے۔) تو ایک ندا دینے والے نے ندا دی: اے اہل جنت! کیا تم جھانک رہے ہو پس وہ جہنم کی طرف جھانکا اور اسے سواء الجحیم میں دیکھ لیا، پس یہ آیت نازل ہوئی: وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا الآیہ (اور بیان فرمایئے ان کے لئے مثال)

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں دو بھائیوں کا حال اس سورت میں بیان کیا، اور آخرت میں دو کا حال سورۃ الصافات میں اپنے اس قول میں بیان کیا: اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِیْنٌ ۙ یَّقُوْلُ اَىِٕنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِیْنَ ۝ ...... تا قولہ ...... لِمِثْلِ هٰذَا فَلْیَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ۝ (الصافات) ابن عطیہ نے کہا ہے(1): اور ابراہیم بن قاسم الکاتب نے اپنی کتاب فی عجائب البلاد میں ذکر کیا ہے کہ بحیرۂ تِنِّیس یہ دو باغ تھے، اور یہ دو بھائیوں کے تھے تو ان میں سے ایک نے اپنا حصہ دوسرے کو بیچ دیا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اسے خرچ کر دیا یہاں تک کہ دوسرے نے اسے عار دلائی، اور ان دونوں کے درمیان گفتگو چلتی رہی تو اللہ تعالیٰ نے ایک رات میں اسے غرق اور تباہ کر دیا، اور وہی اس آیت سے مراد لیا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے: بے شک یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے بیان فرمائی ہے، یہ کسی سابقہ حالت کی خبر نہیں ہے، اور اسے زجر و توبیخ اور ڈراوا بنایا ہے: اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے، لیکن سیاق آیت اس کے خلاف پر دلالت کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَّ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ یعنی ہم نے ان دونوں کو اطراف سے کھجور کے درختوں کے ساتھ گھیر دیا ہے اور الحِفاف کا معنی طرف اور جانب ہے، اور اس کی جمع اَحِفّۃ ہے؛ اور کہا جاتا ہے: حفَّ القوم بفلان یَحُفُّوْنَ حَفًّا، یعنی انہوں نے اسے گھیر لیا۔ اور اسی سے حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ (الزمر: 75) (حلقہ باندھے کھڑے ہوں گے عرش کے اردگرد) ہے۔ وَّ جَعَلْنَا بَیْنَهُمَا زَرْعًا یعنی ہم نے انگوروں کے اردگرد کھجور کے درخت اگا دیئے، اور انگوروں کے درمیان میں کھیتی اگا دی۔ كِلْتَا الْجَنَّتَیْنِ یعنی دونوں باغوں میں سے ہر ایک اٰتَتْ اُكُلَهَا مکمل پھل لایا، اسی لئے آتَتَا نہیں کہا۔ اور لفظ کِلْتَا اور کِلَا میں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 515

اختلاف ہے کیا یہ مفرد ہیں یا تثنیہ؟ پس اہل بصرہ نے کہا ہے: یہ مفرد ہیں، کیونکہ کِلا اور کِلتا دونوں تثنیہ کی تاکید کے لئے ہیں جیسا کہ جمع میں تاکید کے لئے کُلٌّ ہے اور یہ اسم مفرد ہے تثنیہ نہیں ہے، پس جب اس کے بعد اسم ظاہر ہو تو حالت رفعی، نصبی اور جری میں ایک ہی حالت پر رہتا ہے۔ تو کہتا ہے: رأیت کِلا الرجلین و جاء نی کِلا الرجلین اور مررتُ بِکلا الرجلین اور جب اس کے ساتھ ضمیر متصل ہو تو حالت نصبی اور جری میں الف کو یا سے بدل دیا جاتا ہے، جیسے تو کہتا ہے: رأیت کِلَیْھما اور مررت بِکلیھما، جیسے تو علیھما کہتا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: یہ اسم تثنیہ ہے، اور یہ کُلّ سے ماخوذ ہے پس لام کو مخفف کیا گیا اور الف تثنیہ کا اضافہ کر دیا گیا۔ اور اسی طرح کلتا مونث کے لئے آتا ہے، اور یہ دونوں استعمال نہیں ہوتے مگر مضاف ہو کر اور واحد کے ساتھ کلام نہیں کی جاتی، اور اگر اس کے ساتھ کلام کی جائے تو کہا جائے گا: کِلٌ و کِلت اور کِلان و کِلتان۔

اور شاعر کے اس قول سے استدلال کیا گیا ہے:

فی کِلتِ رجلیھا سُلَامی واحدۃ کِلتاھما مَقْرونۃٌ بزائدۃ

اس میں شاعر نے اس کے دو پاؤں میں سے ایک کا ارادہ کیا ہے پس اسے مفرد ذکر کیا ہے۔ اور اہل بصرہ کے نزدیک یہ قول ضعیف ہے، کیونکہ اگر یہ تثنیہ ہوتا تو پھر یہ واجب تھا کہ اس کا الف حالت نصبی اور جری میں اسم ظاہر کے ساتھ یا ہو جاتا، اور اس لئے بھی کہ کِلا کا معنی کُلٌّ کے معنی کے خلاف ہے کیونکہ کُلٌّ احاطہ کے لئے آتا ہے اور کِلا مخصوص شے پر دلالت کرتا ہے، اور رہا یہ شاعر تو اس نے ضرورت شعری کے تحت الف کو حذف کر دیا ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ زائدہ ہے، اور جو چیز ضرورت کے تحت ہوتی ہے اس کو حجت بنانا جائز نہیں ہوتا، پس یہ ثابت ہو گیا کہ یہ اسم مفرد ہے جیسا کہ کِمعی مگر اسے وضع کیا گیا ہے کہ یہ تثنیہ پر دلالت کرے، جیسا کہ ان کا قول نَحْنُ اسم مفرد ہے لیکن دو اور اس سے زیادہ پر دلالت کرتا ہے۔

اس پر جریر کا قول دلالت کرتا ہے:

کِلَا یَوْمَیْ أمَامَۃَ یومُ صَدّ وإن لم نأتِھا إلّا لِمامًا

پس کِلا سے مفرد یوم کی خبر دی گئی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول: آتت کے ساتھ مفرد کی خبر دی ہے اور اگر تثنیہ ہوتا تو کہتا آتتا، ویوما اور کِلْتَا کے الف کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ پس سیبویہ نے کہا ہے: کِلْتَا کا الف تانیث کے لئے ہے اور تا فعل کے لام کلمہ کا بدل ہے اور وہ واو ہے اور یہ اصل میں کِلْوا ہے، بے شک واؤ کو تا سے بدل دیا گیا ہے کیونکہ تا میں تانیث کی علامت ہے، اور کِلتا میں الف مضمر کے ساتھ ملنے سے یا ہو جاتا ہے پس وہ تانیث کی علامت سے نکل جاتا ہے، پس واؤ کو تا سے بدلنے میں تانیث کے لئے تاکید ہو گئی، اور ابو عمر و الجرمی نے کہا ہے: اس میں تا ملحق ہے اور الف لام الفعل ہے، اور ان کے نزدیک اس کی تقدیر فِعْتَلٌ ہے، اگر معاملہ اس طرح ہو جیسے انہوں نے گمان کیا ہے تو پھر وہ اس کی نسبت میں کِلْتَوِیٌّ کہتے، اور جب انہوں نے کِلَوِیٌّ کہا اور تا کو ساقط کر دیا تو یہ اس پر دلیل ہے کہ انہوں نے اسے اس تا کے قائم مقام قرار دیا ہے جو اُخت میں ہے جب تو اس کی طرف نسبت کرتا ہے تو کہتا ہے أَخَوِیٌّ، اسے جوہری نے ذکر کیا ہے۔ ابو جعفر نحاس نے کہا ہے: اور نحویوں نے قرآن کے علاوہ میں معنی پر محمول کرتے ہوئے اس کی اجازت دی ہے کہ تو کہے: کلتا

الجنتین آتتا أکلھا، کیونکہ معنی مختار کلتا ھما آتتا ہے۔ اور فراء نے کلتا الجنتین آتی أکلہ کہنا بھی جائز قرار دیا ہے، انہوں نے کہا ہے: کیونکہ اس کا معنی کل الجنتین (دو باغوں میں سے ہر ایک) ہے۔ اور کہا ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قرأت میں کل الجنتین آتی أکلہ ہے۔ (دو باغوں میں سے ہر ایک اپنا پھل لایا) اس بنا پر فراء کے نزدیک اس کا معنی ہے: کل شئ من الجنتین آتی أکلہ۔ (دو باغوں میں سے ہر شے اپنا پھل لائی) اور الاُکُل (ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ) سے مراد کھجور کے درخت اور دیگر درختوں کا پھل ہے۔ اور ہر وہ شے جو کھائی جاتی ہے وہی اُکل ہے، اور اسی معنی میں یہ قول باری تعالیٰ ہے: اُكُلُهَا دَآئِمٌ (جنت کے پھل دائمی ہیں) یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا یعنی اس سے کوئی چیز کم نہیں ہوئی۔

قولہ تعالیٰ: وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا یعنی ہم نے دونوں باغوں کے درمیان کو شق کیا اور نہر جاری کر دی وَّ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ابو جعفر، شیبہ، عاصم، یعقوب اور ابن ابی اسحاق نے ثَمَرٌ ثا اور میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ یہ ثمرۃ کی جمع ہے۔ جوہری نے کہا ہے: الثمرۃ، الثمر اور الثمرات کی واحد ہے، اور الثمر کی جمع ثمار ہے جیسا کہ جبل کی جمع جبال ہے۔ فراء نے کہا ہے: ثمار کی جمع ثُمُر ہے؛ جیسا کہ کتاب کی جمع کتب ہے، اور الثمر کی جمع اثمار ہے مثلاً عنق کی جمع اعناق ہے۔ اور الثمر سے مراد المال الثمر (نفع بخش مال) بھی ہے اس میں میم مخفف اور مثقل دونوں طرح ہے۔ اور ابو عمرو نے کان لہ ثُمْر ثا کو ضمہ اور میم کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے، اور اس کی تفسیر انواع المال (طرح طرح کا مال) کی ہے۔ اور باقیوں نے دونوں حرفوں کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: مراد سونا، چاندی اور دیگر اموال ہیں، سورۃ الانعام میں اس کا مفصل بیان گزر چکا ہے۔

اور نحاس نے ذکر کیا ہے: احمد بن شعیب نے ہمیں بیان کیا ہے انہوں نے کہا ہمیں عمران بن بکار نے خبر دی ہے انہوں نے کہا ہمیں ابراہیم بن علاء زبیری نے بیان کیا ہے انہوں نے کہا ہمیں شعیب بن اسحاق نے بیان کیا ہے انہوں نے کہا [ہمیں خبر دی ہے] ہارون نے انہوں نے کہا مجھے اَبان نے ثعلب سے انہوں نے اعمش سے بیان کیا ہے کہ حجاج نے کہا ہے: اگر تو کسی کو و کان لہ ثُمُر پڑھتے ہوئے سنے تو تو اس کی زبان کاٹ دے، تو میں نے اعمش کو کہا: کیا تو اسے پکڑ سکتا ہے؟ تو انہوں نے کہا: نہیں ولا نُعْمَةَ عَيْن (اور آنکھ جیسی کوئی نعمت نہیں ہے) اور وہ ثُمُر پڑھتے تھے اور اسے الثمر کی جمع بناتے تھے۔ نحاس نے کہا ہے: پس اس قول کی بنا پر تقدیر یہ ہے کہ یہ ثمرۃ کی جمع ثمار ہے، اور پھر ثمار کی جمع ثُمُر ہے، اور عربی میں یہی احسن ہے مگر پہلا قول زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ واللہ اعلم۔

کیونکہ قول باری تعالیٰ: كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ اس کا پھل ہے۔ قولہ تعالیٰ: فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗ یعنی وہ اس کے ساتھ کلام میں سوال و جواب کرنے لگا۔ (بحث و مباحثہ کرنے لگا) اور المحاورۃ بمعنی المجاوبۃ (ایک دوسرے کو جواب دینا) ہے اور التحاور بمعنی التجاوب (باہم گفتگو کرنا) ہے، اور کہا جاتا ہے: کلمتہ فما أحار إلی جوابا، وما رجع إلی حَوِيرا ولا حُوَيرۃ ولا مَحُورۃ ولا حوارًا؛ یعنی میں نے اس کے ساتھ کلام کی اور اس نے کوئی جواب نہ لوٹایا۔ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا، النفر سے مراد وہ جماعت ہے جو دس سے کم ہو۔ اور یہاں اس سے مراد

اتباع کرنے والے، خدام اور بچے ہیں، جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۙ۝ وَّمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝

''اور (ایک دن) وہ اپنے باغ میں گیا درآنحالیکہ وہ اپنی جان پر ظلم کرنے والا تھا، کہنے لگا میں نہیں خیال کرتا کہ (یہ سرسبز و شاداب) باغ کبھی برباد ہوگا۔ اور میں یہ خیال بھی نہیں کرتا کہ کبھی قیامت بھی برپا ہوگی۔ اور بفرض محال اگر مجھے لوٹایا گیا اپنے رب کی طرف تو یقیناً میں پاؤں گا اس (نزہت گاہ) سے بہتر پلٹنے کی جگہ۔''

قولہ تعالیٰ: وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ کہا گیا ہے: اس نے اپنے مومن بھائی کا ہاتھ پکڑا اور اسے باغ میں گھمانے لگا اور اسے وہ دکھانے لگا۔ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ درآنحالیکہ وہ اپنے کفر کے سبب اپنی جان پر ظلم کرنے والا تھا، اور یہ جملہ حال کے معنی میں ہے۔ اور جس نے اپنے آپ کو کفر کے سبب جہنم میں ڈال دیا تو وہ اپنے ساتھ ظلم کرنے والا ہی ہے۔ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا یعنی اس نے دار (باغ) کے فناء ہونے کا انکار کیا۔ وَّمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً یعنی میں خیال نہیں کرتا کہ کبھی حشر یعنی دوبارہ زندہ کیا جانا بھی ہوگا۔ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ یعنی اگر دوبارہ زندہ کیا گیا تو جس طرح اس نے مجھے دنیا میں یہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں تو وہ مجھے میری عزت افزائی کے لئے اس سے افضل اور بہتر نعمتیں عطا فرمائے گا؛ اور قول باری تعالیٰ: لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا کا یہی معنی ہے۔ اس نے یہ اس وقت کہا جب اس کے بھائی نے اسے حشر و نشر پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ اور مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور شام کے مصاحف میں منهما ہے۔ اور اہل بصرہ و کوفہ کے مصاحف میں منها واحد ہونے کی بنا پر ہے، لیکن تثنیہ اولیٰ اور بہتر ہے، کیونکہ ضمیر جنتین کے قریب تر ہے۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ۝ لٰكِنَّاۡ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ۝

''اس کے ساتھی نے اسے بحث مباحثہ کے درمیان کہا: کیا تو انکار کرتا ہے اس ذات کا جس نے تجھے پیدا فرمایا مٹی سے پھر نطفہ سے پھر بنا سنوار کر تجھے مرد بنایا۔ لیکن میں، (تو) وہ اللہ ہی میرا رب ہے اور میں شریک نہیں ٹھہراتا اپنے رب کے ساتھ کسی کو۔''

قولہ تعالیٰ: قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ یعنی اس کے ساتھی یہوذا یا تملیخا نے کہا: یہ اس کے نام میں اختلاف ہونے کی وجہ سے ہے۔ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا یعنی اس نے اسے نصیحت کی اور اس سے وضاحت کی کہ ان چیزوں میں سے جن کا اس نے اعتراف کیا ہوا ہے یہ وہ ہیں جن کا کوئی بھی انکار نہیں کرتا کہ یہ اعادہ کی نسبت عمدہ اور اعلیٰ ہیں۔ اور سَوّٰىكَ رَجُلًا یعنی اس نے تجھے معتدل قد و قامت والا، معتدل مخلوق، اور صحیح الاعضاء مرد بنایا ہے۔ لٰكِنَّاۡ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ اسی طرح اسے ابوعبدالرحمن سلمی اور ابوالعالیہ نے پڑھا ہے اور کسائی سے روایت کیا گیا ہے لكن هو الله معنی

لکن الامر ھو اللہ ربی (لیکن معاملہ یہ ہے وہ اللہ ہی میرا رب ہے۔) پس لکن کا اسم اس میں مضمر ہے۔ اور باقیوں نے لکنا الف کو ثابت رکھ کر پڑھا ہے۔ کسائی نے کہا ہے: اس میں تقدیم و تاخیر ہے، تقدیر عبارت ہے لکن اللہ ھو ربی أنا، (لیکن اللہ وہی میرا رب ہے) تو اس میں أنا سے کثرت استعمال اور تخفیف کے لئے ہمزہ حذف کر دیا گیا اور دونوں نونوں میں سے ایک کو دوسری میں ادغام کر دیا۔ اور أنا کے الف کو حالت وصل میں حذف کر دیا گیا اور حالت وقف میں ثابت رکھا گیا۔ اور نحاس نے کہا ہے: کسائی، فراء اور مازنی کا مذہب یہ ہے کہ یہ اصل میں لکن أنا ہے پس ہمزہ کی حرکت لکن کی نون کو دے دی گئی اور ہمزہ کو حذف کر دیا گیا اور نون کو نون میں ادغام کر دیا گیا پس وقف اس پر ہے لکنا اور یہ الف حرکت کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ اور ابو عبید نے کہا ہے: اصل میں لکن أنا ہے، پس الف کو حذف کر دیا گیا اور دونوں نونیں مل گئیں اس لئے اسے تشدید کے ساتھ پڑھا گیا۔

اور کسائی نے ہمیں یہ شعر بھی بیان کیا ہے:

لَهِنَّكِ من عَبْسِيَّة لَوَسِيْمَةٌ على هَنَوَاتٍ كاذب من يقولها

ارادہ یہ کیا: للہ إنك [لوسيمة]، پس للہ سے دو لاموں میں سے ایک کو ساقط کر دیا اور إنك سے الف کو حذف کر دیا۔

اور ایک دوسرے نے کہا ہے اور اس نے اسے اصل کے مطابق ذکر کیا ہے:

وترميننى بالطَّرْف اى أنت مذنب و تَقْلِيْنَنى لكنّ إيّاكِ لا أَقْلِي

ای لکن أنا۔ اور ابو حاتم نے کہا ہے اور انہوں نے عاصم سے روایت کیا ہے: لکنا ھو اللہ ربی اور گمان کیا ہے کہ یہ لحن (غلطی) ہے، یعنی درج کلام میں الف کو ثابت رکھنا۔

زجاج نے کہا ہے: درج کلام میں لکنا ھو اللہ ربی میں الف کو ثابت رکھنا جید اور عمدہ ہے، کیونکہ کبھی أنا سے الف کو حذف کر دیا جاتا ہے پس وہ اسے بطور عوض لائے ہیں۔ فرمایا: اور حضرت ابی کی قرأت میں لکن أنا ھو اللہ ربی ہے۔ اور ابن عامر اور مسیلی نے نافع اور رویس سے اور انہوں نے یعقوب سے لکنا حالت وقف اور حالت وصل دونوں میں اثبات الف کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور شاعر کا قول ہے:

أنا سيف العشيرة فاعرفونى حُمَيْدًا قد تَذَرَّيْتُ السِّناما

اور اعشی نے کہا ہے:

فكيف أنا و انتحال القوافى بعد المشيب كفى ذاك عارا

اور حالت وقف میں الف کو ثابت رکھنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ هُوَ اللّٰهُ رَبِّي، هُوَ ضمیر قصہ اور شان اور امر ہے، جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے: فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا (الانبیاء: 97) اور قول باری تعالیٰ ہے: قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ ۝ (الاخلاص) (ان میں ھی اور ھو ضمیر قصہ و شان ہیں) وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا اس کا مفہوم اس پر دلیل ہے کہ دوسرا

بھائی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتا تھا اور کسی اور کی عبادت کرتا تھا۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے اس سے یہ ارادہ کیا ہو کہ میں غنا اور فقر کو نہیں دیکھتا مگر اسی کی طرف سے، اور میں یہ جانتا ہوں کہ اگر وہ کسی دنیا دار کی دنیا کو سلب کرنا چاہے تو وہ اس پر قادر ہے اور وہی ہے جس نے مجھے فقر و افلاس دیا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ ارادہ کیا ہو کہ تیرے دوبارہ زندہ کیے جانے کے انکار کا انجام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر قدرت نہیں رکھتا، اور یہ رب سبحانہ وتعالیٰ کو عاجز قرار دیتا ہے، اور جس نے اللہ تعالیٰ کو عاجز قرار دیا تو اس نے اسے مخلوق کے مشابہ قرار دیا، تو یہی شرک کرنا ہے۔

وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ۝ فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ۝ اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ۝

''اور کیوں ایسا نہ ہوا کہ جب تو باغ میں داخل ہوا تو تو کہتا: ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ (وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر کسی میں کوئی طاقت نہیں) اگر تو نے مجھے دیکھا کہ میں کم ہوں تجھ سے مال اور اولاد میں، پس عجب نہیں کہ میرا رب مجھے عطا فرما دے کوئی بہتر چیز تیرے (اس) باغ سے اور اتارے اس باغ پر (کوئی) آسمانی عذاب۔ تو ہو جائے یہ (سرسبز) باغ ایک چٹیل میدان، یا یوں جذب ہو جائے اس کا پانی زمین کی گہرائی میں کہ پھر تو اس کو تلاش کے باوجود نہ پا سکے۔''

قولہ تعالیٰ: وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ یعنی تو دل کے ساتھ (باغ میں داخل ہوتے وقت یہ الفاظ کہتا: مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ)، اور یہ مومن کی جانب سے کافر کو جھڑک بھی ہے اور نصیحت بھی اور اس کے اس قول کا رد بھی ہے کہ جب اس نے کہا: مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا (میں یہ خیال نہیں کرتا کہ یہ باغ کبھی برباد بھی ہوگا) اور ''ما'' محل رفع میں ہے۔ تقدیر کلام ہے: ھذہ الجنۃ ہی ما شاء اللہ (یہ باغ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ چاہے) اور زجاج اور فراء نے کہا ہے: الأمر ما شاء اللہ، یا ھو ما شاء اللہ، یعنی امر اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا جواب مضمر ہے، یعنی ما شاء اللہ کان، و ما لا یشاء لا یکون۔ (یعنی جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے اور وہ جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔) لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ یعنی تیرے پاس جو مال بھی جمع ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قوت سے ہے نہ کہ تیری قدرت اور تیری قوت سے، اور اگر وہ چاہے تو اس سے برکت کھینچ لے تو پھر یہ جمع نہ ہو۔

مسئلہ نمبر 2۔ اشہب نے بیان کیا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ہر آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت یہ کہے اور ابن وہب نے کہا ہے: مجھے حفص بن میسرہ نے کہا ہے: میں نے وہب بن منبہ کے دروازہ پر یہ لکھا ہوا دیکھا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''کیا میں تیری ایک ایسے کلمہ پر راہنمائی نہ کروں جو جنت کے خزانوں میں سے ہے، ... یا فرمایا: جو جنت کے خزانوں میں سے ایک

خزانہ ہے۔" میں نے عرض کی: کیوں نہیں ہاں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لاحول ولا قوۃ الا باللہ جب کوئی آدمی یہ کہے تو اللہ عزوجل فرماتا ہے میرے بندے نے اطاعت و فرمانبرداری اختیار کر لی ہے اور وہ تابعدار ہو گیا ہے(1)"۔ اسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ذکر کیا ہے۔ اور اس میں ہے کہ فرمایا: "اے ابا موسیٰ! یا اے عبداللہ بن قیس! کیا میں تیری راہنمائی ایسے کلمہ پر نہ کروں جو جنت کے خزانوں میں سے ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ وہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔" میں نے عرض کی: وہ کیا ہے یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم؟ تو آپ نے فرمایا: لاحول ولا قوۃ الا باللہ(2)۔ اور آپ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: "کیا میں تیری راہنمائی ایسے کلمہ پر نہ کروں جو جنت کے خزانوں میں سے ہے یا جنت کے خزانوں میں سے ایک ہے" میں نے عرض کی: کیوں نہیں (ضرور بتایئے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم(3) اور روایت ہے کہ جو کوئی اپنے گھر میں داخل ہوا یا اس سے باہر نکلا اور اس نے یہ کہا: بسم اللہ ما شاء اللہ لا قوۃ الا باللہ تو شیاطین اس سے اس کے سامنے سے بھاگ جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس پر برکتیں نازل فرماتا ہے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا: جب آدمی اپنے گھر سے باہر نکلے تو کہے بسم اللہ تو فرشتہ کہتا ہے تیری راہنمائی کر دی گئی، اور جب کہے ما شاء اللہ، تو فرشتہ کہتا ہے تجھے بے نیاز کر دیا گیا، اور وہ کہے: لا قوۃ الا باللہ تو فرشتہ کہتا ہے: تو بچا لیا گیا، اسے ترمذی نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے کہا جب وہ اپنے گھر سے باہر نکلا۔ بسم اللہ توکلت علی اللہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ تو اسے کہا جاتا ہے: تجھے بے نیاز کر دیا گیا اور تجھے بچا لیا گیا اور اس سے شیطان دور ہو جاتا ہے(4)"۔ یہ حدیث غریب ہے میں اسے اس سند کے سوا نہیں جانتا۔ اسے ابوداؤد نے بھی ذکر کیا ہے اور اس میں یہ اضافہ کیا ہے پس اس کے لئے فرمایا: "تیری راہنمائی کر دی گئی، تجھے بے نیاز کر دیا گیا اور تجھے بچا لیا گیا(5)"۔ اور ابن ماجہ نے اسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب آدمی اپنے گھر کے دروازے سے یا اپنے دار (حویلی) کے دروازے سے باہر نکلتا ہے تو اس کے ساتھ دو فرشتے ہوتے ہیں جو اس کے ساتھ مقرر ہیں پس جب وہ کہے باسم اللہ تو وہ دونوں کہتے ہیں تیری راہنمائی کر دی گئی اور جب وہ کہے: لاحول ولا قوۃ الا باللہ تو وہ کہتے ہیں تجھے بچا لیا گیا اور جب وہ کہے: توکلت علی اللہ تو وہ کہتے ہیں تجھے بے نیاز کر دیا گیا فرمایا پس اس کے دو ساتھی اس سے ملاقات کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں: تم اس آدمی سے کیا ارادہ رکھتے ہو حالانکہ اسے ہدایت دے دی گئی ہے اور اسے بچا لیا گیا ہے اور اس کو بے نیاز کر دیا گیا ہے(6)"۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب لاحول ولا قوۃ، جلد 2، صفحہ 949

2۔ صحیح مسلم، کتاب الدعوات، استحباب خفض الصوت، جلد 2، صفحہ 346 — 3۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، لاحول ولا قوۃ، جلد 2، صفحہ 949

4۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، مایقول اذا خرج من بیته، جلد 2، صفحہ 180

5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، مایقول اذا دخل فی بیته، جلد 2، صفحہ 339

6۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، مایدعو الرجل اذا خرج من بیته، صفحہ 285

اور حاکم ابوعبداللہ نے علوم الحدیث میں کہا ہے، محمد بن اسحاق بن خزیمہ سے حضور نبی مکرم ﷺ کے اس ارشاد کے بارے پوچھا گیا: ''جنت اور دوزخ نے باہم جھگڑا کیا تو اس یعنی جنت نے کہا مجھ میں ضعفاء داخل ہوں گے(1)'' تو یہ ضعیف کون ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: وہ ہے جو اپنے آپ کو دن میں بیس مرتبہ یا پچیس مرتبہ لاحول ولا قوۃ کے ساتھ بری کرتا ہے۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''جو کسی شے کو دیکھے اور وہ اسے بھی اور خوبصورت لگے تو وہ کہے مَاشَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ تو اسے نظر نقصان نہیں پہنچائے گی۔'' اور ایک قوم نے کہا ہے: کوئی نہیں ہے جس نے ماشاء اللہ کہا تو پھر کوئی شے بھی اسے پہنچی مگر وہ اس کے ساتھ راضی ہوگا۔

اور روایت ہے کہ جس نے چار (قول) کہے وہ چار سے محفوظ رہے گا: جس نے یہ کہا وہ نظر بد سے محفوظ ہو گیا۔ اور جس نے کہا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ (آل عمران) وہ شیطان کے مکر سے محفوظ ہو گیا، اور جس نے کہا وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْۤ اِلَى اللّٰهِ (غافر: 44) وہ لوگوں کے مکر سے محفوظ رہے گا۔ اور جس نے کہا: لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۗ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الانبیاء) تو وہ غم سے محفوظ رہے گا۔

قولہ تعالیٰ: اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا، اِنْ شرطیہ ہے تَرَنِ اسی کے سبب مجزوم ہے اور جواب شرط فَعَسٰى رَبِّيْۤ ہے اور اَنَا بطور فاصل ہے اس کا اعراب میں کوئی محل نہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل نصب میں ہو اور نون اور یاء کی تاکید کے لئے ہو۔ اور عیسیٰ بن عمر نے: ان ترنِ انا اقلُّ منک رفع کے ساتھ پڑھا ہے؛ وہ اَنَا کو مبتدا بنا رہے ہیں اور اقلُّ اس کی خبر ہے اور پھر مکمل جملہ دوسرے مفعول کے محل میں ہے، اور مفعول اول نون اور یا ہیں، مگر یہ کہ یا کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ کسرہ اس پر دلالت کرتا ہے، اور اس کو ثابت رکھنا جید اور بلیغ ہے اور یہی اصل ہے کیونکہ یہ فی الحقیقت اسم ہے۔ اور فَعَسٰى بمعنی معن ہے۔ ای فلعل ربی۔ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ شاید میرا رب مجھے تیرے اس باغ سے کوئی بہتر چیز آخرت میں عطا فرما دے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دنیا میں (اس سے بہتر عطا فرما دے)۔ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا اور وہ تیرے باغ پر بھیج دے حُسْبَانًا آسمان سے عذاب، اس کا واحد حُسْبانۃ ہے؛ یہ اخفش، قتبی اور ابو عبیدہ نے کہا ہے۔ اور ابن اعرابی نے کہا ہے: الحسبانۃ کا معنی بادل ہے، اور الحسبانۃ کا معنی تکیہ ہے اور الحسبانۃ کا معنی صاعقۃ (بجلی کی کڑک) ہے۔ اور جوہری نے کہا ہے: الحُسبان (ضمہ کے ساتھ ہو) تو اس کا معنی عذاب ہے۔ اور ابو زیاد الکلابی نے کہا ہے: أصاب الأرض حسبان یعنی زمین پر ٹڈی غالب آ گئی۔ اور الحسبان کا معنی حساب بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ (رحمن) اور یہاں حسبان کی یہی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ زجاج نے کہا ہے: الحسبان، الحساب سے ہے، یعنی وہ اس پر حساب کا عذاب بھیج دے، اور یہ اس کا حساب ہے جو کچھ تیرے ہاتھوں نے کمایا (اعمال کئے)، پس یہ حذف مضاف کے باب سے ہے۔ اور الحسبان سے مراد چھوٹے تیر بھی ہیں جو ایک ہی بار میں پھینکے جاتے ہیں اور یہ اکاسرہ کے تیروں میں سے تھے۔

اور المرامی من السماء سے مراد عذاب ہے۔ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا یعنی ایسی سفید زمین ہو جائے جس میں نہ کوئی سبزہ

1۔ جامع ترمذی، کتاب صفة الجنة، ماجاء احتجاج الجنة، جلد 2، صفحہ 80

اگتا ہے اور نہ اس پر قدم ثابت رہتا ہے، اور یہ سب سے زیادہ نقصان دہ زمین ہو جائے اس کے بعد کہ یہ ایک باغ تھا اور نفع بخش زمین تھی؛ اور زَلَقًا، صعید کے وصف کی تاکید کے لئے ہے، یعنی اس کی چکناہٹ کی وجہ سے اس سے پاؤں پھسلتے ہوں۔ کہا جاتا ہے: مکان زَلَق یعنی پھسلنی جگہ، اور یہ اصل میں مصدر ہے تیرے اس قول کا زلقت رجله تزلق زلقا، وازلقها غیرہ (کسی غیر نے اسے پھسلا دیا) اور الزلق کا معنی عجز الدابة (جانور کا پچھلا حصہ) بھی ہے۔ رؤبہ نے کہا ہے:

كأنها حقباءُ بلقاء الزَّلَق

اور المَزْلَقة و المُزْلَقة: مراد وہ جگہ ہے جس پر پاؤں ثابت نہ رہتے ہوں (یعنی نہ جمتے ہوں بلکہ پھسل جاتے ہوں) اور اسی طرح الزَّلَاقة بھی ہے۔ اور الزَّلَق کا معنی الحَلْق (مونڈنا) ہے، زَلَق رأسه يَزْلِقُهُ زلقا اس نے اس کا سر مونڈ دیا؛ یہ جوہری نے کہا ہے۔ اور الزَّلَق کا معنی المحلوق (مونڈا ہوا) ہے، جیسا کہ النَّقْض اور النَّقَض ہے۔ اور مراد یہ نہیں ہے کہ مونڈی ہوئی ہو جائے گی، بلکہ مراد یہ ہے کہ اس میں کوئی سبزہ باقی نہیں رہے گا جیسا کہ سر جب اسے مونڈ دیا جائے تو اس پر کوئی بال باقی نہیں رہتا؛ یہ قشیری نے کہا ہے: اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا یعنی یہ غائرًا ذاهبًا کے معنی میں ہے۔ یا اس کا پانی بہت نیچے چلا جائے، تو یہ پانی نہ دینے والی زمین ہو جائے گی اس کے بعد کہ یہ پانی دینے والی زمین تھی۔ اور الغور مصدر ہے اسے اسم کی جگہ رکھا گیا ہے جیسے کہا جاتا ہے: رجل صَوْمٌ و فطرٌ و عدلٌ و رِضا و فضلٌ و زَوْرٌ و نساءٌ نَوْحٌ (یہ تمام مصدر اسم کی جگہ مذکور ہیں) اس میں مذکر و مونث اور تثنیہ و جمع سب برابر ہوتے ہیں۔

عمرو بن کلثوم نے کہا ہے:

تظلّ جيادُه نَوْحًا عليه   مقلَّدة أعنتها صُفونا(1)

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

هرِيقي من دموعهما سجاما   ضُباع و جاوبي نوحا قياما

یعنی اس میں نوحا بمعنی نائحات ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: أو يصبح ماؤها ذا غور (اس کا پانی نیچے اترنے والا ہو جائے) پس اس سے مضاف محذوف ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور کسائی نے کہا ہے: ماءٌ غَوْرٌ۔ وقد غار الماء يغور غورا و غُؤورا، یعنی پانی زمین میں نیچے چلا گیا، اور واؤ کے مضموم ہونے کی وجہ سے ہمزہ بھی جائز ہے۔ اور غارت عينه تَغُور غَوْرًا و غُؤورًا، یعنی اس کی آنکھیں سر میں دھنس گئیں۔ اور غارت تغار بھی اس میں لغت ہے۔ اور کسی شاعر کا قول ہے:

أغارت عينُه ام لم تَغَارَا

(اس کی آنکھ دھنسے یا نہ دھنسے) اور غارت الشمس تغور غيارا، یعنی سورج غروب ہو گیا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 518

ابو ذویب نے کہا ہے:

هل الدهر إلّا ليلة و نهارُها وإلّاطلوعُ الشمس ثم غيارها

فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا یعنی تو ہرگز نیچے اترے ہوئے پانی کو واپس لانے کی استطاعت نہیں رکھے گا اور کسی حیلہ کے ساتھ اس پر قادر نہیں ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: پس تو ہرگز اس کے بدلے کسی اور کی طلب کی استطاعت نہیں رکھے گا۔ اور اس بات پر اس کے بھائی کا مناظرہ اور اس کا ڈرانا ختم ہوگیا۔

وَ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَاۤ اَنْفَقَ فِيْهَا وَ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ۝

''اور اس کے (باغ) کا پھل برباد ہوگیا پس وہ کف افسوس ملنے لگا اس مال کے نقصان پر جو اس نے باغ پر خرچ کیا تھا اور (اب) وہ گر پڑا تھا اپنے چھپروں پر اور (بصد حسرت) کہنے لگا کاش! میں نے کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بنایا ہوتا''

قولہ تعالیٰ: وَ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ اس میں اسم مالم یسم فاعلہ مضمر ہے، اور وہ مصدر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس میں اسم مجرور محل رفع میں ہو۔ اور اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ کا معنی ہے اس کا سارے کا سارا مال ہلاک کر دیا گیا۔ اور یہ وہ پہلی چیز ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کے بھائی کے ڈراوے کو ثابت کر دیا اور حقیقت بنا دیا۔ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ یعنی کافر ندامت کے سبب اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر مارنے لگا کیونکہ یہ فعل نادم سے صادر ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اپنی ملکیت الٹ پلٹ کرتا ہے اور جو کچھ اس نے خرچ کیا ہے اس کا عوض اور بدلہ اس میں نہیں دیکھتا، اور یہ اس اعتبار سے ہے کیونکہ ملک کو لفظ ید سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان کے قول میں سے ہے: فی یدہ مال، یعنی اس کی ملک میں مال ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا قول: فَاَصْبَحَ اس پر دلیل ہے کہ یہ ہلاک کرنے کا عمل رات کے وقت ہوا؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَطَافَ عَلَيْهَا طَآىِٕفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَ هُمْ نَآىِٕمُوْنَ ۝ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ۝ (القلم) (پس چکر لگا گیا اس باغ پر ایک چکر لگانے والا آپ کے رب کی طرف سے درآنحالیکہ وہ سوئے ہوئے تھے چنانچہ (لہلہاتا) باغ کٹے ہوئے کھیت کی مانند ہوگیا۔) اور کہا جاتا ہے: اَنفقتُ فی هذه الدار كذا و اَنفقتُ عَلَيْهَا (میں نے اس گھر میں اتنا خرچ کیا اور میں نے اس پر اتنا خرچ کیا) وَ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا یعنی وہ خالی ہے تحقیق وہ بعض بعض پر گر گیا ہے) یہ خَوَتِ النجوم تخوى خيًّا اَمْحَلَتْ سے ماخوذ ہے اور یہ تب ہوتا ہے جب وہ گر جائے اور کسی بھی سبزے پر بارش نہ برسائے۔ اور اَخْوَتْ بھی اسی کی مثل ہے۔ اور خَوَتِ الدار خواء اَقْوَت (گھر گر گیا اور اپنے مکینوں سے خالی ہوگیا)، اور اسی طرح ہے جب وہ گر جائے) اور اسی سے قول باری تعالیٰ ہے: فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا (النمل: 52) (پس یہ ان کے گھر ہیں جو اجڑے پڑے ہیں ان کے ظلم کے باعث)۔ اور کہا جاتا ہے: ساقطة (گرنے والا)، جیسا کہ کہا جاتا ہے: فهي خاوية على عروشها یعنی وہ اپنی چھت پر گرنے والا ہے، پس اسے پھل اور اصل کی تباہی اور بربادی کے درمیان جمع کیا گیا ہے، اور یہ بہت شدید اور بڑی آفتوں میں سے ہے، درآنحالیکہ یہ اس کے ظلم اور

: فرمانی کے مقابلہ میں ہے۔ وَ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا یعنی اے کاش! میں نے ان نعمتوں کو پہچانا ہوتا جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فرمائی ہیں، اور میں نے یہ پہچانا ہوتا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہیں اور میں اس کے ساتھ کفر نہ کرتا۔ اور یہ اس کی طرف سے اس وقت ندامت کا اظہار ہے جس وقت ندامت اسے کوئی فائدہ نہ پہنچا سکتی تھی۔

وَ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ مَا كَانَ مُنْتَصِرًا ۝

''اور نہ رہی تھی اس کے پاس کوئی جماعت جو اس کی مدد کرتی اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اور نہ وہ بدلہ لینے کے قابل تھا۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ، فِئَةٌ یہ تَكُنْ کا اسم ہے اور لَّهٗ اس کی خبر ہے۔ يَّنْصُرُوْنَهٗ یہ صفت کے محل میں ہے، ای فئة ناصرة (مدد کرنے والی جماعت)۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ يَّنْصُرُوْنَهٗ خبر ہو۔ اور پہلی وجہ سیبویہ کے نزدیک اولی اور بہتر ہے کیونکہ لَّهٗ مقدم ہے۔ اور ابو العباس ان کی مخالفت کرتے ہیں، اور اللہ عزوجل کے اس ~~ارشاد سے استدلال کرتے ہیں: وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (الاخلاص) اور سیبویہ نے دوسری وجہ کو بھی جائز قرار دیا ہے۔~~ اور يَّنْصُرُوْنَهٗ، فِئَةٌ کے معنی کی وجہ سے (جمع کا صیغہ) ہے، کیونکہ اس کا معنی اقوام ہے، اور اگر لفظ کی بنا پر ہوتا تو فرماتا ولم تكن له فئة تنصره؛ یعنی ایسا گروہ اور ایسی جماعت جس کے پاس وہ پناہ لے سکتا ہو (وہ نہیں رہی) وَ مَا كَانَ مُنْتَصِرًا یعنی اور نہ وہ روکنے والا تھا؛ یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اور نہ وہ اس کا بدل لوٹانے والا ہے جو اس سے ضائع ہو گیا ہے (جو اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے) اور الفئة کا مادہ اشتقاق سورہ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ اور اس میں ھا اس یا کے عوض ہے جو اس کے درمیان سے کم ہوئی، اس کی اصل فیئٌ ہے جیسا کہ فِيعٌ ہے کیونکہ یہ فا سے ہے، اور اس کی جمع فِئُون اور فئات آتی ہے، جیسے شِيات، لِدات اور مئات وغیرہ یعنی اس کے پاس کوئی ایسی جماعت نہیں جو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے اس کی حفاظت کر سکتی ہو، اور اس کے خدام اور اولاد میں سے وہ اس سے مفقود اور گم ہو گئے جن کے سبب وہ فخر کرتا تھا۔

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ عُقْبًا ۝

''یہاں سے ثابت ہو گیا کہ سارا اختیار اللہ سچے کے لئے ہے، وہی بہتر ثواب دینے والا ہے اور اس کے ہاتھ میں بہتر انجام ہے۔''

قولہ تعالیٰ: هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ اس میں قول باری تعالیٰ هُنَالِكَ ظرف ہے اور اس کے عامل میں اختلاف ہے، پس کہا گیا ہے: اس میں عامل: وَ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ ہے اور كان هنالك نہیں ہے؛ ای ما نصر ولا أنتصر هنالك یعنی جب اسے عذاب پہنچے گا تو نہ اس کی مدد کی جائے گی اور نہ وہ وہاں بدلہ لینے کے قابل ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: قول باری تعالیٰ: مُنْتَصِرًا ۝ پر کلام مکمل ہو گئی ہے اور هُنَالِكَ میں عامل الْوَلَايَةُ ہے، اور اس کی تقدیر تقدیم و تاخیر پر ہے: الولاية لله الحق هنالك، یعنی قیامت میں سارا اختیار اللہ سچے کے لئے ہے۔ ابو عمرو اور کسائی نے الْحَقُّ رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس لئے کہ یہ الْوَلَايَةُ کی صفت ہے۔ اہل مدینہ اور حمزہ نے الحقِّ کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اس لئے کہ یہ لفظ اللہ کی صفت ہے، اور تقدیر

کلام ہے: للہ ذی الحق (اس اللہ کے لئے جو صاحب حق ہے۔) زجاج نے کہا ہے: الحقَّ کو مصدر اور تاکید کی بنا پر نصب کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے: جیسا کہ آپ کہتے ہیں: ھذا لك حقًّا۔ اور اعمش، حمزہ، اور الکسائی نے لولایۃ کو واو کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور باقیوں نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہ دونوں ایک ہی معنی میں ہیں جیسا کہ رِضاعۃ اور رَضاعۃ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الولایۃ فتحہ کے ساتھ ہو تو یہ موالاۃ (محبت اور دوستی) سے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (البقرہ: 257) (اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا۔) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (محمد: 11) (یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا مددگار ہے۔) اور کسرہ کے ساتھ ہو تو پھر اس کا معنی سلطنت، قدرت اور امارت ہے، جیسے قول باری تعالیٰ ہے: وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (الانفطار) یعنی اس دن اللہ تعالیٰ کی ہی بادشاہی اور حکم ہوگا، یعنی اس کا امر کسی اور کی طرف نہیں لوٹایا جائے گا، ہر وقت میں بادشاہی اللہ تعالیٰ کی ہے لیکن قیامت کے دن سارے دعوے اور توہمات ختم ہو جائیں گے۔ اور ابوعبید نے کہا ہے: بلاشبہ یہ لفظ خالق کے لئے واو کے فتحہ کیساتھ ہے۔ اور واو کے کسرہ کے ساتھ مخلوق کے لئے ہے۔

هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا یعنی دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ ہی اسے بہترین اجر وثواب عطا فرمانے والا ہے جو اس کے ساتھ ایمان لایا، اور وہاں اس کے سوا کوئی نہیں ہوگا جس سے امید رکھی جا سکتی ہو، لیکن اس انداز میں جاہلوں کے ظن کا ارادہ کیا ہے، یعنی ھو خیر مَن یُرجیٰ (وہی سب سے بہتر ہے جس سے امید رکھی جا سکتی ہے۔ وَّخَيْرٌ عُقْبًا عاصم، اعمش، حمزہ اور یحییٰ نے عُقْبًا قاف کو ساکن پڑھا ہے، باقیوں نے اسے مضموم پڑھا ہے، اور دونوں صورتوں میں معنی ایک ہے، یعنی اس کے ہاتھ میں بہترین انجام ہے اس کے لئے جس نے اس سے امید رکھی اور اس کے ساتھ ایمان لایا۔ کہا جاتا ہے: عاقبۃ أمر فلان و عقباہ و عُقُبُہ، یعنی یہ فلاں کے معاملے کا انجام اور آخر ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ۝

"بیان فرمایئے ان سے دنیوی زندگی کی (ایک اور) مثال یہ پانی کی طرح ہے جسے ہم نے اتارا ہے آسمان سے پس گنجان ہو کر اگتی ہیں اس پانی سے زمین کی انگوریاں پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ خشک بوسیدہ گھاس ہو جاتی ہے اڑائے پھرتی ہیں اسے ہوائیں، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی آپ ان تکبر کرنے والوں کے لئے جو آپ سے فقراء مومنین کو اپنے آپ سے دور ہٹانے کی درخواست کرتے ہیں دنیوی زندگی کی ایک مثال بیان فرمایئے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے تشبیہ دی ہے۔ كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ کہ یہ پانی کی طرح ہے جسے ہم نے آسمان سے اتارا ہے یعنی پانی کے ساتھ۔ نَبَاتُ الْاَرْضِ یعنی اس پانی سے زمین کی انگوریاں گنجان ہو کر اگتی ہیں، یہاں تک کہ زمین ہموار ہو جاتی ہے، برابر ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک وہ انگوریاں بعض بعض کے ساتھ مل جاتی ہیں جس وقت اس پر پانی برستا ہے، کیونکہ نباتات گنجان ہو جاتی ہیں اور بارش کے سبب بڑھ جاتی ہیں، زیادہ ہو جاتی ہیں۔ یہ معنی سورۂ یونس میں واضح طور پر گزر چکا

ہے۔ اور حکماء نے کہا ہے: بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو پانی کے ساتھ تشبیہ دی ہے کیونکہ پانی ایک جگہ نہیں ٹھہرتا، اسی طرح دنیا بھی ایک کے پاس باقی نہیں رہتی، اور اسی لئے پانی ایک حالت پر قائم نہیں رہتا اسی طرح دنیا کی حالت بھی ہے، اور اس لئے بھی کہ یہ پانی باقی نہیں رہتا اور ختم ہو جاتا ہے اسی طرح دنیا بھی فناہ ہو جاتی ہے، اور اس لئے بھی کہ پانی کے بارے میں کوئی یہ قدرت نہیں رکھتا کہ وہ اس میں داخل ہو اور وہ اس سے تر نہ ہو اسی طرح دنیا بھی ہے کہ جو بھی اس میں داخل ہو وہ اس کے فتنہ و آزمائش اور اس کی آفت سے محفوظ نہیں رہ سکتا، اور اس لئے کہ پانی جب خاص مقدار میں ہو تو وہ نفع پہنچاتا ہے اور نباتات اگاتا ہے، اور جب اس حد سے تجاوز کر جائے تو وہ نقصان دہ اور مہلک ہوتا ہے، اسی طرح دنیا بھی ہے کہ اس کی کفایت بھر مقدار نفع بخش ہوتی ہے اور اس کی فالتو مقدار نقصان پہنچاتی ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں ہے کہ ایک آدمی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں چاہتا ہوں کہ میں کامیاب لوگوں میں سے ہو جاؤں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دنیا کو چھوڑ دے اور اسے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح قرار دے (اور اس سے تھوڑی سی مقدار لے لے) کیونکہ اس کی قلیل مقدار کافی ہوتی ہے اور اس کی کثیر مقدار سرکش بنا دیتی ہے۔'' اور صحیح مسلم میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے: ''تحقیق وہ کامیاب ہو گیا جس نے اسلام قبول کیا اور اسے کفایت بھر رزق دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اس پر قناعت عطا فرما دی جو اس نے اسے عطا فرمایا (1)''۔ **فَاَصْبَحَ** یعنی وہ انگوریاں ہو جاتی ہیں **هَشِيْمًا** خشک ٹوٹی ہوئی اور بکھری ہوئی گھاس، یعنی اس سے پانی کٹ جانے کے سبب، پس اسے اختصار کے لئے حذف کر دیا گیا کیونکہ کلام اس پر دلالت کر رہی ہے، اور الهشم کا معنی ہے خشک چیز کا توڑ دینا۔ اور الهشيم سے مراد خشک ٹوٹی ہوئی گھاس ہے، اور وہ بوسیدہ درخت جسے ایندھن اکٹھا کرنے والا جیسے چاہتا ہے اٹھا لیتا ہے۔ اور اس سے ان کا یہ قول بھی ہے: **ما فلانٌ إلا هشيمة كَرْمٍ**، جبکہ وہ خوب فیاض اور سخی ہو۔ اور رجلٌ **هشيم**: کمزور بدن والا آدمی۔ اور **تَهَشَّمَ عليه فلان** جب وہ اس پر مہربان ہو اور **اهتشم مافی ضرع الناقة** جب آدمی ناقہ کو دوہ لے۔ اور کہا جاتا ہے: **هَشَمَ الثَّرِيْدَ** اس نے ثرید تیار کیا اور اسی سے ہاشم بن عبد مناف کا نام رکھا گیا اور ان کا نام عمرو تھا۔

اور اسی بارے میں عبداللہ بن زبعری کہتا ہے:

عَمْرُو العُلَا هَشَمَ الثَّرِيْدَ لِقَومِه ۔۔۔ و رجالُ مَكَّةَ مُسْنِتُونَ عِجافُ

اور اس کا سبب یہ ہوا کہ قریش کو قحط نے آلیا اور اس نے ان کے اموال ہلاک و برباد کر دیئے پس ہاشم شام کی طرف گئے اور وہاں بہت سی روٹیوں کا حکم دیا پس وہ آپ کے لئے پکا دی گئیں، تو انہوں نے انہیں بوروں میں بند کر کے اونٹوں پر لاد دیا یہاں تک کہ آپ مکہ پہنچ گئے، اور آپ نے ان روٹیوں کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے بنا دیا اور ثرید بنایا، آپ نے انہی اونٹوں کو ذبح کیا، پھر پکانے والوں کو حکم دیا اور انہوں نے وہ گوشت پکایا، پھر ہانڈیوں کو بڑے بڑے پیالوں میں انڈیل دیا اور اہل مکہ کو خوب پیٹ بھر کر کھانا کھلایا، اور یہ اس قحط کے بعد جو ان پر مسلط ہوا پہلی بخشش اور عطا تھی، پس اسی وجہ سے آپ کا نام ہاشم پڑ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 337

گیا۔ تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ یعنی ہوائیں اسے اڑا لے جاتی ہیں، بکھیر دیتی ہیں؛ یہ ابو عبیدہ نے کہا ہے۔ ابن قتیبہ نے کہا ہے: وہ اسے اڑا لے جاتی ہیں۔ ابن کیسان نے کہا ہے: وہ اسے لے جاتی ہیں اور لے آتی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: وہ اسے پھراتی اور گھماتی ہیں؛ یہ تمام معانی ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ اور طلحہ بن مصرف نے تُذْرِيهِ الرِّيحُ پڑھا ہے۔ کسائی نے کہا ہے: حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قرأت میں تُذْرِيهِ یہ کہا جاتا ہے: ذَرَتْه الريح تَذْرُوْهُ ذَرْوًا اور تَذْرِيه ذَرْيًا اور أذرته تُذْرِيه إذْرَاءً، جب ہوا اسے اڑا لے جائے۔ اور فراء نے بیان کیا ہے: أذريت الرجل عن فرسه یعنی میں نے آدمی کو اس کے گھوڑے سے الٹ دیا۔

اور سیبویہ اور فراء نے یہ شعر بھی بیان کیا ہے:

فقلتُ له صَوِّبْ ولا تجهدَنَّهُ فَيُذْرِكَ من أُخْرَى القَطاةِ فَتَزْلَقِ

قولہ تعالیٰ: وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا۝ یعنی اللہ تعالیٰ پیدا کرنے، فناء کرنے اور پھر زندہ کرنے پر قدرت رکھتا ہے، اور اس کی ذات ہر کمزوری اور نقص سے پاک ہے۔

اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا۝

''مال اور فرزند (تو صرف) دنیوی زندگی کی زیب و زینت ہیں، اور (درحقیقت) باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں تیرے رب کے ہاں ثواب کے اعتبار سے اور بہتر ہیں جن سے امید وابستہ کی جاتی ہے۔''

قولہ تعالیٰ: اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اس میں زینتا بھی جائز ہے اور یہ تثنیہ اور مفرد (دونوں حالتوں) میں مبتدا کی خبر ہے۔ اور بلاشبہ مال اور فرزند دنیوی زندگی کی زینت ہیں، کیونکہ مال میں حسن و خوبصورتی اور منافع ہیں، اور بیٹوں میں قوت اور دفاع ہے، تو اس طرح یہ دونوں دنیوی زندگی کے لئے زیب و زینت ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ صفت کا قرینہ مال اور فرزندوں کے لئے ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے: المال و البنون زينة هذه الحياة المحتقرة فلا تتبعوها نفوسكم (یعنی مال اور فرزند اس حقیر زندگی کے لئے زیب و زینت ہیں پس تم اپنے آپ کو اس کا تابع نہ بناؤ۔) اور یہ عیینہ بن حصن اور اس جیسے دیگر لوگوں کا رد ہے جب انہوں نے دولت اور ظاہری شرف پر فخر کیا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ یہ جو دنیوی زندگی کے لئے زینت ہے تو یہ ایسا غرور (اور فخر) ہے جو گزر جائے گا، ختم ہو جائے گا اور باقی نہیں رہے گا، جیسا کہ خشک ٹوٹی ہوئی گھاس ہوتی ہے کہ ہوا اسے اڑا لے جاتی ہے، بلاشبہ جو شے باقی رہتی ہے وہ زاد قبر اور آخرت کی تیاری ہے۔ اور کہا جاتا ہے: مال کے ساتھ اپنا دل نہ لگا کیونکہ یہ ختم ہو جانے والے سائے (کی طرح) ہے، اور نہ عورتوں کے ساتھ دل لگا، کیونکہ یہ آج تیرے ساتھ ہیں اور کل کسی دوسرے کے ساتھ ہیں، اور نہ سلطان کے ساتھ کیونکہ وہ آج تیرا ہے اور کل کسی اور کا۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول کافی ہے: اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (الانفال: 28) (بیشک تمہارے مال اور تمہاری اولاد بڑی آزمائش ہیں۔) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ (التغابن: 14) (بے شک تمہاری

کچھ بیبیاں اور تمہارے بچے تمہارے دشمن ہیں، پس ہوشیار رہو ان سے۔)

قولہ تعالیٰ: وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ مراد طاعات کا وہ عمل ہے جو حضرت سلمان، حضرت صہیب اور دیگر مسلمان فقراء رضی اللہ عنہم کر رہے ہیں۔ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا تیرے رب کے ہاں ثواب کے اعتبار سے افضل ہے۔ وَّخَيْرٌ اَمَلًا یعنی از روئے امید کے صاحب مال اور فرزندوں سے افضل ہیں نہ کہ عمل صالح سے، اور دنیوی زیب و زینت میں خیر اور بھلائی نہیں ہے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے محل میں ہے: اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا (الفرقان: 24) (اہل جنت کا اس دن اچھا ٹھکانا ہو گا)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ فی الحقیقت اس سے بہتر ہیں جسے جاہل لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ ان کے گمان میں بہتر ہے۔

اور وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے؛ پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن جبیر، ابو میسرہ، اور عمرو بن شرحبیل نے کہا ہے: ان سے مراد پانچ نمازیں ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ آدمی کے قول و فعل میں سے ہر عمل صالح ہے جو آخرت کے لئے باقی رہے گا۔ اور یہ ابن زید نے بھی کہا ہے اور علامہ طبری نے اسے ترجیح دی ہے۔ اور یہی صحیح ہے ان شاء اللہ، کیونکہ ہر وہ عمل جس کا ثواب باقی رہے جائز ہے کہ اس کے لئے یہ کہا جائے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: کھیتی دو قسم کی ہے پس دنیا کی کھیتی مال اور فرزند ہیں اور آخرت کی کھیتی باقیات صالحات (باقی رہنے والی نیکیاں) ہیں، تحقیق اللہ تعالیٰ انہیں اقوام کے لئے جمع فرما دے گا۔ اور جمہور نے کہا ہے: ان سے مراد وہ کلمات ہیں (1) جن کی فضیلت حدیث طیبہ میں مروی ہے: سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللّٰہُ واللّٰہُ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللّٰہِ العلی العظیم۔ اسے امام مالک نے اپنی موطا میں عمارہ بن صیاد سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ان کو اَلْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ کے بارے میں یہ کہتے ہوئے سنا: بے شک ان سے مراد بندے کا یہ کہنا ہے: اللہ اکبر و سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللّٰہُ ولا حَوْلَ وَلَا قوۃ الا باللّٰہ، اسے نسائی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مسند بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ کی کثرت کرو' عرض کی گئی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیا ہیں۔ فرمایا: ''تکبیر کہنا، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنا، سبحان اللہ کہنا اور الحمد للہ اور لاحول ولا قوۃ اِلَّا باللّٰہِ اسے ابو محمد عبد الحق رحمہ اللہ تعالیٰ نے صحیح قرار دیا ہے۔

اور حضرت قتادہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ٹہنی پکڑی اور اسے جھنجھوڑا یہاں تک کہ اس کے پتے گر گئے اور فرمایا: ''بے شک جب مسلمان یہ کہتا ہے سبحان اللہ و الحمد للہ ولا الٰہ الا اللّٰہُ واللہ اکبر تو اس کے گناہ گر جاتے ہیں جیسا کہ یہ پتے گر گئے ہیں اے ابا الدرداء! انہیں اپنے پاس محفوظ کر لو۔ اس سے پہلے کہ تیرے اور ان کے درمیان کوئی حائل ہو، کیونکہ یہ جنت کے خزانوں اور عمدہ اور خالص کلام میں سے ہیں اور یہ اَلْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ (باقی رہنے والی نیکیاں) ہیں''۔ اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے، اور اسے ابن ماجہ نے اسی معنی میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے (2)، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تجھ پر سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ وَاللّٰہُ اکبر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 520 2۔ سنن ابن ماجہ، باب فضل التسبیح، صفحہ 279۔ ایضاً، حدیث نمبر 3802، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پڑھنا لازم ہے کیونکہ یہ گناہوں کو اس طرح گرا دیتے ہیں جس طرح درخت اپنے پتے گرا دیتا ہے۔ اور ترمذی نے اسے اعمش کی حدیث سے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خشک پتوں والے درخت کے پاس سے گزرے تو آپ نے اسے چھڑی ماری تو پتے گرنے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر آدمی کے گناہوں کو اس طرح گرا دیتے ہیں جیسے اس درخت کے پتے گر رہے ہیں (1)۔'' فرمایا: یہ حدیث غریب ہے، اور ہم اعمش کا سماع حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نہیں جانتے، مگر یہ کہ انہوں نے انہیں دیکھا ہے اور انہوں نے ان کی طرف دیکھا ہے۔ ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں شب معراج حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملا تو انہوں نے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو میری طرف سے سلام کہنا اور انہیں یہ خبر دینا کہ جنت کی مٹی بڑی پاکیزہ اور زرخیز ہے، پانی بڑا عمدہ اور میٹھا ہے اور یہ کہ وہ بڑی ہموار اور نرم ہے اور اس کے پودے اور درخت سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ہیں''۔ فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے (2)، اسے ماوردی نے اسی معنی میں بیان کیا ہے۔ اور اس میں ہے تو میں نے کہا: جنت کے درخت اور پودے کیا ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: لا حول ولا قوۃ الا باللہ (3)۔ ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرے اور وہ پودے لگا رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابا ہریرۃ! (رضی اللہ عنہ) تم کیا لگا رہے ہو؟'' تو میں نے کہا: پودے لگا رہا ہوں، فرمایا: کیا میں تمہاری راہنمائی ایسے پودوں پر نہ کروں جو ان سے بہتر ہیں، سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ہر ایک کے بدلے تیرے لئے جنت میں ایک درخت لگا دیا جاتا ہے۔'' تحقیق کہا گیا ہے: بے شک باقیات صالحات ہی نیتیں اور عزم و ارادے ہیں، کیونکہ انہی کے ساتھ اعمال قبول کئے جاتے ہیں اور بلند ہوتے ہیں؛ یہ حسن نے کہا ہے۔ اور عبید بن عمیر نے کہا ہے: کہ ان سے مراد بیٹیاں ہیں، آیت کا اول حصہ اس پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** پھر فرمایا: **وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ** یعنی صالح اور نیک بیٹیاں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے آباء کیلئے بہترین اجر و ثواب ہیں، اور بہتر ہیں آخرت میں جن سے امید وابستہ کی جاتی ہے اس آدمی کے لئے جس نے ان کے ساتھ احسان اور نیکی کی، اس پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جسے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے انہوں نے بیان فرمایا: میرے پاس ایک مسکین عورت آئی الحدیث، تحقیق ہم نے اسے سورۃ النحل میں قول باری تعالیٰ: **يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ** الآیہ (النحل: 59) میں بیان کیا ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''تحقیق میں نے اپنی امت سے ایک آدمی دیکھا اسے جہنم کی طرف لے جانے کا حکم دیا گیا تو اس کی بیٹیاں اس کے ساتھ چمٹ گئیں اور چیخ و پکار کرنے لگیں اور کہنے لگیں: اے ہمارے رب! بلاشبہ یہ دنیا میں ہمارے ساتھ احسان اور

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، فضل التسبیح، جلد 2، صفحہ 192۔ ایضاً، باب جامع الدعوات، حدیث نمبر 3456، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی فضل التسبیح، حدیث نمبر 3384، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، باب فضل التسبیح، جلد 2، صفحہ 279-278

نیکی کرتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے وسیلہ سے اس پر رحم فرمادیا"(1)۔ اور حضرت قتادہ نے قول باری تعالیٰ: فَاَرَدْنَاۤ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ۝ (کہف) (پس ہم نے چاہا کہ بدلہ دے انہیں ان کا رب (ایسا بیٹا) جو بہتر ہو اس سے پاکیزگی میں اور (ان پر) زیادہ مہربان ہو) کے تحت کہا ہے: ان کو اس کے بدلے بیٹی عطا فرمائی اور اس سے نبی علیہ السلام نے شادی کی اور اس نے بارہ بچوں کو جنم دیا اور وہ تمام انبیاء ہوئے۔

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ۝

"اور (غور کرو) جس روز ہم ہٹادیں گے پہاڑوں کو (ان کی جگہ سے) اور تم دیکھو گے زمین کو کھلا میدان ہے اور ہم جمع کریں گے انہیں پس نہیں پیچھے رہنے دیں گے ان میں سے کسی کو۔"

قولہ تعالیٰ: وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً بعض نحویوں نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے والباقیات الصالحات خیر عند ربك یوم نسیّر الجبال۔ نحاس نے کہا ہے: یہ واؤ کی وجہ سے غلط ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے: اور اس دن کو یاد کرو جب ہم پہاڑوں کو ہٹادیں گے، یعنی ہم انہیں سطح زمین سے اپنی جگہوں سے زائل کردیں گے، اور ہم انہیں چلائیں گے جیسا کہ ہم بادلوں کو چلاتے ہیں، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا: وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ (النمل: 88) (حالانکہ وہ چل رہے ہوں گے بادل کی سی چال) پھر وہ ٹوٹ جائیں گے اور زمین کی طرف لوٹ آئیں گے، جیسا کہ فرمایا: وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ۝ (الواقعہ) (اور ٹوٹ پھوٹ کر پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجائیں گے پھر غبار بن کر بکھر جائیں گے) ابن کثیر، حسن، ابو عمرو اور ابن عامر نے وَيَوْمَ تُسَيَّرُ تا کو ضمہ اور یا کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور الْجِبَالُ کو فعل مجہول کی بنا پر مرفوع پڑھا ہے۔ ابن محیصن اور مجاہد نے ویوم تَسیر الجبال تا کو فتحہ کے ساتھ مخفف پڑھا ہے اور یہ سَارَ سے ہے۔ اور الجبال مرفوع ہے۔ ابو عمرو کی قرأت کی دلیل وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝ (التکویر) ہے۔ اور ابن محیصن کی قرأت کی دلیل وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۝ (الطور) ہے۔ اور ابو عبید نے پہلی قرأت کو نسیر یعنی نون کے ساتھ کو اختیار کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّحَشَرْنٰهُمْ اور بَارِزَةً کا معنی ظاهرة ہے، (یعنی) اس پر پہاڑوں، درختوں اور عمارتوں میں سے ایسی کوئی شے نہ ہوگی جو اسے ڈھانپے ہوئے ہو، یعنی اس کے درخت جڑ سے اکھیڑ دیئے جائیں گے، اس کے پہاڑ بھی اکھیڑ دیئے جائیں گے، اور اس کی عمارتیں گرادی جائیں گی، پس یہی اس کا ظاہر ہونا اور کھلا میدان بننا ہے۔ اہل تفسیر نے یہی قول کہا ہے۔ اور کہا گیا ہے: وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً یعنی زمین میں جو مخفی خزانے اور مردے ہیں وہ سب ظاہر ہوجائیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۝ (الانشقاق) (اور باہر پھینک دے گی جو کچھ اس کے اندر ہے اور خالی ہوجائے گی۔) اور فرمایا: وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝ (الزلزال) (اور باہر پھینک دے گی زمین اپنے بوجھوں (یعنی دفینوں) کو) اور یہ قول حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ وَّحَشَرْنٰهُمْ اور ہم انہیں موقف کی طرف جمع کرکے لے جائیں

1۔ سنن ابن ماجہ، باب برالوالد والاحسان الی البنات، حدیث نمبر 3658، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گے۔ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا یعنی ہم ان میں سے کسی کو پیچھے نہیں چھوڑیں گے۔ کہا جاتا ہے: غادرتُ کذا یعنی میں نے اسے چھوڑ دیا۔

عنترہ نے کہا ہے:

غَادَرْتُه　مُتَعَفِّرًا　اَوصالُه　　والقومُ بین مُجَرَّحٍ و مُجَدَّلٍ

یعنی میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اور المغادرۃ کا معنی ترک کرنا اور چھوڑنا ہے، اور اسی سے الغدر ہے، کیونکہ اس کا معنی وفا کو ترک کرنا ہے۔ اور پانی کے تالاب کو غدیر کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ پانی اس میں جاتا ہے اور وہ اسے چھوڑ دیتا ہے۔ اور اسی سے غدائر المرأۃ (عورتوں کی گندھی ہوئی چوٹی) ہے کیونکہ وہ اسے پیچھے چھوڑ دیتی ہیں۔ وہ فرما رہا ہے: ہم ان کے نیکوں، فاجروں، جنوں اور انسانوں سبھی کو جمع کریں گے۔

وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ۭ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۢ ۡ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ۝

"اور وہ پیش کئے جائیں گے آپ کے رب کی بارگاہ میں صفیں باندھے ہوئے، (پھر ہم انہیں کہیں گے کہ) آج تم آ گئے ہو ہمارے پاس جیسے ہم نے پیدا کیا تھا تمہیں پہلی بار، ہاں تم تو یہ خیال کئے ہوئے تھے کہ ہم نہیں مقرر کریں گے تمہارے لئے وعدہ کا وقت۔"

قولہ تعالیٰ: وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا، صَفًّا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ مقاتل نے کہا ہے: وہ پیش کئے جائیں گے درآنحالیکہ وہ یکے بعد دیگرے صفیں باندھے ہوں گے جیسا کہ نماز میں صفیں باندھی جاتی ہیں، ہر امت اور ہر گروہ صف بنائے ہوئے ہو گا نہ کہ وہ سارے ایک صف میں ہوں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ تمام کے تمام (صف باندھے ہوئے) ہوں گے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا (طٰہٰ: 64) ای جمیعا (پھر آؤ پرے باندھے ہوئے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اور وہ پیش کئے جائیں گے آپ کے رب کی بارگاہ میں اس حال میں کہ وہ کھڑے ہوں گے۔ اور حافظ ابو القاسم عبد الرحمن بن مندہ نے کتاب التوحید میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن ایسی بلند آواز سے ندا دے گا جو کہ خوفناک ہوگی: اے میرے بندو! میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں میں ارحم الراحمین ہوں اور أحکم الحاکمین ہوں اور بہت تیزی سے حساب لینے والا ہوں۔ اے میرے بندو! تم پر آج کے دن کوئی خوف نہیں اور نہ تمہیں کوئی غم اور حزن ہوگا اپنی دلیل اور حجت پیش کرو اور سہولت اور آسانی کے ساتھ جواب دو کیونکہ تم سے بازپرس کی جائے گی اور محاسبہ کیا جائے گا۔ اے میرے ملائکہ! میرے بندوں کو حساب کے لئے ان کے پاؤں کے پوروں کی اطراف پر صفوں میں کھڑا کر دو۔"

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حدیث اس آیت کی تفسیر میں انتہائی واضح اور بین ہے، اور مفسرین میں سے اکثر نے اس کا ذکر نہیں کیا، تحقیق ہم نے اسے کتاب "التذکرہ" میں لکھا ہے، اور اسی سے ہم نے اسے نقل کیا ہے۔ والحمدللہ۔

لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ یعنی ان کو کہا جائے گا: آج تم ہمارے پاس ننگے پاؤں اور ننگے بدن آگئے ہو، نہ تمہارے پاس مال ہے اور نہ اولاد۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آج تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے آگئے ہو، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (اور بے شک آ گئے ہو تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے جیسے ہم نے پیدا کیا تھا تمہیں پہلی دفعہ) اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یعنی ہم تمہیں اسی طرح اٹھائیں گے جیسے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ بَلْ زَعَمْتُمْ یہ خطاب منکرین بعث کو ہے، یعنی تم دنیا میں یہ خیال کئے ہوئے تھے کہ تم ہرگز نہیں اٹھائے جاؤ گے اور یہ کہ ہم تمہارے لئے دوبارہ اٹھائے جانے کے وعدہ کا وقت مقرر نہیں کریں گے۔ اور صحیح مسلم میں ہے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ''قیامت کے دن لوگ ننگے پاؤں، ننگے بدن اور غیر مختون اٹھائے جائیں گے''۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا مرد اور عورتیں آپس میں ایک دوسرے کی طرف دیکھیں گے؟ آپ نے فرمایا: ''اے عائشہ! اس دن امر اس سے کہیں زیادہ شدید اور سخت ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھیں (1)''۔ غُرْلًا کا معنی ہے غیر مختون۔ اس کا بیان سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے۔

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝

''اور رکھ دیا جائے گا (ان کے سامنے) نامۂ عمل پس تو دیکھے گا مجرموں کو کہ وہ ڈر رہے ہوں گے اس سے جو اس میں ہے اور کہیں گے: صد حیف! اس نوشتہ کو کیا ہو گیا ہے کہ نہیں چھوڑا اس نے کسی چھوٹے گناہ کو اور نہ کسی بڑے گناہ کو مگر اس نے اس کا شمار کر لیا ہے۔ اور (اس دن) وہ پالیں گے جو عمل انہوں نے کئے تھے اپنے سامنے اور آپ کا رب تو (اے حبیب!) کسی پر زیادتی نہیں کرتا۔''

قولہ تعالیٰ: وَوُضِعَ الْكِتٰبُ، الْكِتٰبُ یہ اسم جنس ہے، اور اس میں دو وجہیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے مراد نامۂ اعمال ہیں جو بندوں کے ہاتھوں میں دیئے جائیں گے؛ یہ مقاتل نے کہا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے مراد حساب کو رکھنا ہے؛ یہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے، پس حساب کو کتاب سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ ان کے لکھے ہوئے اعمال پر ان کا محاسبہ کیا جائے گا۔ اور پہلا قول اظہر ہے؛ اسے ابن مبارک نے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: ہمیں حکم یا ابوالحکم نے خبر دی ہے...... یہ نعیم کو شک ہے اسماعیل بن عبدالرحمٰن سے انہوں نے بنی اسد کے ایک آدمی سے اس نے کہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت کعب کو کہا: تجھ پر افسوس ہے اے کعب! آخرت کی حدیث میں سے کوئی ہمیں بیان کیجئے، انہوں نے کہا: ہاں یا امیر المومنین! جب قیامت کا دن ہوگا لوح محفوظ کو بلند کیا جائے گا تو مخلوق میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا مگر وہ اپنے عمل کی طرف دیکھ لے گا بیان فرمایا پھر وہ صحائف لائے جائیں گے جن میں بندوں کے اعمال ہیں اور وہ عرش کے اردگرد بکھر جائیں گے، اور

1۔ صحیح مسلم، کتاب صفة الجنة، باب فناء الدنیا و بیان الحشر، جلد 2، صفحہ 384

اسی کے بارے یہ قول باری تعالیٰ ہے: وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا۔ اسدی نے کہا ہے: صغیرہ سے مراد وہ ہیں جو شرک سے کم ہیں، اور کبیرہ سے مراد شرک ہے، مگر اس نے ان سب کا شمار کرلیا ہے ... حضرت کعب نے بیان کیا: پھر مومن کو بلایا جائے گا اور اس کا نامۂ عمل اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور وہ اس میں دیکھے گا پس ان کی نیکیاں تو لوگوں کے لئے ظاہر ہوں گی اور وہ اپنے گناہ پڑھنے لگے گا تا کہ وہ یہ نہ کہے کہ میری اتنی نیکیاں تھیں اور وہ ذکر نہیں کی گئیں سو اللہ تعالیٰ نے یہ پسند فرمایا کہ وہ اسے اس کے سارے اعمال دکھادے یہاں تک کہ جب وہ اسے ناقص اور کم سمجھنے لگے گا جو کتاب میں ہوگا تو اس تمام کے آخر میں وہ پائے گا کہ اس کی مغفرت کردی گئی ہے، اسے بخش دیا گیا ہے اور یہ کہ تو اہل جنت میں سے ہے، پس اس وقت وہ اپنے ساتھیوں کے پاس آئے گا اور کہے گا: هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ۚ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ۝ (الحاقہ) (لو پڑھو میرا نامۂ عمل مجھے یقین تھا کہ میں اپنے حساب کو پہنچوں گا) پھر کافر کو بلایا جائے گا اور اس کا نامۂ عمل اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا پھر اسے لپیٹ دیا جائے گا اور اسے اس کی پشت کے پیچھے سے دیا جائے گا اور اس کی گردن کو موڑ دیا جائے گا، پس اسی کے بارے یہ قول باری تعالیٰ ہے: وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۝ (الانشقاق) (اور جس (بدنصیب) کو اس کا نامۂ عمل پس پشت دیا گیا۔) پس وہ اپنے نامۂ عمل میں دیکھنے لگے پس اس کی برائیاں اور گناہ تو لوگوں کے لئے ظاہر ہوں گے اور وہ اپنی نیکیوں میں دیکھے گا تا کہ وہ یہ نہ کہے کہ میں اسے گناہوں کا بدلہ دے رہا ہوں۔ حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ جب یہ آیت پڑھتے تو کہتے تھے: اے کاش! تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کبائر سے پہلے صغائر کے بارے چیخ و پکار کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: صغیرہ سے مراد تبسم کرنا ہے، اور کبیرہ سے مراد ہنسنا ہے، یعنی جب یہ اللہ عزوجل کی معصیت و نافرمانی کے عمل میں ہو؛ اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ اور ماوردی (1) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ صغیرہ سے مراد ضحک (ہنسنا) ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ وہ (ہنسنا) صغیرہ ہو جب وہ معصیت میں نہ ہو، کیونکہ معصیت کے سبب ہنسنا اس کے ساتھ رضا کا اظہار کرنا ہے اور معصیت کے ساتھ راضی ہونا بھی معصیت ہے، اور اسی بنا پر وہ کبیرہ ہو جاتا ہے، پس ان میں جمع اور تطبیق کی وجہ یہی ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔ یا پھر ضحک کو تبسم پر محمول کیا جائے گا اس روایت میں جسے ماوردی نے ذکر کیا ہے، تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا (النمل: 19) (تو سلیمان ہنستے ہوئے مسکرا دیئے اس کی اس بات سے) اور حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے: بے شک صغائر سے مراد چھوٹے گناہ کرنا اور گناہ کے قریب ہونا ہے مثلاً چھونا اور بوسہ لینا وغیرہ، اور کبیرہ سے مراد گناہ میں واقع ہونا اور بدکاری کا ارتکاب کرنا ہے۔ اس کا بیان سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: تم نے احصاء کی شکایت کی ہے، اور کسی نے ظلم کی شکایت نہیں کی، پس تم گناہوں کو حقیر سمجھنے سے بچو کیونکہ یہ اپنے کرنے والے پر جمع ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اسے ہلاک کردیتے ہیں۔ اس کا بیان بھی گزر چکا ہے۔ اور اَحْصٰهَا کا معنی ہے اس نے انہیں شمار کرلیا ہے اور ان کا احاطہ کرلیا ہے؛ اور وسعت کے طور پر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 49-48

احصاء کی نسبت کتاب کی طرف کی گئی ہے۔ وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا یعنی اس دن وہ تمام اعمال کو اپنے سامنے حاضر پا لیں گے جو انہوں نے کیے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ ان اعمال کی جزا کو اپنے سامنے پا لیں گے جو انہوں نے کیے وَ لَا یَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا یعنی اللہ تعالیٰ کسی کو کسی دوسرے کے جرم کے بدلے نہیں پکڑے گا، اور نہ اس کے بدلے کسی کو پکڑے گا جو عمل اس نے نہیں کیا؛ یہ ضحاک نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ کسی طاعت و فرمانبرداری کرنے والے کے ثواب میں کمی نہیں کرے گا اور نہ کسی گنہگار کی سزا میں اضافہ کرے گا۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّیَّتَهٗۤ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا ۝

"اور یاد کرو جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو پس سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ قوم جن سے تھا سو اس نے نافرمانی کی اپنے رب کے حکم کی۔ (اے اولاد آدم!) کیا تم بناتے ہو اسے اور اس کی ذریت کو اپنا دوست مجھے چھوڑ کر حالانکہ وہ سب تمہارے دشمن ہیں، ظالموں کے لیے بہت برا بدلہ ہے۔"

قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ اس پر مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ ابو جعفر نحاس نے کہا ہے: اس آیت میں ایک سوال ہے، کہا جاتا ہے: فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ کا کیا معنی ہے؟ تو اس میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے ...... اور یہ خلیل اور سیبویہ کا مذہب ہے کہ اس کا معنی ہے جس کے بارے اسے حکم دیا گیا اس کے بارے اس نے فسق کا ارتکاب کیا پس اس نے نافرمانی اور معصیت کا ارتکاب کیا، تو اس میں فسق کا سبب اس کے رب کا حکم ہوا، جیسے تو کہتا ہے: أطعمته عن جوع (میں نے بھوک کی وجہ سے اسے کھانا کھلایا۔) اور دوسرا قول ہے اور یہ محمد بن قطرب کا مذہب ہے کہ اس کا معنی ہے: پس وہ اپنے رب کے حکم کو رد کرنے کے سبب فاسق ہو گیا۔ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّیَّتَهٗۤ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ اللہ تعالیٰ نے کافروں کو زجر و توبیخ کی طرز پر اپنے اس قول سے فرمایا: اے اولاد آدم! کیا تم اسے اور اس کی اولاد کو دوست بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارا دشمن ہے، یعنی وہ تمہارے دشمن ہیں۔ پس یہ (عدو) اسم جنس ہے۔ بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بدلے شیطان کی عبادت کرنا بہت برا ہے، یا اللہ تعالیٰ کے بدلے شیطان بہت برا ہے۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا ابلیس کی اولاد اس کی صلب سے ہے؟ پس حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مجھ سے کسی آدمی نے پوچھا: کیا ابلیس کی بیوی ہے؟ تو میں نے کہا: بے شک وہ عُرس (اگا ہوا) ہے میں نے دیکھا نہیں ہے، پھر مجھے اللہ تعالیٰ کا یہ قول یاد آ گیا: اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّیَّتَهٗۤ اَوْلِیَآءَ تو میں نے جان لیا کہ اولاد نہیں ہوتی مگر بیوی سے تب میں نے اسے کہہ دیا ہاں (اس کی بیوی ہے) اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے (1): بے شک ابلیس نے اپنی شرمگاہ اپنی ہی شرمگاہ میں داخل کی تو اس نے پانچ انڈے دیئے، پس یہی اس کی اولاد کی اصل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 575

اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اس کی دائیں ران میں ذکر پیدا کیا ہے اور بائیں ران میں فرج پیدا کی ہے، پس وہ اس کے ساتھ اس میں وطی کرتا ہے، اور ہر روز اس کے دس انڈے نکلتے ہیں، اور ہر انڈے سے ستر شیطان اور شیطانہ خارج ہوتے ہیں، پس وہ نکلتا ہے اور اڑ جاتا ہے، اور اپنے باپ کے نزدیک درجہ کے اعتبار سے عظیم اور بڑا وہ ہے جو اولاد آدم میں فتنہ برپا کرنے کے اعتبار سے بڑا اور عظیم ہو۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: اس کی نہ کوئی اولاد ہے اور نہ کوئی ذریت، (بلکہ) اس کی ذریت شیاطین میں سے اس کے معاون و مددگار ہیں۔ قشیری ابو نصر نے کہا ہے: خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ ابلیس کی اتباع کرنے والے اس کی ذریت ہے، اور یہ کہ وہ اولاد آدم میں وسوسہ اندازی کرتے ہیں اور وہ اس کے دشمن ہیں، اور ہمارے نزدیک وہ کیفیت ثابت نہیں جس کیفیت میں اس سے توالد کا سلسلہ ہوتا ہے اور ابلیس سے اس کی ذریت پیدا ہوتی ہے، پس صحیح روایت کے مطابق اس بارے میں حکم متوقف فیہ ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس باب میں جو صحیح روایت سے ثابت ہے وہ ہے جسے حمیدی نے جمع بین الصحیحین میں امام ابو بکر رقانی سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں ابو محمد عبد الغنی بن سعید الحافظ سے عاصم کی روایت سے مسنداً ذکر کیا ہے کہ انہوں نے ابو عثمان سے اور انہوں نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو بازار میں سب سے اوّل داخل ہونے والا نہ ہو اور نہ اس سے سب سے آخر میں نکلنے والا ہو وہیں شیطان انڈے اور بچے دیتا ہے۔''

اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ شیطان کی ذریت اس کی اپنی صلب سے ہے، واللہ اعلم۔ ابن عطیہ نے کہا ہے(1): قول باری تعالیٰ وَذُرِّیَّتَهٗ میں ظاہر لفظ شیاطین میں سے وسوسہ اندازی کرنے والوں کا تقاضا کرتا ہے، جو برائی کا ارتکاب کرتے ہیں اور باطل پر ابھارتے اور برانگیختہ کرتے ہیں۔ اور طبری وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ ابلیس کی ذریت شیاطین ہیں، اور انہیں زَلَنْبُور بازاروں والا شمار کرتا ہے، وہ زمین و آسمان کے درمیان ہر بازار میں اپنا جھنڈا گاڑھ دیتا ہے، اور وہ اس جھنڈا کو سب سے پہلے دکان کھولنے والے اور سب سے آخر بند کرنے والے کی دکان پر لگاتا ہے۔ اور ثَبَر صاحب المصائب ہے، وہ چہروں پر مارنے اور گریبان چاک کرنے کا، اور ہلاکت اور جنگ کو پکارنے کا حکم دیتا ہے اور اَعور زانیوں کے دروازوں والا ہے اور مسوط خبریں دینے والا ہے، وہ انہیں لے کر آتا ہے اور انہیں لوگوں کے مونہوں میں ڈال دیتا ہے اور وہ ان کی کوئی اصل نہیں پاتے۔ اور داسم وہ ہے کہ جب آدمی اپنے گھر میں داخل ہو اور سلام نہ کہے اور اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر نہ کرے تو وہ اسے سامان میں سے وہ دکھا دیتا ہے جو اٹھایا نہیں گیا اور وہ جس کی جگہ صاف اور اچھی نہیں بنائی گئی، اور جب آدمی کھانا کھائے اور اللہ تعالیٰ کا نام ذکر نہ کرے تو وہ اس کے ساتھ کھانے میں شامل ہو جاتا ہے۔ اعمش نے کہا ہے: میں بسا اوقات گھر میں داخل ہوا اور میں نے اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کیا اور نہ میں نے سلام کیا، تو میں نے لوٹا دیکھا اور میں نے کہا: اسے اٹھا لو! اور میں ان سے جھگڑ پڑا، پھر مجھے یاد آتا ہے تو میں کہتا ہوں: داسم داسم! أعوذ باللہ منه (یعنی میں اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں) ثعلبی وغیرہ نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ زائد بھی ذکر کیا ہے: اور الابیض یہ وہ ہے جو انبیا علیہم السلام کے لئے

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ کہف، جلد 3، صفحہ 522

وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ اور صخرا یہ وہ ہے جس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی اچک لی تھی۔ اور الولہان یہ صاحب الطہارۃ ہے جو اس میں وسوسہ اندازی کرتا رہتا ہے۔ اور اقیس وہ ہے جو صاحب صلاۃ ہے یہ اس (نماز) میں وسوسے ڈالتا رہتا ہے۔ اور مُرّہ یہ صاحب المز امیر ہے اور یہ اسی سے کنایہ ہوتا ہے۔ اور الہفاف یہ صحراؤں میں ہوتا ہے جو لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور انہیں ضائع کر دیتا ہے۔ اور ان میں سے الغیلان بھی ہے۔ ابو مطیع مکحول بن فضل نسفی نے کتاب اللولویات میں حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ الھفاف صاحب الشراب ہے، اور لقوس انگیخت دینے والا ہے۔ اور الاعور سلطان کے دروازوں والا ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ دارانی نے کہا ہے: بے شک ابلیس کا ایک شیطان ہے اس کو متقاضی کہا جاتا ہے، وہ ابن آدم سے تقاضا کرتا ہے اور اسے عمل کے بارے خبر دیتا ہے جو اس کا عمل بیس برس سے مخفی تھا، پس وہ اسے اعلانیہ کرنے لگتا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ روایت اور جو اس کی ہم جنس روایات ہیں ان کے بارے کوئی صحیح سند نہیں آئی، نقاش نے اس بحث کو طویل کیا ہے اور ایسی حکایات بیان کی ہیں جو صحت سے بہت دور ہیں، اس بارے میں میری نظر سے کوئی صحیح روایت نہیں گزری سوائے اس کے جو مسلم میں ہے (1) کہ نماز کے لئے ایک شیطان ہے وہ خنزب کہلاتا ہے۔ اور ترمذی نے ذکر کیا ہے کہ وضو کے لئے ایک شیطان ہے (2) اس کا نام الولہان ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: رہی نام کے بارے میں وہ تعیین جو ذکر کی گئی ہے تو وہ صحیح ہے اور رہی یہ بات کہ اس کے متبعین، معاونین اور لشکر ہیں تو اس بارے یہ مقطوع ہے، حالانکہ ہم نے اس بارے میں صحیح حدیث ذکر کی ہے کہ اس کی اولاد اس کی صلب سے ہے، جیسا کہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا: بے شک شیطان آدمی کی شکل بنا لیتا ہے اور قوم کے پاس آ جاتا ہے اور ان سے جھوٹی گفتگو کرتا ہے پس وہ متفرق ہوتے ہیں تو ان میں سے ایک آدمی کہتا ہے: میں نے ایک آدمی کو بات کرتے ہوئے سنا میں اس کے چہرے کو تو پہچانتا ہوں اور میں یہ نہیں جانتا اس کا نام کیا ہے۔ مسند بزار میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تو استطاعت رکھے تو سب سے پہلے بازار میں داخل ہونے والا نہ ہو اور نہ اس سے سب سے آخر میں نکلنے والا ہو کیونکہ وہ شیطان کا معرکہ ہے اور اس کے ساتھ وہ اپنا جھنڈا نصب کرتا ہے۔'' اور مسند امام احمد بن حنبل میں ہے انہوں نے کہا، ہمیں عبد اللہ بن مبارک نے خبر دی ہے انہوں نے کہا ہمیں سفیان نے عطا بن سائب سے انہوں نے ابو عبد الرحمن سلمی سے اور انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب ابلیس صبح کرتا ہے وہ اپنا لشکر پھیلا دیتا ہے اور کہتا ہے: جس نے کسی مسلمان کو گمراہ کیا میں اسے تاج پہناؤں گا۔ راوی نے بیان کیا پس ایک کہنے والا اسے آ کر کہتا ہے: میں فلاں کے ساتھ لگا رہا، یہاں تک کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، وہ کہتا ہے: قریب ہے کہ وہ شادی کر لے۔ اور دوسرا کہتا ہے: میں فلاں کے ساتھ ساتھ رہا یہاں تک کہ اس نے نافرمانی کی، اس نے کہا:

1۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب التعوذ من الشیطان، جلد 2، صفحہ 224

2۔ جامع ترمذی، کتاب الطہارۃ، ماجاء کراھیۃ الاسراف، جلد 1، صفحہ 9

قریب ہے کہ وہ نیکی کرنے لگے۔ راوی کہتا ہے: پھر ایک کہنے والا کہتا ہے: میں فلاں کے ساتھ ساتھ رہا یہاں تک کہ اس نے شراب پی لی، وہ کہتا ہے: تو نے کام کیا ہے! پھر ایک کہنے والا کہتا ہے: میں فلاں کے ساتھ ساتھ رہا یہاں تک کہ اس نے زنا کر لیا، وہ کہتا ہے: تو نے کام کیا ہے! پھر ایک کہنے والا کہتا ہے: میں فلاں کے ساتھ ساتھ لگا رہا یہاں تک کہ اس نے قتل کر دیا، تو وہ کہتا ہے تو تو ہے! اور صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (1) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک ابلیس اپنا تخت پانی پر رکھتا ہے پھر اپنے لشکر بھیجتا ہے پس رتبہ کے اعتبار سے ان میں سے اس کے زیادہ قریب وہ ہوتا ہے جو فتنے کے اعتبار سے بڑا اور عظیم ہو پس ان میں سے ایک آتا ہے اور کہتا ہے: میں نے اس اس طرح کیا، تو وہ کہتا ہے: تو نے کچھ نہیں کیا فرمایا: پھر ان میں سے ایک آتا ہے اور کہتا ہے: میں نے اسے نہیں چھوڑا یہاں تک کہ میں نے اس کے درمیان اور اس کے گھر والوں کے درمیان تفریق پیدا کر دی، جدائی ڈال دی پس وہ اسے قریب کرتا ہے یا کہا: پس وہ اس سے چمٹ جاتا ہے اور کہتا ہے: تو بہت اچھا ہے۔" اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اور میں نے اپنے شیخ امام ابو محمد عبد المعطی کو اسکندریہ کی سرحد کے پاس یہ کہتے ہوئے سنا: بے شک ایک شیطان ہے اس کو بیضاوی کہا جاتا ہے وہ لگا تار روزے رکھنے والے فقراء کے پاس مثالی شکل میں آتا ہے اور جب ان میں بھوک شدید ہو جائے اور ان کے دماغوں کو نقصان اور تکلیف دینے لگے تو ان کے لئے ایک روشنی اور نور ظاہر کر دیتا ہے یہاں تک کہ ان کے گھروں کو بھر دیتا ہے تو وہ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ وہ پہنچ گئے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اس طرح نہیں ہوتا جیسا وہ گمان کرتے ہیں۔

تمت بالخیر

اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور اس کے پیارے محبوب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر عنایت سے آج مورخہ ۸ ستمبر ۲۰۰۸ء بمطابق ۷ رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ بروز پیر بوقت دو بجے دن تفسیر قرطبی دسویں جز (پانچویں جلد) کا ترجمہ اپنے اختتام کو پہنچا میں رب کریم کی بارگاہ میں سراپا التجا ہوں کہ وہ اسے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ جلیلہ سے اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے اور نفع عمیم کا باعث بنائے۔

امین بجاہ نبیہ الکریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم و صلی اللہ علی خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین الی یوم الدین۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب صفات المنافقین، تحریش الشیطان، جلد 2، صفحہ 376

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين والعاقبة للمتقين

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۖ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ۝ وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ۝ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ۝

''میں نے ان سے مدد نہیں لی تھی جب آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور نہ (اس وقت مدد لی) جب خود انہیں پیدا کیا اور میں نہیں بنایا کرتا گمراہ کرنے والوں کو اپنا دست و بازو۔ اور اس روز اللہ تعالیٰ (کفار کو) فرمائے گا بلاؤ میرے شریکوں کو جنہیں تم (میرا شریک) خیال کرتے تھے، تو وہ انہیں پکاریں گے، پس وہ انہیں کوئی جواب نہیں دیں گے اور ہم حائل کر دیں گے ان کے درمیان ایک آڑ۔ اور دیکھیں گے مجرم (جہنم کی) آگ کو اور وہ خیال کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں اور نہ پائیں گے اس سے نجات پانے کی کوئی جگہ''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ بعض علماء نے فرمایا: ھم ضمیر کا مرجع ابلیس اور اس کی ذریت ہے یعنی میں نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور خود ان کی تخلیق میں ان سے مشورہ نہیں لیا تھا بلکہ میں نے اپنے ارادہ کے مطابق انہیں تخلیق کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: میں نے ابلیس اور اس کی ذریت سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں مشورہ نہیں لیا اور نہ ان مشرکوں کی ذوات کی تخلیق میں ان سے مشورہ لیا تھا۔ تو پھر انہوں نے میرے سوا ان کو دوست کیسے بنالیا؟ بعض علماء نے فرمایا: مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ میں ضمیر کا مرجع مشرکین ہیں اور تمام لوگ ہیں۔ پس آیت کے ضمن میں نجومیوں، اہل طبائع، اطباء اور ان کے علاوہ لوگوں کا رد ہے جو ان اشیاء سے اندازے لگاتے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: میں نے اپنے باپ کو سنا وہ کہتے تھے میں نے فقیہ ابوعبداللہ محمد بن معاذ مہدوی کو مہدیہ میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے عبدالحق صقلی کو یہ قول کرتے ہوئے سنا وہ اس آیت میں یہ تفسیر کرتے تھے کہ یہ آیت ان طوائف کا رد کرنے والی ہے (1)۔ یہ بعض اصولیین نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: میں کہتا ہوں: آیت سے اولاً مقصود ابلیس اور اس کی اولاد ہے۔ اس وجہ سے مذکورہ طوائف کا رد ثابت ہوتا ہے اور ان لوگوں کا رد ثابت ہے جو کاہن اور جنوں کی تعظیم کرنے والے ہیں، جب وہ کہتے ہیں: أعوذ بعزیز ھذا الوادی میں اس وادی کے غالب کی پناہ چاہتا ہوں کیونکہ یہ تمام گروہ ابلیس اور اس کی ذریت سے متعلق

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 523

ہیں۔ انہوں نے ان سب کو گمراہ کیا ہے۔ الْمُضِلِّيْنَ سے یہی مراد ہیں۔ اور یہ تمام مذکورہ گروہ ان کے مفہوم میں داخل ہیں۔ ثعلبی نے کہا: بعض اہل علم نے کہا: مَاۤ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ نجومیوں کا رد ہے کیونکہ انہوں نے کہا: افلاک زمین میں پیدا کیے جاتے ہیں، اور بعض میں بعض پیدا کیے جاتے ہیں اور الْاَرْضِ کا قول اصحاب ہندسہ کا رد ہے کیونکہ انہوں نے کہا: زمین کروی ہے اور افلاک اس کے نیچے چلتے ہیں، لوگ اس کے نیچے اور اس کے اوپر ہیں۔ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ طبائعین کا رد ہے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ طبائع نفوس میں اثر کرتی ہیں۔ ابو جعفر نے ''ما أشھدناھم'' پڑھا ہے یعنی تعظیم کے لیے نون اور الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کی دلیل وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ ہے یعنی میں نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں نہ ان سے مدد لی ہے اور نہ میں نے ان سے مشورہ کیا: وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ یعنی شیاطین۔ بعض علماء نے فرمایا: الْمُضِلِّيْنَ سے مراد کفار ہیں۔ عضد آمدد گار۔ کہا جاتا ہے أعتضدتُ فلانا تو اس سے مدد طلب کرے اور قوت حاصل کرے۔ اس میں اصل عضد الید ہے، یعنی باز، پھر یہ مدد کے لیے استعمال کیا گیا کیونکہ ہاتھ کا قوام عضد (کہنی سے اوپر والا حصہ) کہا جاتا ہے: عَضَدَہ وعَاضَدَہ علی کذا۔ جب کوئی کسی کی مدد کرے اور اسے تقویت دے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ (القصص: 35) یعنی ہم تیرے بھائی کے ذریعے تیری مدد کریں گے۔ لفظ عضد، المثل کی جہت پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کی مدد کا محتاج نہیں۔ مذمت اور توبیخ میں زیادتی کے لیے مضلین کا خاص ذکر کیا۔ ابو جعفر جحدری نے وما کنت تاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تو گمراہوں کو اپنا دست و بازو بنانے والا نہیں۔ عَضُدًا میں آٹھ وجوہ ہیں۔ عَضُد عین کے فتحہ اور ضاد کے ضمہ کے ساتھ، یہ جمہور کی قرأت ہے، اور یہ افصح وجہ ہے۔ عَضْدًا عین کے فتحہ اور ضاد کے سکون کے ساتھ، یہ بنی تمیم کی لغت ہے، عُضُدًا عین اور ضاد کے ضمہ کے ساتھ، یہ ابو عمرو اور حسن کی قرأت ہے۔ عُضَدًا عین کے ضمہ اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ، یہ عکرمہ کی قرأت ہے۔ عِضَدًا عین کے کسرہ اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ، یہ الضحاک کی قرأت ہے۔ عَضَدًا عین اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ، یہ عیسیٰ بن عمر کی قرأت ہے۔ ہارون القاری نے عَضِد عین کے فتحہ اور ضاد کے کسرہ کے ساتھ حکایت کیا ہے۔ اور آٹھویں لغت عِضْدًا عین کے کسرہ اور ضاد کے سکون کے ساتھ، یہ ان کی لغت ہے جو کِتْف اور فِخْذ کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ۔ يَوْمَ سے پہلے اذکر و افعل محذوف ہے، یعنی اس دن کو یاد کرو جب اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہاں ہیں میرے شریک، یعنی بلاؤ انہیں جنہیں تم میرا شریک ٹھہراتے تھے، تاکہ وہ تمہیں میرے عذاب سے بچائیں، یہ بت پرستوں کو اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ حمزہ، یحییٰ، عیسیٰ بن عمر نے فنقول، نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ آگے شُرَكَآءِيَ فرمایا ہے۔ شرکائنا نہیں فرمایا۔ فَدَعَوْهُمْ پس مشرک اپنے بتوں کو پکاریں گے فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ تو وہ انہیں مدد کے لیے کوئی جواب نہیں دیں گے، اور نہ ان سے کسی عذاب کو روکیں گے۔ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا حضرت انس بن مالک نے فرمایا(1): موبق جہنم میں پیپ اور خون کی ایک

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 523

وادی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ہم مومنوں اور کفار کے درمیان آڑ بنائیں لے۔ بعض علماء نے فرمایا: بتوں اور ان کے عبادت کرنے والوں کے درمیان آڑ بنائیں گے جیسے فرمایا: فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ۔

ابن اعرابی نے کہا: ہر وہ چیز جو دو چیزوں کے درمیان آڑ ہو وہ موبق ہے۔ ابن وہب نے مجاہد سے موبقا کے تحت روایت کیا ہے کہ جہنم میں ایک وادی ہے جسے موبق کہا جاتا ہے۔ اسی طرح نوف البکالی نے کہا، مگر اس نے کہا: اس کا مطلب ہے ان کے اور مومنین کے درمیان آڑ بنادی جائے گی۔ عکرمہ نے کہا: یہ جہنم میں ایک نہر ہے جو آگ کے ساتھ بہتی ہے اس کے کناروں پر کالے خچروں کی مانند سانپ ہیں۔ جب وہ سانپ انہیں ڈسنے کے لیے جھپٹیں گے تو وہ آگ میں گھس کر پناہ لیں گے۔ زید بن درہم نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے فرمایا: مَّوْبِقًا جہنم میں پیپ اور خون کی ایک وادی ہے (1)۔ ضحاک اور عطا نے کہا: جہنم میں ایک ہلاکت کی جگہ ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: أوبقته ذنوبه إيباقا۔ گناہوں نے اسے ہلاک کر دیا۔ ابوعبیدہ نے کہا: ہلاکت کی جگہ۔ جوہری نے کہا: وبق يبق وبوقا اس کا معنی ہے ہلاک ہونا۔ الموبق، الموعد کی مثل ہے۔ وعد یعد سے مفعِلٌ کے وزن پر ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا اس میں ایک اور لغت بھی ہے: وبق يوبق وبقا اور اس میں ایک تیسری لغت بھی ہے: وبق يبق ماضی اور مضارع دونوں کا عین کلمہ مکسور ہے۔ اوبقه، اس نے اسے ہلاک کر دیا۔ زہیر نے کہا:

مَنْ يَشْتَرِي حسنَ الثَّنَاءِ بِمَالِهِ يَصُنْ عِرْضَه من كلّ شَنْعَاءَ مُوبِقُ

فراء نے کہا: ان کا باہم ملنا آخرت میں ان کے لیے ہلاکت بنایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ رَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ اصل میں رأی ہے یاء متحرک تھی جس کا ماقبل مفتوح تھا تو اسے الف سے بدلا، اسی وجہ سے کوفیوں کا خیال ہے کہ رأی کو یا کے ساتھ لکھا جائے۔ بعض بصریوں نے بھی ان کی متابعت کی ہے، لیکن ماہر بصری علماء نے جن میں محمد بن یزید بھی ہے وہ الف کے ساتھ لکھتے ہیں۔ نحاس نے کہا: میں نے علی بن سلیمان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ انہوں نے کہا، میں نے محمد بن یزید کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ مضیٰ، رمیٰ اور تمام یائی حروف کو صرف الف کے ساتھ لکھنا جائز ہے۔ یاء والے اور خط میں واو والے حروف میں کوئی فرق نہیں جیسا کہ لفظ میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اگر یا والے حروف کو یاء کے ساتھ لکھنا واجب ہوتا تو واو والے حروف کو واو کے ساتھ لکھنا واجب ہوتا حالانکہ وہ خود ہی اپنے کلیہ کو توڑتے ہیں۔ رمی کو یاء کے ساتھ اور رماہ کو الف کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اگر علت یہ ہوتی کہ یہ یاء والے حروف سے ہے تو بھی رماہ کو یاء کے ساتھ لکھنا واجب ہوتا پھر وہ ضحا لکھتے ہیں، جو ضحوۃ کی جمع ہے اور کُسا لکھتے ہیں، جو کسوۃ کی جمع ہے یہ دونوں واوی سے ہیں یاء سے لکھے گئے ہیں یہ وہ چیز ہے جو اصل پر ثابت نہیں ہوتی۔

فَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا۔ یہاں ظن بمعنی یقین اور علم ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

فَقلتُ لهم ظُنُّوا بِألفَيْ مُدَجَّجٍ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 523

یعنی انہوں نے یقین کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: انہوں نے یقین کیا کہ وہ گرنے والے ہیں اس میں۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ آگ کو دور سے دیکھیں گے تو خیال کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں۔ اور انہوں نے گمان کیا وہ بھی انہیں پکڑ لے گی۔ حدیث میں ہے "کافر جہنم کو دیکھے گا اور گمان کرے گا کہ وہ اس کے ساتھ چسپاں ہونے والی ہے، حالانکہ وہ چالیس سال کی مسافت پر ہوگی" (1)۔ مواقعہ کا معنی ہے کسی شے کے ساتھ سختی کے ساتھ وابستہ ہو جانا۔ علقمہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فَظَنُّوا اَنَّهُمْ مُلَافُوهَا پڑھا ہے یعنی وہ اس میں جمع ہونے والے ہیں۔ اللَّفَفُ کا معنی جمع کرنا ہے۔ وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا یعنی وہ نجات کی کوئی جگہ نہ پائیں گے کیونکہ وہ ہر جانب سے ان کا احاطہ کیے ہوئے ہوگی۔ قتبی نے کہا: کوئی پھرنے کی جگہ نہ پائیں گے جس کی طرف وہ پھر جائیں بعض نے فرمایا: کوئی پناہ گاہ نہ پائیں گے جس کی طرف پناہ لیں۔ ان تمام الفاظ کا مفہوم ایک ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے بت اور مورتیاں آگ کو مشرکوں سے پھیرنے کی جگہ نہ پائیں گی۔

وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿54﴾ وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَ يَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿55﴾ وَ مَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۚ وَ يُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَ اتَّخَذُوْۤا اٰيٰتِيْ وَ مَاۤ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿56﴾ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَ نَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْۤا اِذًا اَبَدًا ﴿57﴾ وَ رَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا ﴿58﴾ وَ تِلْكَ الْقُرٰۤى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَ جَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿59﴾

"اور بیشک ہم نے طرح طرح سے بار بار بیان کی ہیں اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثالیں اور انسان ہر چیز سے بڑھ کر جھگڑالو ہے۔ اور کس چیز نے روکا ہے لوگوں کو اس بات سے کہ وہ ایمان لے آئیں جب آگئی ان کے پاس ہدایت کی روشنی اور مغفرت طلب کریں اپنے رب سے مگر یہ (کہ وہ منتظر ہیں) کہ آئے ان کے پاس اگلوں کا دستور یا آئے ان کے پاس طرح طرح کا عذاب، اور ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو مگر مژدہ سنانے والے اور ڈرانے والے، اور جھگڑتے ہیں کافر بے سروپا دلیلوں کی آڑ لیکر تاکہ وہ ہٹادیں اس سے حق کو اور بنالیا ہے انہوں نے میری آیتوں کو اور جن سے وہ ڈرائے گئے، ایک مذاق۔ اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے نصیحت کی گئی اس کے رب کی آیتوں سے پس اس نے روگردانی کی ان سے اور فراموش کر دیا اس نے ان

1۔ احکام القرآن للطبری، جز 15-16، صفحہ 307

(اعمال بدکو) جو آگے بھیجے تھے اس کے دونوں ہاتھوں نے ہم نے ڈال دیئے ان کے دلوں پر پردے تا کہ وہ قرآن کو نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی اور اگر تم بلاؤ انہیں ہدایت کی طرف تو جب بھی وہ ہدایت قبول نہیں کریں گے۔ اور آپ کا پروردگار تو بہت بخشنے والا بڑا ہی رحم والا ہے، اگر وہ پکڑ لیتا انہیں ان کے کیے پر تو جلد ان پر عذاب بھیجتا (وہ ایسا نہیں کرتا) بلکہ ان کو سزا دینے کا ایک وقت مقرر ہے نہیں پائیں گے اس وقت اس کے بغیر کوئی پناہ کی جگہ۔ اور یہ بستیاں ہیں ہم نے تباہ کر دیا ان کے باشندوں کو جب وہ ستم شعار بن گئے اور ہم نے مقرر کر دی تھی ان کی ہلاکت کے لیے ایک میعاد"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ۔ یہ دو احتمال رکھتا ہے: ایک وہ جو ان کے لیے عبرت ناک واقعات اور گزشتہ اقوام کے تذکرے ذکر فرمائے۔ دوسرا احتمال یہ کہ اس نے ان کے لیے اپنی ربوبیت کے دلائل واضح فرمائے۔ یہ پہلے سورۂ سبحان میں گزر چکا ہے۔ پہلی صورت میں یہ زجر و توبیخ ہوگا اور دوسری صورت میں بیان ہوگا۔ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا۔ جَدَلًا سے مراد جھگڑنا ہے۔ اس سے مراد نضر بن حارث ہے اور اس کا قرآن کے بارے میں جھگڑنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت ابی بن خلف کے بارے میں نازل ہوئی۔ زجاج نے کہا: اس کا مطلب ہے کافر ہر چیز سے بڑھ کر جھگڑالو ہے۔ اس کی دلیل کہ انسان سے مراد کافر ہے، یہ ارشاد ہے: وَ یُجَادِلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قیامت کے روز کفار میں سے ایک شخص کو لایا جائے گا اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا: جو میں نے تیری طرف بھیجا تھا تو نے اس کے ساتھ کیا کیا۔ وہ کہے گا: یارب! میں تجھ پر ایمان لایا، تیرے رسولوں کی تصدیق کی اور تیری کتاب کے مطابق عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ اسے فرمائے گا: یہ تیرا صحیفہ ہے اس میں تو اس میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ شخص کہے گا: یارب! جو کچھ اس صحیفہ میں ہے میں اسے قبول نہیں کرتا، اسے کہا جائے گا: یہ تیرے کندھوں پر بیٹھے ہوئے فرشتے تیرے خلاف گواہی دیتے ہیں۔ وہ کہے گا: میں انہیں بھی قبول نہیں کرتا، وہ کہے گا: یارب! میں انہیں کیسے قبول کروں یہ میرے پاس سے اور میری طرف سے نہیں ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: یہ لوح محفوظ اس کی شہادت دیتی ہے۔ وہ شخص کہے گا: یارب! کیا تو نے مجھے ظلم سے پناہ نہیں دی تھی؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیوں نہیں۔ وہ عرض کرے گا: یارب! میں قبول نہیں کروں گا مگر جو مجھ پر میرے نفس سے گواہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں ابھی تجھ پر تیرے نفس سے لاتا ہوں، وہ غور کرے گا: کون میرے نفس سے مجھ پر گواہی دے گا؟ پس اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی پھر اس کے اعضاء اس کے شرک کے متعلق بولیں گے پھر اس کے اور کلام کے درمیان کچھ حائل نہیں کیا جائے گا پس وہ آگ میں داخل ہوگا؟ اس کا بعض بعض کو لعنت کرے گا۔ وہ اپنے اعضاء کو کہے گا کہ اللہ تعالیٰ تم پر لعنت کرے، میں تمہاری طرف سے جھگڑ رہا تھا۔ اس کے اعضاء اس سے کہیں گے: اللہ تعالیٰ تم پر لعنت کرے، اللہ تعالیٰ سے بات چھپائی جاتی ہے؟ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ایسی چیزوں کو بیان کر رہا ہے: وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا"۔ اس حدیث کے ہم معنی امام مسلم نے حضرت انس سے روایت کی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے وقت ان کا اور سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا

کا دروازہ کھٹکھٹایا اور فرمایا: کیا تم نماز (تہجد) نہیں پڑھتے؟ میں نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! ہماری روحیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں جب وہ ہمیں اٹھانا چاہتا ہے تو ہم اٹھ جاتے ہیں (1)۔ نبی پاک ﷺ واپس پلٹے جب میں نے یہ کہا۔ پھر میں نے آپ کو سنا جبکہ آپ واپس جارہے تھے، تو اپنی ران پر ہاتھ مار رہے تھے اور کہہ رہے تھے: وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا ''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى۔ الْهُدٰى سے مراد قرآن، اسلام اور حضرت محمد ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ وَ یَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِیَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ۔ یعنی ہماری انہیں ہلاک کرنے کی سنت ہے، یعنی انہیں ایمان لانے سے نہیں روکا مگر میرے فیصلہ نے جوان پر تھا کہ وہ ایمان نہ لائیں گے اگر میں ان پر ایمان کا فیصلہ کرتا تو وہ ایمان لے آتے۔ سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ یعنی نیست و نابود کرنے والے عذاب کی سنت جو پہلے لوگوں کے متعلق تھی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ انہیں ایمان لانے سے نہیں روکا مگر اس چیز کی طلب نے کہ ان پر بھی پہلے لوگوں کی سنت آئے پھر اس طلب کو حذف کیا گیا۔ سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ سے مراد عذاب کو دیکھنا ہے مشرکوں نے اسی چیز کو طلب کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا: ''اللھم ان کان ھذا ھو الحق من عندك ''۔

اَوْ یَاْتِیَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا۔ قُبُلًا پر نصب حال کی بنا پر ہے، اس کا معنی ہے عیاناً یعنی سامنے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ کلبی نے کہا: اس سے مراد بدر کے دن کی تلوار ہے (2)۔ مقاتل نے کہا: اس سے مراد فجأة، اچانک ہے۔ ابو جعفر، عاصم، اعمش، حمزہ، یحییٰ اور کسائی نے قُبُلًا دو ضموں کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور انہوں نے عذاب کی ساری اقسام مراد لی ہیں۔ یہ قبیل کی جمع ہے جیسے سبیل کی جمع سُبُل ہے۔ فراء کا مذہب یہ ہے کہ قبلا، قبیل کی جمع ہے اور اس سے مراد متفرق عذاب ہے جو یکے بعد دیگرے آتا ہے۔ اس کے نزدیک اس کا عیاناً معنی بھی ہوسکتا ہے۔ اعرج نے کہا: اس کی قرأت قُبُلًا ہے جس کا معنی جمیعاً ہے۔ ابو عمرو نے کہا: اس کی قرأت قِبَلًا ہے اس کا معنی عیاناً ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا مُبَشِّرِیْنَ۔ یعنی ایمان والوں کو جنت کی بشارت دینے والے۔ وَ مُنْذِرِیْنَ۔ کافروں کو عذاب سے ڈرانے والے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ وَ یُجَادِلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِیُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ المقتسمین کے بارے نازل ہوئی جو نبی پاک ﷺ سے جھگڑتے تھے، وہ کہتے: جادوگر ہے، مجنون ہے، شاعر ہے۔ کبھی کہتے: کاہن ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ لِیُدْحِضُوْا۔ کا معنی ہے زائل کرنا، باطل کرنا، الدحض اصل معنی پھسلنا ہے۔ کہا جاتا ہے: دحضت رجله یعنی اس کا پاؤں پھسل گیا۔ تدحض دحضاً۔ دحضت الشمس عن کبد السماء، یعنی سورج ڈھل گیا۔ دحضت محبته دحوضا۔ یعنی اس کی محبت باطل ہوگئی۔ أدحضها اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے اسے باطل کردیا۔ الادحاض کا معنی پھسلنا ہے۔ پل صراط کی تعریف میں ہے جہنم پر ایک پل بنایا جائے گا، شفاعت کا اذن دیا جائے گا۔ انبیاء کرام کہیں گے: سلم سلم اے اللہ سلامتی عطا فرما۔ پوچھا گیا: یارسول اللہ! وہ پل کیا ہے۔ فرمایا: دحض مزلقة۔ وہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین، الحث علی صلوٰۃ اللیل، جلد 1، صفحہ 265

2۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 578

پھسلن ہے جس میں پاؤں پھسل جائیں گے۔ طرفہ نے کہا:

أيا منذِرٍ رُمتَ الوفَاء فهِبته وحِدْتَ كما حادَ البَعِيرُ عن الدَّحْضِ

وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِیْ آیات سے مراد قرآن ہے۔ وَمَآ اُنْذِرُوْا یعنی جو انہیں وعید سنائی گئی۔ هُزُوًا مزاق۔ ما مصدریہ ہے یعنی الانذار۔ بعض نے فرمایا: ما موصولہ ہے، یعنی انہوں نے قرآن اور جس وعید سے انہیں ڈرایا گیا اسے مزاق بنایا۔ اس کا بیان سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ مکھن اور کھجور کے بارے میں ابو جہل کا قول ہے، اس نے کہا تھا: یہ زقوم ہے۔ بعض نے فرمایا: ان کا قرآن کے متعلق یہ کہنا ہے کہ یہ جادو ہے، خیالات ہیں اور پہلے لوگوں کے قصے ہیں۔ اور انہوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ یہ نہیں مگر تمہاری مثل بشر اور انہوں نے کہا: لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ ۝ (الزخرف) مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا۔ (البقرہ: 26)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰیٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا یعنی کوئی اس سے اپنے نفس پر زیادہ ظلم کرنے والا نہیں جسے اس کے رب کی آیات سے نصیحت کی گئی پھر اس نے ان سے نصیحت حاصل کرنے میں کوتاہی کی اور ان کو قبول کرنے سے اعراض کیا۔ وَنَسِیَ مَا قَدَّمَتْ یَدٰهُ اپنے کفر اور گناہوں کو چھوڑ دیا اور اس سے توبہ نہ کی، یہاں نسیان کا معنی ترک کرنا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے اسے بھول گیا جو اس نے اپنے لیے آگے بھیجا اور جو اس نے عذاب حاصل کیا۔ ان دونوں اقوال کا معنی قریب قریب ہے۔ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ وَفِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا یعنی ان کے کفر کے سبب ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے اور کانوں میں گرانی پیدا کر دی، یعنی ہم نے روک دیا ایمان کو کہ ان کے دلوں اور کانوں میں داخل ہو۔ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَی الْهُدٰی۔ ھدی سے مراد ایمان ہے، یعنی اگر آپ انہیں ایمان کی طرف بلائیں: فَلَنْ یَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا وہ پھر بھی ہدایت نہ پائیں گے۔ یہ آیت معین لوگوں کے متعلق نازل ہوئی۔ قدریہ کے قول کا اس سے رد ہوتا ہے۔ اس کا معنی سورۂ سبحان میں گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ یعنی وہ گناہوں کو بخشنے والا ہے، یہ اہل ایمان کے ساتھ خاص ہے کفار اس میں داخل نہیں۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ (النساء: 48)۔ ذُو الرَّحْمَةِ۔ اس میں چار تاویلات ہیں۔ 1۔ ذوالعفو۔ معافی دینے والا۔ 2۔ ذوالثواب۔ ثواب دینے والا۔ ان دونوں تاویلات پر اہل ایمان کے ساتھ مختص ہوگا کفار داخل نہ ہوں گے۔ 3۔ ذوالنعمۃ۔ نعمتیں عطا فرمانے والا۔ 4۔ ذوالھدی۔ ہدایت دینے والا۔ ان دونوں تاویلات کی بنا پر یہ اہل ایمان اور کفار دونوں کو شامل ہوگا، کیونکہ وہ دنیا میں کافر پر بھی انعام فرماتا ہے جس طرح مومن پر انعام فرماتا ہے۔ اس نے اپنی ہدایت کو کافر کے لیے واضح کیا جس طرح اس نے اپنی ہدایت کو مومن کے لیے واضح کیا، مگر اس سے مومن نے ہدایت پائی اور کافر محروم رہا(1)۔ لَوْ یُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا یعنی اگر وہ کفر اور گناہوں کی وجہ سے مواخذہ کرتا تو انہیں جلدی عذاب دیتا لیکن وہ مہلت دیتا ہے۔ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ۔ یعنی مدت مقرر ہے اس تک انہیں

1۔ النکت والعیون، جلد 3، صفحہ 320

ڈھیل دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ (انعام:67) لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (الرعد) الخ جب وہ وقت آجائے گا تو عذاب ان سے موخر نہ ہوگا خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں۔ لَنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا۔ مَوْىِٕلًا سے مراد پناہ گاہ ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن زید کا قول ہے، یہ جوہری نے ''الصحاح'' میں حکایت کیا ہے(1)۔ وال یئل والا وؤولا بروزن فعول، اس کا معنی ہے پناہ لینا۔ واءل بروزن فاعل، اس کا معنی ہے نجات طلب کرنا۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے محرزاً۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی ہے ولیا (دوست)، ابوعبیدہ نے کہا: اس کا معنی ہے نجات کی جگہ۔ بعض نے فرمایا: محیصًا (پناہ گاہ)، سب کا معنی ایک ہے۔ عرب کہتے ہیں: لا وألت نفسه۔ یعنی اس کا نفس نجات نہ پائے۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

لا وَأَلَتْ نفسُك خَلَّيْتَها لعامِرِيَيْنِ ولم تُكْلَمِ

اور الاعشیٰ نے کہا:

وقد أخالِسُ ربَّ البيتِ غَفْلَتَهُ وقد يُحَاذِرُ مِنِّي ثم مايِئلُ(2)

یعنی نجات نہیں پاتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ۔ تِلْكَ محل رفع میں مبتدا ہے۔ الْقُرٰٓى نعت یا بدل ہے۔ اَهْلَكْنٰهُمْ خبر کے مقام پر ہے، معنی پر محمول ہے کیونکہ الْقُرٰٓى سے مراد اہل القریٰ ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ تِلْكَ محل نصب میں ہو، ان علماء کے قول پر جو کہتے ہیں: زیدا ضربته یعنی وہ بستیاں جن کی خبریں ہم نے آپ پر بیان کی ہیں جیسے قوم عاد، ثمود، مدین، لوط کی بستیاں ہم نے انہیں ہلاک کر دیا جب انہوں نے ظلم کیا اور کفر کیا۔ وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا یعنی ہم نے ان کی ہلاکت کے لیے ایک وقت مقرر کیا ہے اس سے تجاوز نہیں ہوگا۔ مهلك، یہ أهلكوا سے مشتق ہے۔ عاصم نے مهلكهم میم اور لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ اس صورت میں هلك کا مصدر ہوگا۔ کسائی اور فراء نے مهلكهم لام کے کسرہ اور میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: کسائی نے کہا یہ میرے نزدیک بہتر ہے کیونکہ یہ هلك سے ہے۔ زجاج نے کہا: مهلك اسم ظرف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے لوقت مهلكهم جیسے کہا جاتا ہے: اتت الناقة على مضربها یعنی اونٹنی حاملہ ہونے کے وقت پر آئی۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ۝

''اور یاد کرو جب کہا موسیٰ نے اپنے نوجوان (ساتھی) کو کہ میں چلتا رہوں گا یہاں تک کہ پہنچوں جہاں دو دریا ملتے ہیں (چلتے چلتے) گزار دوں گا مدت دراز''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ۔ جمہور علماء اور اہل تاریخ کا قول یہ ہے کہ

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 311

2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 526

اس موسیٰ سے حضرت موسیٰ بن عمران مراد ہیں۔ جس کا قرآن میں ذکر ہے۔ قرآن میں ان کے علاوہ کسی موسیٰ کا ذکر نہیں ہے۔ ایک فرقہ نے کہا جن میں نوف بکالی بھی ہے کہ موسیٰ بن عمران نہیں ہے۔ یہ موسیٰ بن منشا بن یوسف بن یعقوب ہے۔ یہ موسیٰ بن عمران سے پہلے نبی تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے صحیح بخاری میں اس قول کا رد کیا ہے(1)۔ فتاہ سے مراد حضرت یوشع بن نون ہے۔ اس کا ذکر سورۃ المائدہ میں اور سورۂ یوسف کے آخر میں گزر چکا ہے۔ اور جن علماء نے کہا یہ موسیٰ بن منشا ہے ان کے نزدیک فتاہ سے مراد یوشع بن نون نہیں ہے۔ لَآ اَبْرَحُ ''میں ہمیشہ چلتا رہوں گا''، شاعر نے کہا:

وأبرحُ ما أدام اللهُ قومی بحمد الله مُنتطِقا مُجیدًا

بعض علماء نے فرمایا: لَآ اَبْرَحُ کا معنی ہے میں تجھ سے جدا نہ ہوں گا حَتّٰٓی اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ، قتادہ نے کہا: یہ فارس اور روم کے دریا ہیں(2)، یہ مجاہد کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس سے مراد پانی کا وہ بازو ہے جو بحر محیط سے شمالی طرف سے جنوب کی طرف فارس کی زمین میں اذربائیجان کے پیچھے سے نکلتا ہے(3)۔ اس قول کی بناء پر وہ جگہ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ ہوگی جہاں دو دریا ملتے ہیں جو شام کی خشکی سے ملتی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ قلزم اور اردن کے دریا ہیں۔ بعض نے فرمایا: یہ طنجہ کے قریب مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ ہے، یہ محمد بن کعب نے کہا ہے۔ حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے: یہ افریقہ میں ہے۔ سدی نے کہا: اس سے مراد ارمینیہ میں الکر اور الرس دو نہریں ہیں۔ بعض اہل علم نے کہا: یہ بحر اندلس اور بحر محیط سے ہے، یہ نقاش نے حکایت کیا ہے۔ یہ زیادہ ذکر کیا جاتا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: دریاؤں سے مراد حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہم السلام ہیں۔ یہ ضعیف قول ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حکایت کیا گیا ہے اور یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ احادیث سے بالکل واضح ثابت ہوتا ہے کہ وہ پانی کے دریا تھے۔ اس قصہ کا سبب وہ ہے جو امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابی بن کعب سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل میں خطبہ دیا، تو ان سے پوچھا گیا: لوگوں میں سے کون بڑا عالم ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو عتاب فرمایا کیونکہ انہوں نے علم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ میرا ایک بندہ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ میں ہے جو تجھ سے زیادہ عالم ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: یارب! میں اس تک کیسے پہنچ سکتا ہوں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم ایک مچھلی لے لو اور اسے ایک ٹوکرے میں رکھ لو جہاں وہ مچھلی گم ہو جائے وہ وہاں ہوگا(4)۔ یہ صحیح بخاری کے الفاظ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم مصر کی زمین پر غالب آئی تو آپ نے اپنی قوم کو مصر میں اتارا جب وہ پوری طرح وہاں گھروں میں آباد ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ایام اللہ یاد کرنے کا حکم دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطبہ دیا اور اللہ تعالیٰ نے جوان پر نعمت و خیر فرمائی تھی وہ انہیں یاد دلائی کہ اس نے فرعونیوں سے انہیں نجات دلائی اور ان کے دشمن کو ہلاک کیا اور انہیں مصر کی زمین میں خلیفہ بنایا پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمہارے

1۔ صحیح بخاری، سورۃ براءۃ، باب واذ قال موسیٰ لفتہ، جلد 2، صفحہ 687
2۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 313
3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 527
4۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 580

نبی سے کلام فرمائی اور اسے اپنی ذات کے لیے منتخب فرمایا اور اس نے مجھ پر محبت ڈالی اور تمہیں وہ سب کچھ عطا فرمایا جو تم نے اللہ تعالیٰ سے مانگا تھا، اور تمہیں اپنے زمانہ کی افضل قوم بنایا، اس نے تمہیں ذلت کے بعد عزت بخشی، فقر کے بعد غنا عطا فرمائی، تم جاہل تھے اس کے بعد تمہیں تورات بخشی۔ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے کہا: ہم جان چکے ہیں جو آپ کہہ رہے ہیں کیا سطح زمین پر تم سے زیادہ کوئی عالم ہے؟ اے اللہ کے نبی! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: نہیں! اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عتاب فرمایا جب انہوں نے علم کی نسبت اللہ کی طرف نہ کی پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف جبرئیل امین کو بھیجا (اور یہ پیغام دیا) کہ اے موسیٰ! تجھے کیا معلوم کہ میں کہاں علم رکھتا ہوں؟ ہاں میرا ایک بندہ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ میں تجھ سے زیادہ عالم ہے۔ آگے مکمل حدیث ذکر کی۔ ہمارے علماء نے فرمایا: حدیث میں ہے هو أعلم منك وہ تم سے زیادہ علم والا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ مفصل واقعات کے احکام اور معین حادثات کے حکم کے جاننے کے اعتبار سے تم سے زیادہ علم والا ہے نہ کہ مطلقاً۔ اس کی دلیل حضرت خضر علیہ السلام کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہنا ہے کہ تو ایسے علم پر ہے جو اللہ تعالیٰ نے تجھے سکھایا ہے جسے میں نہیں جانتا اور میں ایسے علم پر ہوں جو اللہ تعالیٰ نے مجھے سکھایا ہے جسے تو نہیں جانتا۔ اس بنا پر ہر ایک پر یہ صادق آتا ہے کہ وہ اپنے علم کے اعتبار سے دوسرے سے زیادہ علم والا تھا جو دوسرا نہیں جانتا تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ ارشاد سنا تو ان کے فضل نفس میں شوق پیدا ہوا اور ان کی بلند ہمت میں جذبہ ابھرا تا کہ وہ علم حاصل کریں جو وہ نہیں جانتے اور ان کی ملاقات کا شوق ہوا جس کے متعلق کہا گیا کہ وہ تجھ سے زیادہ علم والا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عزم کیا اور پوچھا کہ اس تک کیسے پہنچا جائے تو انہیں ہر حال پر چلنے کا حکم ملا، انہیں کہا گیا کہ تم اپنے ساتھ ایک نمکین مچھلی ایک زنبیل میں اٹھالو جہاں وہ زندہ ہو جائے اور تم سے گم ہو جائے وہاں اس کا راستہ ہے۔ آپ اپنے نوجوان کو ساتھ لے کر پوری کوشش سے یہ کہتے ہوئے نکلے کہ میں چلتا رہوں گا حتیٰ کہ میں مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ تک پہنچ جاؤں گا۔ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا۔ حاء اور قاف کے ضمہ کے ساتھ۔ اس سے مراد زمانہ ہے اس کی جمع احقاب ہے۔ اور یہ اسی سال کا زمانہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ زمانہ ہے اور جمع أحقاب ہے، اور الحقبة حاء کے کسرہ کے ساتھ الحِقَب کا واحد ہے، اس سے مراد سال ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ عالم کو علم کی زیادتی کی خاطر سفر کرنا چاہیے اور اس پر خادم اور ساتھی سے مدد لینی چاہیے فضلاء اور علماء کی ملاقات حاصل کرنی چاہیے اگرچہ اس کا سفر بہت دور بھی ہو، یہ سلف صالحین کی عادت تھی۔ اسی وجہ سے سفر کرنے والوں نے علم کا وافر حصہ پایا اور اس کوشش پر کامیابی حاصل کی ان کے قدم علوم میں راسخ ہو گئے، اور ان کے لیے اجر فضل کی ساری اقسام صحیح ہیں۔ امام بخاری نے فرمایا: حضرت جابر بن عبداللہ نے عبداللہ بن انیس کی صرف ایک حدیث کی خاطر ایک مہینہ کا سفر کیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ۔ اس کے بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں: 1۔ وہ نوجوان آپ کی خدمت کرتا تھا۔ عرب کلام میں الفتی نوجوان کو کہتے ہیں، اکثر خدمت کرنے والے نوجوان ہوتے ہیں، اس لیے خادم کو حسن ادب کی جہت سے فتی کہا جاتا ہے۔ شریعت نے ایسے لفظ کو پسند فرمایا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لا

یقل أحدكم عبدی ولا أمتی ولیقل فتای وفتاتی (1) ''تم میں سے کوئی عبدی اور امتی نہ کہے بلکہ فتای اور فتاتی کہے''۔ یہ تواضع کے اعتبار سے بہتر ہے۔ اس بحث کا ذکر سورۂ یوسف میں گزر چکا ہے۔ آیت میں الفتی سے مراد خادم ہے اور وہ یوشع بن نون بن افرائیم بن یوسف علیہ السلام تھے۔ کہا جاتا ہے، وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھانجے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کو فتی موسیٰ اس لیے کہا گیا کیونکہ وہ آپ سے چمٹے رہتے تھے تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے علم حاصل کریں، اگرچہ وہ آزاد تھے، یہ پہلا معنی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کیونکہ وہ فتی (غلام) کے قائم مقام تھے اس لیے انہیں فتی موسیٰ کہا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ (یوسف: 62) اور فرمایا: تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ (یوسف: 30) ابن عربی نے کہا: قرآن کا ظاہر اس بات کا مقتضی ہے کہ وہ غلام تھے۔ اور حدیث میں ہے وہ یوشع بن نون تھا اور تفسیر میں ہے وہ آپ کا بھانجا تھا۔ ان اقوال میں کوئی بات قطعی نہیں اس لیے توقف میں سلامتی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا حضرت عبداللہ بن عمرو نے فرمایا: الحقب اسی سال ہیں۔ مجاہد نے کہا: ستر سال ہیں (2)۔ قتادہ نے کہا: ایک زمانہ ہے۔ نحاس نے کہا: اہل لغت جس کو جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ الحقب اور الحقبة غیر محدود مبہم زمانہ ہے، جیسا کہ رھط اور قوم مبہم غیر محدود ہیں۔ اور اس کی جمع أحقاب ہے۔

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿٦١﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۡ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿٦٢﴾ قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۡ وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿٦٣﴾ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿٦٤﴾ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿٦٥﴾

''پھر جب وہ دونوں پہنچے جہاں آپس میں دو دریا ملتے ہیں دونوں بھول گئے اپنی مچھلی کو تو بنالیا اس نے اپنا راستہ دریا میں سرنگ کی طرح۔ پس جب وہاں سے آگے بڑھ گئے آپ نے اپنے نوجوان ساتھی سے کہا: لے آؤ ہمارا صبح کا کھانا بیشک ہمیں برداشت کرنا پڑی ہے اپنے اس سفر میں بڑی مشقت۔ اس کے ساتھی نے کہا: اے کلیم! آپ نے ملاحظہ فرمایا جب ہم (ستانے کے لیے) اس چٹان کے پاس ٹھہرے تھے تو میں بھول گیا مچھلی کو اور نہیں فراموش کرائی مجھے وہ مچھلی مگر شیطان نے کہ اس کا ذکر کروں اور اس نے بنالیا تھا اپنا راستہ دریا میں، بڑے تعجب کی بات ہے۔ آپ نے فرمایا: یہی تو وہ ہے جس کی جستجو کر رہے تھے، پس وہ دونوں لوٹے اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے۔ تو پایا انہوں نے ایک بندے کو ہمارے بندوں میں سے جسے ہم نے عطا فرمائی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الالفاظ، جلد 2، صفحہ 238
2۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 314

تھی رحمت اپنی جناب سے اور ہم نے سکھایا تھا اسے اپنے پاس سے (خاص) علم"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا۔ بَيْنِهِمَا کی ضمیر بحرین کے لیے ہے، یہ مجاہد نے کہا ہے۔ السراب کا معنی ہے گزرگاہ، سرنگ، یہ بھی مجاہد کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: پانی تھم گیا اور وہ سرنگ کی طرح ہوگیا۔ جمہور مفسرین نے کہا: مچھلی اپنے چلنے کی جگہ میں پانی میں موجود تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مچھلی کے پیچھے پیچھے چلے حتیٰ کہ اس کے ذریعے دریا میں ایک جزیرہ کے راستہ پر پہنچے۔ اس میں حضرت خضر علیہ السلام کو پایا۔ ظاہر روایات اور کتاب کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی ملاقات دریا کے ساحل پر ہوئی تھی۔ نَسِيَا حُوْتَهُمَا نسیان تو صرف نوجوان کو ہوا تھا لیکن یہاں دونوں کی طرف نسیان کی نسبت کی گئی ہے۔ تو اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ نوجوان حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہ منظر بتانا بھول گیا تھا جو اس نے مچھلی کی حالت سے دیکھا تھا تو صحبت کی وجہ سے ان دونوں کی طرف نسیان کو منسوب کیا گیا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ (الرحمٰن:22) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ (انعام:130)۔ حالانکہ رسل صرف انسانوں سے تھے جنوں سے نہیں تھے مگر مصاحبت کی وجہ سے ان کو بھی خطاب میں جمع کیا گیا۔ بخاری میں ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نوجوان سے کہا: میں تجھ سے کلام نہیں کروں گا مگر یہ کہ تو مجھے بتا جہاں تجھ سے مچھلی جدا ہوئی تھی، فرمایا: میں نے تجھے کوئی بڑی تکلیف نہیں دی (1)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ فتا سے مراد یوشع بن نون ہے یہ سعید بن مسیب سے نام مروی نہیں ہے۔ فرمایا: جب وہ ترمٹی پر چٹان کے سایہ میں تھا تو مچھلی تڑپی حضرت موسیٰ علیہ السلام سوئے ہوئے تھے، نوجوان نے کہا: میں آپ کو جگاتا نہیں ہوں حتیٰ کہ جب آپ بیدار ہوں گے تو بتا دوں گا، تو وہ جب بیدار ہوئے تو وہ بتانا بھول گیا مچھلی تڑپی اور دریا میں داخل ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے پانی کا بہاؤ روک لیا حتیٰ کہ گویا اس کا نشان (سوراخ) پتھر میں ہے، مجھے عمرو نے کہا: اس طرح گویا اس کا اثر (سوراخ) پتھر میں ہے۔ انہوں نے اپنے انگوٹھے اور ساتھ والی دو انگلیوں سے حلقہ بنایا۔ ایک روایت میں ہے: اللہ تعالیٰ نے پانی کا بہاؤ روک لیا اور وہ اس پر طاق کی طرح ہوگیا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بیدار ہوئے تو ان کا ساتھی انہیں مچھلی کے متعلق بتانے کے بارے میں بھول گیا۔ وہ بقیہ دن اور رات چلتے رہے حتیٰ کہ جب دوسرا دن تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے نوجوان سے کہا: ہمارا صبح کا کھانا لے آ ہمیں اس سفر میں مشقت برداشت کرنی پڑی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تھکن نہ ہوئی حتیٰ کہ اس مکان سے تجاوز کر گئے جس کا اللہ نے انہیں حکم دیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کے نوجوان نے کہا: کیا آپ نے ملاحظہ فرمایا جب ہم ستانے کے لیے چٹان کے پاس گئے تو میں مچھلی بھول گیا اور مجھے وہ فراموش نہیں کرائی مگر شیطان نے کہ اس کا ذکر کروں۔ بعض علماء نے فرمایا: بھولنا دونوں کی طرف سے تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَسِيَا۔ نسیان کی دونوں کی طرف نسبت کی گئی ہے۔ ابتدا میں مچھلی کا اٹھانا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے تھا کیونکہ انہیں مچھلی اٹھانے کا حکم دیا گیا تھا جب وہ دونوں چلے تو پھر مچھلی اٹھانے والا نوجون تھا حتیٰ کہ چٹان کے پاس اُترے۔

1۔ صحیح بخاری، خضر مع موسیٰ، جلد 2، صفحہ 688

فَلَمَّا جَاوَزَا یعنی جب مچھلی چھوڑ کر آگے گزر گئے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صبح کے کھانے کا سوال کیا تو نوجوان نے نسیان کی نسبت اپنی طرف کر لی۔ اللہ تعالیٰ نے مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ کے پاس ان کے بھولنے کا ذکر کیا ہے، اس سے مراد چٹان ہے۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نسیان میں شریک تھے کیونکہ نسیان کا مطلب تاخیر ہے اسی وجہ سے عرب کسی دعا میں کہتے ہیں: انساء الله فی أجلك۔ اللہ تعالیٰ تیری عمر لمبی کرے۔ جب وہ چٹان سے گزر گئے تو مچھلی اٹھانے میں تاخیر ہوگئی ان میں سے کسی نے وہ نہ اٹھائی، پس ان دونوں کی طرف نسبت جائز ہے کیونکہ وہ دونوں گزر گئے اور مچھلی چھوڑ گئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اٰتِنَا غَدَآءَنَا۔ اس میں ایک مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ سفر میں زاد راہ ساتھ لینا، یہ جاہل صوفیاء پر رد ہے جو بیابانوں اور میدان میں بغیر زادِ راہ کے جاتے ہیں یہ گمان کرتے ہوئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے نبی تھے اور اہل زمین میں سے اس کے کلیم تھے۔ انہوں نے اپنے رب کی معرفت اور اللہ تعالیٰ پر توکل کے باوجود زاد راہ ساتھ لیا۔ صحیح بخاری میں ہے (1)۔ یمن کے کچھ لوگ حج کرتے تھے اور زاد راہ ساتھ نہیں لے جاتے تھے، اور کہتے تھے: ہم توکل کرنے والے ہیں۔ پھر جب حرم میں پہنچتے تو لوگوں سے سوال کرتے تو اللہ تعالیٰ نے وَتَزَوَّدُوْا کا ارشاد نازل فرمایا، یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زاد راہ میں اختلاف ہے کہ وہ کیا تھا؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ زنبیل میں نمکین مچھلی تھی، صبح و شام وہ اس سے کھاتے تھے جب وہ دریا کے ساحل پر چٹان تک پہنچ گئے تو نوجوان نے ٹوکری کو رکھ دیا، مچھلی پر دریا کے چھینٹے پڑے تو اس نے ٹوکری میں حرکت کی، ٹوکری الٹی ہوگئی اور مچھلی سرنگ بنا کر چلی گئی۔ نوجوان حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مچھلی کا ذکر کرنا بھول گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ مچھلی حضرت خضر علیہ السلام کی جگہ کی دلیل تھی کیونکہ حدیث میں ارشاد ہوا تھا: اپنے ساتھ ایک ٹوکری میں مچھلی اٹھاؤ جہاں وہ تم سے گم ہو جائے وہ وہاں ہوگا۔ اس بنا پر مچھلی کے علاوہ کوئی زاد راہ ہوگا۔ یہ ہمارے شیخ ابو العباس نے ذکر کیا ہے اور اس کو اختیار کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا (2): میرے باپ نے کہا میں نے ابو الفضل جوہری کو اپنے وعظ میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مناجات کے لیے گئے تو وہ چالیس دن رہے اور انہیں کھانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی جب وہ انسانوں کی طرف چلے تو انہیں دن کے وقت بھوک محسوس ہوئی۔ نَصَبًا کا معنی تھکن ہے۔ النصب کا معنی تھکن اور مشقت ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے یہاں مراد بھوک ہے۔ اس میں دلیل ہے کہ جو انسان کو تکلیف اور مرض ہو تو اس کا بتانا جائز ہے، یہ مقام رضا کے منافی نہیں ہے اور نہ قضا کو تسلیم کرنے کے منافی ہے، لیکن یہ اس صورت میں جائز ہے جب اکتاہٹ اور ناراضگی کی بناء پر نہ ہو۔ وَمَاۤ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ان اور فعل مصدر کی تاویل میں ہیں۔ یہ اَنْسٰنِیْهُ کی ضمیر سے بدل اشتمال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یہ اسم ضمیر سے ظاہر بدل ہے، یعنی ما انسانی ذکرہ إلا الشیطان۔ اور حضرت عبد اللہ کے مصحف میں وما انسانیه أن أذکرہ إلا الشیطان ہے۔ یہ یوشع نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قول پر عذر پیش کرنے کے لیے کہا جو انہوں نے کہا تھا کہ میں تجھ سے بات نہیں کروں گا مگر یہ کہ تم مجھے بتاؤ جہاں تجھ سے مچھلی جدا ہوگئی تھی، میں نے تجھے کوئی بڑی تکلیف نہیں دی۔ اس

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، تزودوا فإن خیر الزاد التقوی، جلد 1، صفحہ 206 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 529

قول کی وجہ سے یوشع نے معذرت خواہانہ کلام کی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اتَّخَذَ سَبِيۡلَهٗ فِى الۡبَحۡرِ ‌ۖ عَجَبًا یہ بھی احتمال ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یوشع نے کہا ہو یعنی مچھلی نے اپنا راستہ بنالیا لوگوں کے لیے تعجب والی بات ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ خبر کی تکمیل سے ہے، پھر تعجب کو علیحدہ اپنی طرف سے بیان کیا ہو کہ اس امر پر تعجب ہے۔ تعجب اس لیے ہے کہ مچھلی مر چکی تھی اور اس کی بائیں جانب کھائی گئی تھی پھر اس کے بعد زندہ ہوگئی تھی۔ ابو الشجاع نے کہا: طبری کی کتاب میں، میں نے اس کو دیکھا، اُتِیتُ بہ (اسے لایا گیا)۔ وہ مچھلی کی ایک طرف تھی اور ایک آنکھ تھی اور دوسری طرف میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ابن عطیہ نے کہا: میں نے اس کو دیکھا جس جانب کچھ نہیں تھا۔ اس پر باریک پردہ تھا جس کے نیچے کوئی کانٹا نہیں تھا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ وَ اتَّخَذَ سَبِيۡلَهٗ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں: اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق خبر دی کہ اس نے مچھلی کے دریا میں راستہ بنانے پر تعجب کیا یا مچھلی کے متعلق خبر دی کہ اس نے لوگوں کے تعجب کے لیے راستہ بنایا۔ بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے قصص میں مروی ہے کہ وہ مچھلی زندہ ہوگئی تھی کیونکہ اسے اس چشمہ کا پانی لگا تھا جسے عین الحیاۃ کہا جاتا ہے، وہ پانی جس چیز کو لگتا ہے وہ زندہ ہو جاتی ہے۔ ''التفسیر'' میں ہے کہ علامت یہ تھی کہ مچھلی زندہ ہوگئی تھی۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام سفر سے تھک کر چٹان کے پاس ستانے کے لیے گئے تو اس کے قریب آب حیات تھا وہ پانی مچھلی کو لگا تو وہ زندہ ہوگئی (1)۔ ترمذی نے اپنی حدیث میں کہا سفیان نے کہا لوگوں کا خیال ہے کہ اس چٹان کے پاس آب حیات کا چشمہ تھا وہ کسی چیز کو نہیں لگتا مگر وہ زندہ ہو جاتی ہے۔ فرمایا: اس مچھلی سے کھایا گیا تھا، جب اس پر پانی کے قطرے پڑے تو وہ زندہ ہوگئی۔ صاحب کتاب العروس نے ذکر کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آب حیات سے وضو کیا تو آپ کی داڑھی سے ایک قطرہ مچھلی پر گرا تو وہ زندہ ہوگئی۔ واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبۡغِ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نوجوان کو مچھلی اور اس کے گم ہونے کے متعلق بتایا کہ وہ جگہ تو تھی جس کو طلب کر رہے تھے وہ شخص جس کے لیے ہم آئے ہیں وہ وہاں ہے۔ پھر وہ دونوں اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے آئے تاکہ راستہ بھول نہ جائیں۔ بخاری میں ہے (2): ان دونوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو دریا کے درمیان سبز جائے نماز پر کپڑا لپیٹ کر سویا ہوا پایا انہوں نے چادر کی ایک طرف قدموں کے نیچے اور ایک طرف سر کے نیچے کی ہوئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر سلام کیا تو انہوں نے اپنے چہرہ سے کپڑا ہٹایا اور کہا: یہ تمہاری زمین کا سلام ہے؟ تو کون ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں موسیٰ ہوں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: حضرت موسیٰ بنی اسرائیل؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہاں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے پوچھا: کیا کام ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں اس لیے آیا ہوں تاکہ آپ مجھے وہ علم سکھائیں جو آپ کو سکھایا گیا ہے۔ ثعلبی نے کتاب (العرائس) میں کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام اور یوشع نے حضرت خضر علیہ السلام کو پانی کی سطح پر سبز جائے نماز پر سویا ہوا پایا وہ سبز کپڑا اوڑھے ہوئے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورۃ الکہف، حدیث نمبر 3074، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، حدیث خضر مع موسیٰ، جلد 2، صفحہ 689

السلام نے ان پر سلام کیا تو حضرت خضر علیہ السلام نے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور کہا: یہ ہماری زمین کا سلام کہاں ہے؟ پھر اپنا سر اٹھایا اور سیدھے بیٹھ گئے اور کہا: اے بنی اسرائیل کے نبی! وعلیک السلام۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے کہا: تجھے میرے متعلق کیسے خبر ہوئی ہے؟ اور تجھے کس نے بتایا ہے کہ میں بنی اسرائیل کا نبی ہوں؟ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: جس نے آپ کو میرے متعلق بتایا ہے اور میری طرف جس نے تمہاری راہنمائی کی ہے۔ پھر کہا: اے موسیٰ! تجھے تو بنی اسرائیل میں مشغولیت تھی۔ حضرت موسیٰ نے کہا: میرے رب نے مجھے آپ کی طرف بھیجا ہے تاکہ میں آپ کی پیروی کروں اور آپ سے وہ علم سیکھوں جو آپ کو اس نے سکھایا ہے۔ پھر دونوں باتیں کرتے ہوئے بیٹھ گئے۔ ایک پرندہ آیا اور اس نے اپنی چونچ میں پانی اٹھایا۔ آگے حدیث ذکر کی جیسا کہ آگے آئے گی (1)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ۔ العبد سے مراد جمہور کے قول پر حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔ اور احادیث کا مقتضا بھی یہی ہے۔ انہوں نے اس کی مخالفت کی ہے جن کے قول کا کوئی اعتبار نہیں ہے اس نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھی حضرت خضر نہیں تھے بلکہ کوئی دوسرا عالم تھا، یہ قول قشیری نے حکایت کیا ہے۔ فرمایا: ایک قوم نے کہا: وہ عبد صالح تھا۔ صحیح یہ ہے کہ وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے، اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خبر مروی ہے۔ مجاہد نے کہا: حضرت خضر علیہ السلام کو خضر اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ جب وہ نماز پڑھتے تھے تو ان کے اردگرد کا علاقہ سرسبز ہو جاتا تھا۔ ترمذی نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے (2) فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خضر علیہ السلام کو خضر اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ سفید زمین پر بیٹھتے تھے تو وہ اس کے نیچے سبز ہو کر لہلہانے لگتی تھی"۔ یہ حدیث صحیح غریب ہے۔ حدیث میں الفروۃ کا لفظ آیا ہے جس کا معنی ... خطابی وغیرہ کا قول ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک حضرت خضر علیہ السلام نبی ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ عبد صالح تھے نبی نہیں تھے۔ آیت ان کی نبوت کی گواہی دیتی ہے کیونکہ ان کے افعال کے راز وحی سے معلوم ہو سکتے ہیں، کیونکہ انسان نہ سیکھتا ہے اور نہ ہی اتباع کرتا ہے مگر اس کی جو اس سے بلند مرتبہ ہوتا ہے۔ اور یہ جائز نہیں کہ نبی سے بلند مرتبہ وجو نبی نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ فرشتہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ ان سے علم باطن حاصل کریں جو اسے حاصل ہے۔ پہلا قول صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا اس آیت میں رحمت سے مراد نبوت ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد نعمت ہے۔ وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۝ یعنی ہم نے اسے اپنی جناب سے علم غیب سکھایا۔ ابن عطیہ نے کہا: حضرت خضر علیہ السلام کا علم، علم معرفت تھا جو ان کی طرف وحی کیا گیا تھا، ان کے افعال کو دیکھ کر ظواہر کا رنگ نہیں دیا جاتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علم، علم احکام اور علم فتویٰ لوگوں کے ظاہر اقوال اور افعال سے متعلق تھا (3)۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، حدیث خضر مع موسیٰ، جلد 2، صفحہ 689

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ کہف، جلد 2، صفحہ 144۔ ایضاً، حدیث نمبر 3076، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 529

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿۶۶﴾ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا ﴿۶۷﴾ وَ كَیْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾ قَالَ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّ لَاۤ اَعْصِیْ لَكَ اَمْرًا ﴿۶۹﴾ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِیْ فَلَا تَسْـَٔلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ حَتّٰۤى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۷۰﴾

''کہا اس بندے کو موسیٰ نے کیا: میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں بشرطیکہ آپ سکھائیں مجھے رشد و ہدایت کا خصوصی علم جو آپ کو سکھایا گیا ہے۔ اس بندے نے کہا: (اے موسیٰ) آپ میرے ساتھ صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اور آپ صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں اس بات پر جن کی آپ کو پوری طرح خبر نہیں۔ آپ نے کہا: آپ مجھے پائیں گے اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا صبر کرنے والا اور میں نافرمانی نہیں کروں گا آپ کے کسی حکم کی۔ اس بندے نے کہا: اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو مجھ سے کسی چیز کے بارے میں پوچھئے نہیں یہاں تک کہ میں آپ سے اس کا خود ذکر کروں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ یہ سوال ایک ملاطف کا سوال ہے اور مخاطب حسن ادب میں مبالغہ کرتے ہوئے اپنے مقام سے اتر کر سوال کر رہا ہے، مطلب یہ ہے کیا تمہارے لیے ایسا اتفاق ہوگا اور آپ پر آسانی ہوگی؟ یہ اس طرح ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: ''کیا تو مجھے دکھا سکتا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کیسے وضو کرتے تھے'' (1)۔ بعض تاویلات پر یہ آئے گا اسی طرح یہ ارشاد ہے: هَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّكَ اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا مَآىِٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ (المائدہ: 112) اس کا بیان سورہ مائدہ میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ شاگرد، اُستاد کے تابع ہوتا ہے اگرچہ مراتب مختلف ہوں، اس سے یہ گمان نہیں کرنا چاہیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حضرت خضر علیہ السلام سے سیکھنے میں دلیل ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے افضل تھے، کبھی فاضل کو اس بات کا علم نہیں ہوتا جس کا مفضول کو علم ہوتا ہے، فضیلت اسے حاصل ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ فضیلت دیتا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام اگر ولی تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے افضل ہوں گے، کیونکہ وہ نبی تھے اور نبی، ولی سے افضل ہوتا ہے۔ اور اگر وہ نبی تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رسالت کے ساتھ فضیلت دی گئی تھی۔ واللہ اعلم۔ رُشْدًا یہ تُعَلِّمَنِ کا دوسرا مفعول ہے۔ قَالَ، حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا یعنی اے موسیٰ! آپ میرے علم کو دیکھ کر صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھیں گے کیونکہ ظواہر جو آپ کا علم ہے وہ اس علم کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا (2)۔ آپ جس کو خطا دیکھیں گے اس پر کیسے صبر کریں گے؟ اور اس میں حکمت کی وجہ تم پر منکشف نہ

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 16431

2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 350

ہوگی تو آپ کیسے ضبط کر سکیں گے؟ وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا کا یہی معنی ہے۔ انبیاء کرام کسی منکر پر خاموش نہیں رہتے اور نہ ان کے لیے خاموش ہونا جائز ہوتا ہے، تو حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: آپ اپنی عادت اور حکم کی بنا پر خاموش نہیں رہ سکیں گے۔ خُبْرًا کی نصب تمیز کی بنا پر ہے جو فاعل سے منقول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: مصدر کی بنا پر ہے جو معنی میں متصل ہے۔ کیونکہ لَمْ تُحِطْ کا معنی ہے لم تخبره گویا فرمایا: لم تخبره خبرًا، اسی کی طرف مجاہد نے اشارہ کیا ہے۔ خبیر بالأمور وہ ہوتا ہے جو امور کے بواطن کو جانتا ہو اور امور میں سے جن سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا یعنی میں اللہ تعالیٰ نے چاہا تو صبر کروں گا۔ وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا میں آپ کی اطاعت کروں گا۔ استثنا میں اختلاف ہے کیا یہ وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا کے قول کو شامل ہے یا نہیں؟ بعض علماء نے فرمایا: اس کو شامل ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ (احزاب: 35) بعض علماء نے فرمایا: صبر میں استثنا کی تو صبر کیا اور وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا میں استثنا نہیں کی، اس لیے اعتراض کیا اور سوال کیا۔ ہمارے علماء نے فرمایا: اس میں استثناء نہیں تھی کیونکہ صبر مستقبل کا امر ہے۔ معلوم نہیں ہوتا کہ اس میں کیا حالت ہوگی اور معصیت کی نفی کا عزم کیا گیا تھا وہ فی الحال حاصل تھی، پس اس میں استثنا عزم کے منافی ہے۔ ان کے درمیان اس طرح فرق کرنا ممکن ہے کہ صبر ہمارے لیے مکتسب نہیں ہے بخلاف معصیت کے کرنے اور اس کے ترک کرنے کے، کیونکہ یہ تمام ہمارے لیے مکتسب ہے۔ واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْــَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا یعنی حتیٰ کہ میں خود تمہارے لیے اس کی تفسیر بیان کروں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے سنگت کے آداب سکھائے۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام صبر کرتے تو عجیب چیزوں کو دیکھ لیتے، لیکن انہوں نے اعتراض کیا پس فراق اور اعراض متعین ہو گیا۔

فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ۭ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَـيْـــًٔا اِمْرًا ۝ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ۝

"پس وہ دونوں چل پڑے یہاں تک کہ جب وہ سوار ہوئے کشتی میں تو اس بندے نے اس میں شگاف کر دیا، موسیٰ بول اٹھے: کیا تم نے اس لیے شگاف کیا ہے کہ اس کی سواریوں کو ڈبو دو یقیناً تم نے بہت عجیب کام کیا ہے۔ اس بندے نے کہا کیا: میں نے کہا نہیں تھا کہ آپ میں یہ طاقت نہیں کہ میری سنگت پر صبر کر سکیں۔ آپ نے (عذر خواہی کرتے ہوئے) کہا کہ نہ گرفت کرو مجھ پر میری بھول کی وجہ سے اور نہ سختی کرو مجھ پر میرے اس معاملہ میں"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں ہے(1): وہ دونوں دریا کے ساحل پر چلے ایک کشتی گزری تو انہوں نے سوار کرنے کے لیے ان سے بات کی کشتی والے حضرت خضر کو جان گئے تو انہوں نے بغیر کرائے کے سوار کر لیا جب کشتی میں دونوں سوار ہوئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اچانک دیکھا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ہتھوڑے کے ساتھ کشتی کے تختوں میں سے ایک تختہ نکالا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ان لوگوں نے ہمیں بغیر کرائے کے سوار کیا اور آپ نے ان کی کشتی کو شگاف کر دیا تاکہ اس کے سواروں کو ہلاک کر دیں، آپ نے برا کام کیا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ تو میرے ساتھ صبر نہیں کر سکے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: آپ مجھ پر گرفت نہ فرمائیں میری بھول کی وجہ سے اور نہ مجھ پر میرے اس معاملہ میں سختی کریں۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا: ”حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پہلا سوال بھولنے کی وجہ سے تھا“ فرمایا: ایک چڑیا آئی وہ کشتی کے کنارے پر بیٹھی اور دریا سے ایک چونچ بھری، حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: میرا علم اور تیرا علم، علم الٰہی سے کمی نہیں کرتا مگر جتنا کہ اس دریا سے اس چڑیا نے کمی کی ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: حرف السفینۃ سے مراد اس کی طرف ہے ہر چیز کا حرف اس کا طرف ہوتا ہے(2)، اسی سے حرف الجبل ہے پہاڑ کی چوٹی۔ اور یہاں علم بمعنی معلوم ہے جیسے فرمایا: وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ (بقرہ: 255) یعنی معلوماتہ۔ یہ حضرت خضر علیہ السلام نے تمثیل بیان کی کہ میری معلومات اور تمہاری معلومات کا اللہ تعالیٰ کے علم پر کوئی اثر نہیں جیسا کہ چڑیا نے اس دریا سے جو پانی لیا اس کی اس دریا کے پانی سے کوئی نسبت نہیں۔ دریا سے مثال بیان فرمائی، کیونکہ یہ اکثر ہمارے مشاہدہ میں ہوتا ہے اور یہاں نقص (کمی) کے لفظ کا اطلاق مجازاً ہے اس سے تمثیل اور سمجھانا مقصود ہے کیونکہ اللہ کے علم میں کوئی نقص نہیں ہے اور اس کی معلومات کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس کا معنی امام بخاری نے واضح کیا ہے فرمایا: اللہ کی قسم! میرا علم اور تیرا علم اللہ تعالیٰ کے علم کے سامنے نہیں ہے مگر جس طرح اس پرندے نے اپنی چونچ میں اس دریا سے پانی لیا ہے۔ تفسیر میں ابو العالیہ سے مروی ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا کسی نے نہ دیکھا جب آپ نے کشتی کو شگاف کیا تھا وہ ایسے بندے تھے کہ اسے کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی تھی مگر جس کو اللہ دکھانا چاہتا تھا۔ اگر قوم انہیں دیکھتی تو وہ اسے کشتی کو شگاف لگانے سے منع کرتے۔ بعض علماء نے فرمایا: اہل سفینہ جزیرہ کی طرف نکلے اور حضرت خضر علیہ السلام پیچھے موجود تھے تو انہوں نے کشتی کو شگاف کر دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کو پھاڑا تو موسیٰ علیہ السلام ایک طرف ہو گئے اور دل میں سوچا کہ میں اس شخص کی سنگت نہیں کروں گا، میں بنی اسرائیل میں کتاب اللہ کی صبح و شام تلاوت کرتا ہوں اور وہ میری اطاعت کرتے ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں بتاؤں جو تم دل میں سوچ رہے ہو؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہاں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: تم ایسا ایسا خیال کر رہے ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: آپ نے سچ فرمایا ہے، یہ ثعلبی نے کتاب (العرائس) میں ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ کشتی کے شگاف کرنے میں دلیل ہے کہ ولی کے لیے جائز ہے کہ وہ یتیم کے مال میں کمی کر دے جب

1۔ صحیح بخاری، حدیث خضر مع موسیٰ، جلد 1، صفحہ 482 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 531

وہ اس میں بھلائی اور اصلاح دیکھے مثلاً اس کے مکان پر کسی ظالم کا خوف دیکھے تو اس کے بعض حصہ کو خراب کر دے۔ امام ابو یوسف نے کہا: ولی کے لیے جائز ہے کہ وہ یتیم کے بعض مال کے عوض بعض مال کے لیے سلطان سے معاملات کرے۔ حمزہ اور کسائی نے (لیغرق) یاء کے ساتھ اور اَهْلَهَا کو یغرق کے فاعل کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔ اور جمہور کی قرأت پر لِتُغْرِقَ میں لام مآل کے لیے ہوگا جیسے لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا (القصص: 8) میں لام عاقبت و مآل کے لیے ہے اور حمزہ کی قرأت پر لام کَیْ ہے، لتغرقنی نہیں فرمایا کیونکہ ان پر فی الحال دوسرے لوگوں پر شفقت غالب تھی اور ان کے حق کی رعایت کا خیال تھا۔ اِمْرًا کا معنی عجیب ہے، یہ قتبی کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی منکر ہے، مجاہد نے بھی یہی کہا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: الامر سے مراد بہت بڑی مصیبت ہے اور دلیل کے طور پر یہ شعر پڑھا ہے:

قد لَقِی الاَقْرَانُ مِنِّی نُكْرا دَاهِيَةً دَهْيَاءَ إِدًّا إِمْرًا

اخفش نے کہا: کہا جاتا ہے اَمِرَ اَمْرُهٗ یا مَرَ اَمرًا جب شدت پیدا ہو جائے اسم الامر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا نَسِیْتُ اس کے معنی میں دو قول ہیں، (i) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرمایا: یہ کلام کی معاریض سے ہے ☆ (ii) دوسرا یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھول گئے تھے تو معذرت کی، اس میں دلیل ہے کہ نسیان مواخذہ کا مقتضی نہیں ہے، یہ تکلیف کے تحت داخل نہیں اس کے ساتھ طلاق وغیرہ کے احکام متعلق نہیں ہوتے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اگر دوسری مرتبہ بھی بھول جائے تو معذرت کرے۔

فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰۤى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ۝ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۭ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ۝

”پھر وہ دونوں چل پڑے حتیٰ کہ جب وہ ملے ایک لڑکے کو تو اس نے اسے قتل کر ڈالا، موسیٰ (غضبناک ہو کر) کہنے لگے: مار ڈالا آپ نے ایک معصوم جان کو کسی نفس کے بدلے کے بغیر، بیشک آپ نے ایسا کام کیا ہے جو بہت ہی نازیبا ہے۔ اس نے کہا: کیا (پہلے ہی) میں نے کہہ نہ دیا تھا آپ کو کہ آپ میری معیت میں صبر نہیں کر سکیں گے۔ آپ نے کہا: اگر میں پوچھوں آپ سے کسی چیز کے بارے میں اس کے بعد تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں آپ میری طرف سے معذور ہوں گے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْطَلَقَا حَتّٰۤى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ بخاری میں ہے یعلیٰ نے کہا سعید نے فرمایا: حضرت خضر علیہ السلام نے لڑکے پائے جو کھیل رہے تھے انہوں نے ایک کافر لڑکا پکڑا اور اسے لٹا دیا پھر اسے چھری سے ذبح کر دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: آپ نے ایک معصوم جان کو مار ڈالا ہے بغیر کسی نفس کے بدلے کے یعنی اس نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔

☆ معراض من الکلام سے مراد ہوتی ہے توریہ کلام کرنا۔ کسی اور کو پیش نظر رکھتے ہوئے کلام کرنا۔ توریہ میں لفظ کا بعیدی معنی پیش نظر ہوتا ہے۔

بخاری و مسلم اور ترمذی میں ہے(1): پھر دونوں کشتی سے نکلے جب وہ ساحل پر چل رہے تھے تو اچانک حضرت خضر علیہ السلام نے ایک لڑکا دیکھا جو دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا تو حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے اس کے سر کو پکڑا اور تن سے جدا کر دیا اور اسے قتل کر دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے کہا: کیا آپ نے معصوم جان کو مار ڈالا ہے بغیر کسی نفس کے بدلے کے، آپ نے بہت عجیب کام کیا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: کیا میں نے پہلے ہی نہیں کہا تھا تجھے کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے؟ فرمایا: یہ جملہ پہلے سے زیادہ سخت تھا، فرمایا: اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَیْءٍۭ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِیْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّیْ عُذْرًا اگر میں آپ سے اس کے بعد کسی چیز کے بارے میں پوچھوں تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں آپ میری طرف سے معذور ہوں گے۔ اور تفسیر میں ہے حضرت خضر علیہ السلام بچوں کے پاس سے گزرے جو کھیل رہے تھے، آپ نے اپنے ہاتھ سے ایک لڑکے کو پکڑا ان لڑکوں میں اس سے زیادہ خوبصورت کوئی نہ تھا، پھر ایک پتھر لیا اور اس کے ساتھ اس کا سر کچل دیا اور اسے قتل کر دیا۔ ابو العالیہ نے کہا: اسے صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا تھا اگر لوگ حضرت خضر علیہ السلام کو دیکھتے تو اسکے اور بچے کے درمیان حائل ہو جاتے۔

میں کہتا ہوں: ان تینوں احوال کے درمیان کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ یہ احتمال ہے کہ پہلے پتھر کے ساتھ سر کو کچلا ہو پھر اسے لٹا کر ذبح کیا ہو پھر اس کا سر تن سے جدا کر دیا ہو۔ اللہ تعالیٰ حقیقت حال بہتر جانتا ہے۔ اور تیرے لیے وہ کافی ہے جو صحیح حدیث میں آیا ہے۔ جمہور علماء نے زاکیۃ الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ کوفیوں اور ابن عامر نے زکیۃ بغیر الف کے یاء کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: معنی ایک ہے، یہ کسائی نے کہا ہے، اور ثعلب نے کہا: الزکیۃ وہ ہوتا ہے جس نے گناہ کیا ہو اور پھر توبہ کی ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: غُلٰمًا علماء کا غلام کے بارے میں اختلاف ہے، کیا وہ بالغ تھا یا نہیں؟ کلبی نے کہا: وہ بالغ تھا وہ دو شہروں کے درمیان ڈاکہ ڈالتا تھا اس کا باپ ان دو شہروں میں ایک شہر کے عظماء میں سے تھا اور اس کی ماں دوسرے شہر کے عظماء میں سے تھی۔ حضرت خضر علیہ السلام نے اسے پکڑا اور اسے گرا دیا اور اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ کلبی نے کہا: غلام کا نام شمعون تھا۔ ضحاک نے کہا: حیسون تھا۔ وہب نے کہا: اس کے باپ کا نام سلاس اور اس کی ماں کا نام رُحمی تھا۔ سہیلی نے اس کے باپ کا نام زیر اور اس کی ماں کا نام سہوی حکایت کیا ہے۔ جمہور علماء نے کہا: وہ بالغ نہ تھا، اسی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: زاکیۃ جس نے گناہ نہ کیا تھا، غلام کا لفظ بھی اسی کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ مردوں میں غلام اسے کہا جاتا ہے جو بالغ نہ ہو، اس کے مقابل عورتوں میں جاریۃ (لڑکی) ہوتی ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے اسے قتل کیا کیونکہ آپ نے اپنے علم باطنی سے جان لیا تھا کہ وہ کافر ہے جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے(2)، اگر وہ بالغ ہو جاتا تو وہ اپنے والدین کو کفر پر مجبور کرتا، چھوٹے بچے کو قتل کرنا محال نہیں جب اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت دی ہو، اللہ تعالیٰ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ہے۔ ہر چاہت پر قادر ہے اور کتاب (العرائس) میں ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب حضرت خضر علیہ السلام سے کہا: اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِیَّةً

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ کہف، جلد 2، صفحہ 143 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 144

الایۃ تو حضرت خضر علیہ السلام غضبناک ہو گئے اور اس کے کندھے کو الگ کیا اس کا گوشت اس سے اتار دیا اس کے کندھے کی ہڈی پر لکھا ہوا تھا: کافر لا یومن من باللہ ابدا۔ ''کافر ہے کبھی اللہ پر ایمان نہیں لائے گا'' پہلے قول والے علماء نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ عرب نوجوان پر غلام کے لفظ کا اطلاق کرتے ہیں۔ لیلی الاخلیلیۃ کا قول ہے:

شَفَاها من الدّاءِ العُضَالِ الذِی بِها غلامٌ إذا هَزّ القَنَاةَ سقاها

صفوان نے حضرت حسان کو کہا تھا:

تَلَقَّ ذُبَابَ السَّیفِ عَنِّی فَإِنَّنِی غلامٌ إذا هُو جِیتُ لَسْتُ بشاعِرِ

خبر میں ہے: یہ غلام (لڑکا) زمین میں فساد پھیلاتا تھا اور اپنے والدین کے سامنے قسم اٹھاتا تھا کہ اس نے ایسا نہیں کیا ہے اور اس کے والدین اس کی قسم پر قسم اٹھاتے تھے اور اس کی اس شخص سے حفاظت کرتے تھے جو اسے پکڑنا چاہتا تھا۔ علماء نے کہا: **بِغَیْرِ نَفْسٍ** کا قول اس بات کا مقتضی ہے کہ اگر وہ کسی نفس کے بدلے میں قتل ہوتا تو کوئی حرج نہ ہوتی۔ یہ غلام کے بڑا ہونے پر دلیل ہے۔ اگر وہ بالغ نہ ہوتا تو اسے کسی نفس کے بدلے قتل کرنا بھی واجب نہ ہوتا، اس کا قتل کرنا جائز تھا کیونکہ وہ بالغ اور گنہگار تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ نوجوان تھا ڈاکہ ڈالتا تھا۔ ابن جبیر کا خیال ہے کہ وہ مکلف ہونے کی عمر کو پہنچ چکا تھا کیونکہ حضرت ابی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت اسی کا تقاضا کرتی ہے: وأما الغلام فکان کافرا وکان أبواہ مؤمنین۔ کفر اور ایمان مکلفین کی صفات سے ہیں غیر مکلف پر کفر کا اطلاق نہیں کیا جاتا مگر والدین کی تبع میں اور اس غلام کے والدین مومن تھے، جس کی دلیل نص قرآنی ہے اور اس پر کافر کے اسم کا اطلاق بلوغت کی وجہ سے ہی تھا، پس اس کا کافر ہونا متعین ہو جاتا ہے۔ الغلام، الاغتلام سے ہے جس کا معنی بہت زیادہ شہوت والا ہونا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **نُّكْرًا** علماء کا اختلاف ہے کہ **نُّكْرًا** ابلغ ہے یا امرًا۔ ایک جماعت نے کہا: یہ قتل واضح ہے اور کشتی والوں کے ڈبونے کا انتظار تھا پس **نُّكْرًا** زیادہ ابلغ ہے۔ ایک جماعت نے کہا: یہ ایک شخص کا قتل ہے اور وہ پوری جماعت کا قتل ہے۔ پس امرًا زیادہ بلیغ ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: میرے نزدیک دونوں میں مختلف معانی ہیں۔ امراً۔ ایک بہت بڑی ہولناکی ظاہر کر رہا ہے جو متوقع ہے اور **نُّكْرًا**۔ فساد میں واضح ہے کیونکہ ظاہراً ایک ناپسندیدہ کام واقع ہو چکا ہے۔ اور یہ واضح ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَیْءٍۭ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِیْ** یہ شرط ہے اور وہ لازم ہے۔ مسلمانوں کے معاملات ان کی شرائط کے مطابق ہوتے ہیں اور جو شرائط پوری کرنے کی زیادہ حقدار ہیں وہ وہ ہیں جن کو انبیاء لازم کرتے ہیں اور جو انبیاء کے لیے لازم کی جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّیْ عُذْرًا** پہلی مرتبہ کچھ ہو جائے تو مطلقاً عذر خواہی کے قیام پر دلیل ہے اور دوسری مرتبہ قطعی طور پر حجت کے قیام پر دلیل ہے، یہ ابن عربی نے کہا: ابن عطیہ نے کہا ہو سکتا ہے (1) کہ قصہ احکام میں مدتوں کی اصل ہو اور وہ مدت تین دن ہے اور تین دن ہی سے احکام مختلف ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَلَا تُصٰحِبْنِیْ**۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 532

جمہور نے اسی طرح پڑھا ہے، یعنی آپ مجھے ساتھ نہ رکھیں۔ اعرج نے تصحبَنّی تاء اور باء کے فتحہ کے ساتھ اور نون کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور تصحَبْنی بھی پڑھا گیا ہے۔ یعقوب نے تُصحِبنی تاء کے ضمہ اور حاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، سہل نے اس کو ابوعمرو سے روایت کیا ہے۔ کسائی نے کہا: اس کا معنی ہے تو مجھے نہ چھوڑ کہ میں تیری سنگت اختیار کروں۔

قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا تو میری سنگت چھوڑنے پر معذوری پر پہنچ جائے گا۔ جمہور علماء نے من لدنی دال کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، مگر نافع اور عاصم نے نون کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ اصل میں لدن ہے اس کے ساتھ یاء متکلم متصل ہوئی جو غلامی اور فرسی میں ہوتی ہے یاء کے ماقبل کو کسرہ دیا گیا جس طرح غلامی اور فرسی میں دیا گیا۔ ابوبکر عاصم سے لَدْنِي لام کے فتحہ اور دال کے سکون اور نون کی تخفیف کے ساتھ روایت کیا ہے۔ عاصم سے لُدْنِي لام کے ضمہ اور دال کے سکون کے ساتھ مروی ہے۔ ابن مجاہد نے کہا: یہ غلط ہے۔ ابوعلی نے کہا: یہ تغلیط روایت کی جہت سے ہونے کے مشابہ ہے رہا عربیت کے قیاس کی بنا پر تو یہ صحیح ہے۔ جمہور نے عذراً پڑھا ہے۔ عیسیٰ نے عذراً ذال کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ دانی نے حکایت کیا ہے کہ حضرت ابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ''عُذُرِي'' راء کے کسرہ اور اس کے بعد یاء کے ساتھ روایت کیا ہے۔

مسئلہ: طبری نے اپنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے (1) فرمایا: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کے لیے دعا کرتے تو پہلے اپنا ذکر کرتے ایک روایت میں فرمایا: ''رحمة الله علينا وعلى موسى'' اگر وہ اپنے ساتھی کے ساتھ صبر کرتے تو عجیب چیزیں دیکھتے، لیکن انہوں نے کہا: ''فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا۔ اور صحیح مسلم میں ہے (2) نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رحمة الله علينا وعلى موسى اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام جلدی نہ کرتے تو عجیب باتیں دیکھتے لیکن انہیں اپنے ساتھی کی طرف سے عار نے آلیا اگر وہ صبر کرتے تو عجیب چیزیں دیکھتے''۔ فرمایا: جب آپ کسی نبی کا ذکر کرتے تو پہلے اپنا ذکر کرتے، آپ فرماتے: ''رحمة الله علينا وعلى اخي كذا''۔ اور بخاری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے (3) فرمایا: ''يرحم الله موسىٰ لوددنا أنه صبر حتى يقص علينا من امرهما''۔ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے ہماری خواہش تھی کہ آپ صبر کرتے تا کہ ہم پر ان کے معاملات بیان کیے جاتے۔

مسلم کی حدیث میں ذمامة کا لفظ آیا ہے، یہ المذمة (ذال کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ) کے معنی میں ہے جس کا معنی ہے حرمت کے ترک پر عار اور رقت محسوس کرنا۔ کہا جاتا ہے: أخذتني منك مَذَمَّة ومَذِمَّة وذمامة۔ گویا وہ مخالفت کے تکرار سے شرم محسوس کرنے لگے اور انکار کی تغلیظ کی جوان سے صادر ہوئی اس پر رقت محسوس کرنے لگے۔

فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ ِۨاسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ۭ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ۝ قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 332 2۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، خضر مع موسیٰ، جلد 2، صفحہ 271
3۔ صحیح بخاری، خضر مع موسیٰ، جلد 1، صفحہ 483

''پھر وہ چل پڑے یہاں تک کہ جب ان کا گزر ہوا گاؤں والوں کے پاس سے تو انہوں نے ان سے کھانا طلب کیا تو انہوں نے (صاف) انکار کر دیا ان کی میزبانی کرنے سے پھر ان دونوں نے اس گاؤں میں ایک دیوار دیکھی جو گرنے کے قریب تھی تو اس بندے نے اسے درست کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام کہنے لگے: اگر آپ چاہتے تو اس محنت پر مزدوری ہی لے لیتے۔ اس نے کہا: (بس سنگت ختم) اب میرے اور آپ کے درمیان جدائی کا وقت آ گیا ہے، میں آگاہ کرتا ہوں آپ کو ان باتوں کی حقیقت پر جن کے متعلق آپ صبر نہ کر سکے''۔

اس میں تیرہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهْلَ قَرْيَةِ۪ صحیح مسلم میں حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے ''لئام'' کا لفظ روایت کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام مجالس میں گھومتے تھے اور ان سے کھانا طلب کیا تو انہوں نے میزبانی کرنے سے انکار کیا، پھر ان دونوں نے ایک جھکی ہوئی دیوار دیکھی تو حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے درست کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہم اس قوم کے پاس آئے انہوں نے نہ ہماری میزبانی کی اور نہ کھانا کھلایا، اگر آپ چاہتے تو اس پر محنت ہی طلب کر لیتے، تو حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: یہ تمہاری اور میری جدائی کا وقت ہے، میں تجھے ان باتوں کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہوں جن پر تم صبر نہ کر سکے۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے میری خواہش تھی کہ آپ صبر کرتے حتیٰ کہ ہم پر ان کے واقعات واخبار ذکر کی جاتیں'' (1)۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس گاؤں کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ اَیْلَۃ (ایلہ) تھا: یہ قتادہ کا قول ہے، اسی طرح محمد بن سیرین نے کہا ہے: یہ بخیل ترین لوگوں کا گاؤں تھا اور آسمان سے یعنی اس کی رحمت سے بہت دور تھا۔ بعض نے کہا: یہ انطاکیہ کا گاؤں تھا۔ بعض نے کہا: اندلس کا جزیرہ تھا: یہ حضرت ابوہریرہ وغیرہ سے مروی ہے۔ یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ یہ سبز جزیرہ تھا۔ ایک جماعت نے کہا: یہ باجروان تھا یہ آذربائیجان کے قریب ہے۔ سہیلی نے حکایت کیا ہے فرمایا: یہ برقۃ ہے۔ ثعلبی نے کہا: یہ روم کے دیہاتوں میں سے ایک دیہات تھا، اسے ناصرہ کہا جاتا تھا: اس کی طرف نصاریٰ منسوب ہیں۔ یہ سب اس اختلاف کی بنا پر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ کس علاقہ میں ہوا؟ حقیقت حال اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹیوں کی بکریوں کو پانی پلایا تھا تو اس وقت انہیں کھانے کی زیادہ ضرورت تھی بنسبت اس وقت کے جب حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ دیہات میں آئے تھے، اس وقت تو انہوں نے خوراک طلب نہیں کی تھی بلکہ پہلے بکریوں کو پانی پلایا تھا اور یہاں خوراک کا سوال کیا ہے۔ اس مسئلہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ ایک یہ ہے کہ مدین کے سفر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اکیلے تھے اور یہاں حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ ان کی اتباع میں تھے۔ میں کہتا ہوں: اس معنی کی بنا پر آیت کی ابتدا میں اپنے نوجوان کو بھی کہا تھا: اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۡ لَقَدْ لَقِيْنَا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، خضر مع موسیٰ، جلد 2، صفحہ 269

مِنۡ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھوک کا اظہار کیا اپنے ساتھی یوشع کی رعایت کرتے ہوئے۔ واللہ اعلم۔

بعض علماء نے فرمایا: جب یہ سفر تادیب تھا تو انہیں مشقت میں مبتلا کیا گیا اور وہ سفر، سفر ہجرت تھا تو ان کی خوراک کے ذریعے مدد اور نصرت کے سپرد کیے گئے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس آیت میں خوراک کے سوال کرنے پر دلیل ہے، اگر کوئی شخص بھوکا ہو تو اسے وہ چیز طلب کرنی چاہیے جو اس کی بھوک کو ختم کر دے، جبکہ جہال صوفیاء اس کے مخالف ہیں۔ الاستطعام کا معنی کھانا طلب کرنا ہے، یہاں مراد ضیافت کا سوال ہے، اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: فَاَبَوۡا اَنۡ يُّضَيِّفُوۡهُمَا۔ اسی وجہ سے اس گاؤں والے مذمت کے مستحق ٹھہرے اور کمینگی اور بخل کی طرف منسوب کیے گئے جیسا کہ ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا ہے۔ قتادہ نے اس آیت کے بارے میں فرمایا: بدترین وہ گاؤں ہے جس میں مہمان کی مہمان نوازی نہیں کی جاتی اور مسافر کا حق نہیں پہنچایا جاتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضیافت ان پر واجب تھی۔ حضرت خضر علیہ السلام نے ان سے اس کا مطالبہ کیا جو ضیافت میں سے واجب تھا۔ انبیاء کی حالت اور فضلاء و اولیاء کے منصب کے یہی لائق ہے۔ ضیافت کے بارے میں قول سورۂ ہود میں گزر چکا ہے۔ الحمد للہ۔ اللہ تعالیٰ حریری ☆ کو معاف کرے جس نے اس آیت میں مناسب گفتگو نہیں کی، اس سے اس میں لغزش ہوئی ہے، اس نے اس آیت سے اصرار سے سوال کرنے پر استدلال کیا ہے اور ایسا کرنے والے پر یہ عیب نہیں ہے اور اس پر کوئی نقص نہیں ہے، اس نے کہا:

وإن رُدِدْتَ فما فی الرَّدِ مَنْقَصَةٌ علیك وَرَدَّ موسیٰ قبلُ والخَضِرُ

میں کہتا ہوں: یہ دین کے ساتھ مزاح ہے اور انبیاء کرام کے احترام میں کوتاہی ہے، یہ ادبی لغزش ہے اور نامناسب قول ہے۔ اللہ تعالیٰ سلف صالحین پر رحم فرمائے، انہوں نے ہر ذی عقل کو وصیت کرنے میں مبالغہ کیا ہے، انہوں نے کہا: جب تو کسی چیز سے کھیلنے والا ہو تو دین سے کھیل سے اجتناب کر۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جِدَارًا۔ الجدار والجدر دونوں کا ایک معنی ہے، حدیث شریف میں "حتی یبلغ الماء الجدر" (1)۔ حتیٰ کہ پانی کھیت کی وٹوں تک پہنچ جائے۔ مکان جَدِیْرٌ بُنِی حوالیہ جدار۔ بہتر مکان وہ ہے جس کے اردگرد دیوار بنائی گئی ہو، اصل معنی اٹھانا ہے۔ أجدرت الشجرۃ، درخت نکل آیا، اسی سے الجدری ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُّرِيۡدُ اَنۡ يَّنۡقَضَّ گرنے کے قریب تھی، یہ مجاز ہے اس کی تفسیر حدیث میں (مائل) کے قول سے کی گئی ہے، اس میں دلیل ہے کہ قرآن میں مجاز موجود ہے، یہی جمہور کا مذہب ہے۔ وہ تمام افعال جن کا حق یہ ہے کہ وہ زندہ ناطق کے لیے ہوں جب وہ جمادات اور چوپاؤں کی طرف منسوب ہوں تو وہ مجاز ہوگا یعنی اگر ان کی جگہ انسان ہوتا تو وہ اس فعل کے مناسب ہوتا۔ کلام عرب میں مجاز کثیر ہے، اسی سے اعشیٰ کا قول ہے:

1۔ صحیح بخاری، کتاب المساقاۃ، شرب الاعلی قبل الاسفل، جلد 1، صفحہ 318

☆ ابو محمد قاسم بن علی بن محمد بصری۔

أتَنْتَهون ولا يَنْهَى ذَوِي شَطَط كالطعنِ يذهبُ فيه الزَّيتُ والفُتُلُ

اعشی نے نہی کو الطعن کی طرف منسوب کیا ہے۔

اور ایک شاعر نے کہا:

يُرِيدُ الرمحُ صدر أَبِي بَرَاءٍ ويرغبُ عن دماء بني عقيل(1)

اس میں فعل یرید کی نسبت الرمح (نیزہ) کی طرف ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

إنْ دهرًا يلُفُّ شَمْلِي بجُمْلٍ لَزَمَانٌ يَهُمّ بالإحسان

ایک اور شاعر نے کہا:

لى مهبة فُلِقت به هاماتها فَلَقَ الفُؤس إذا أردن نُصُولَا

یہ عربوں کے قول: نَصَل السیفُ سے مشتق ہے جب وہ نشانہ پر لگ جائے تلواروں کے ان کے سروں پر واقع ہونے پر زمین میں ہتھوڑے کے واقع ہونے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ ہتھوڑا زمین میں واقع ہوتا ہے تو جلدی نکلتا نہیں۔ حضرت حسان بن ثابت نے کہا:

لَو أنَّ اللُّؤمَ يُنسبُ كان عَبْدًا قبيحَ الوجهِ أعْوَرَ مِنْ ثَقِيف

عنترہ نے کہا:

فازْوَرَّ من وَقْعِ القَنَا بِلَبَانِهِ وَشَكَا اِلَى بِعَبْرَةٍ وَتَحَمْحُمِ

اس معنی کی تفسیر اس قول سے بھی ہوتی ہے:

لوکان یدری ما المُحاورۃ اِشتکی

اس مفہوم میں بہت سی مثالیں موجود ہیں، اسی سے لوگوں کا قول ہے: إن داری تنظر الی دار فلان۔ دیکھنے کی نسبت دار کی طرف کی گئی ہے۔ حدیث میں ہے۔ اشتکت النار الی ربها (2)۔ شکایت کی نسبت آگ کی طرف کی گئی ہے، ایک قوم نے قرآن میں مجاز سے منع کیا ہے، ان میں ابو اسحاق اسفرائینی، ابو بکر محمد بن داؤد اصبہانی وغیرہما ہیں، کیونکہ اللہ کا کلام اور اس کے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو حقیقت پر محمول کرنا اولی ہے، کیونکہ وہ حق بیان کرتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے، نیز ان علماء نے اس سے بھی حجت پکڑی ہے کہا: اگر اللہ تعالیٰ مجاز سے ہمیں خطاب فرماتا ہے تو اسے متجوز کہنا بھی لازم آئے گا۔ اور حقیقت سے مجاز کی طرف عدول، حقیقت سے عجز کا تقاضا کرتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی نسبت کرنا محال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (النور)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 533

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، استحباب الابراد بالظہر، جلد 1، صفحہ 224

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّ زَفِيْرًا ۞ (الفرقان)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَ تَوَلّٰى ۞ (المعارج)

اور حدیث شریف میں ہے: ''اشتکت النار إلی ربها''۔ آگ نے اپنے رب کی بارگاہ میں شکایت کی۔ اور حدیث میں ہے: ''واحتجت النار والجنة''۔ دوزخ اور جنت کا مناظرہ ہوا۔ اور اس کی مثل سب حقیقت ہیں اور ان کا خالق وہ ہے جس نے ہر چیز کو بولنے کی قوت بخشی۔

صحیح مسلم میں ہے (1) حضرت انس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: ''انسان کے منہ پر مہر لگادی جائے گی اور اس کی ران کو کہا جائے گا تو بول پس اس کی ران، اس کا گوشت اور اس کی ہڈیاں اس کے اعمال کے بارے میں بولیں گی تاکہ اللہ اس کا عذر زائل کردے یہ وہ منافق ہے اور یہ وہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوگا''۔ اور یہ آخرت میں ہوگا، اور رہا دنیا میں تو ترمذی میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے (2) کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، قیامت قائم نہ ہوگی حتیٰ کہ درندے، انسانوں سے کلام کریں گے اور حتیٰ کہ انسان سے اس کے کوڑے کا پھندا اور اس کی جوتی کا تسمہ بات کرے گا اور اس کی ران اسے وہ سب کچھ بتائے گی جو اس کے گھر والوں نے اس کے بعد کیا''۔ ابو عیسیٰ نے کہا: حضرت ابو ہریرہ سے بھی یہ حدیث مروی ہے، یہ حدیث حسن غریب ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَقَامَهٗ بعض علماء نے فرمایا: پہلے دیوار کو گرایا پھر اسے بنایا پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے کہا: اگر تو چاہتا تو اس پر اجرت ہی لے لیتا، کیونکہ یہ ایسا فعل تھا جو اجر کا مستحق تھا۔ ابو بکر انباری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے انہوں نے ابو بکر سے انہوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے پڑھا: ''فوجدا فيها جدارا يريد أن ينقض فهدمه ثم قعد يبنيه''۔ ابو بکر نے کہا: اس حدیث کی اگر سند صحیح ہے تو یہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قرآن کی تفسیر کے قائم مقام ہوگی۔ بعض ناقلین نے تفسیر کی جگہ میں قرآن کو داخل کردیا کہ یہ قرآن ہے، مصحف عثمان سے کمی ہوئی ہے، جیسا کہ بعض طعن کرنے والوں نے کہا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے دیوار کو مس کیا اور اسے سیدھا کیا تو وہ سیدھی ہوگئی، یہ قول صحیح ہے اور انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے افعال کے زیادہ مناسب ہے بلکہ اولیاء کی شان کے بھی زیادہ مناسب ہے۔ بعض اخبار میں ہے: اس دیوار کی اونچائی اس صدی کے تیس ذراع کے برابر تھی اور طول پانچ سو ہاتھ کے برابر تھا، تو سیدھی کھڑی ہوگئی؛ یہ ثعلبی نے کتاب العرائس میں بیان کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے کہا: اگر آپ چاہتے تو اس پر اجر ہی لے لیتے، یعنی کھانا لے لیتے جسے ہم کھاتے اس میں اولیاء کی کرامات پر دلیل ہے۔ اسی طرح واقعہ میں حضرت خضر علیہ السلام کے احوال میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ سب خارق العادات امور ہیں۔ یہ اس صورت میں ہے جب ہم انہیں ولی تسلیم کریں، نبی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 409

2۔ جامع ترمذی، کتاب الفتن، ماجاء کلام السباع، جلد 2، صفحہ 41۔ ایضاً، حدیث نمبر 2107، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تسلیم نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ یہ ان کی نبوت کی دلیل ہے انہیں تکلیف اور احکام کی وحی کی جاتی تھی جس طرح انبیاء کو وحی کی جاتی ہے مگر وہ رسول نہیں تھے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 8۔ انسان پر واجب ہے کہ جھکی ہوئی دیوار کے نیچے نہ بیٹھے جس کے گرنے کا اندیشہ ہو بلکہ وہاں سے گزرے تو جلدی چلے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں ہے: ''جب تم میں سے کوئی بلند جھکی ہوئی دیوار کے پاس سے گزرے تو اسے جلدی چلنا چاہیے'' ☆۔ ابوعبیدہ قاسم بن سلام نے کہا: ابوعبیدہ کہتے تھے: الطربال کا لفظ عجمیوں کی بلڈنگ کے مشابہ ہے جیسے گرجا گھر اور بلند عمارت، جریر نے کہا:

اَلْوَى بِهَا شَذْبُ الْعُرُوْقِ مُشَذَّبٌ فَكَأَنَّمَا وَكَنَتْ عَلٰى طِرْبَالِ

کہا جاتا ہے: وَكَنَ يَكِنُ جب کوئی بیٹھے۔ صحاح میں ہے: الطربال دیوار کا بلند ٹکڑا، پہاڑ کی جھکی ہوئی بڑی چٹان۔ طرابیل الشام۔ شام کے گرجے۔ کہا جاتا ہے: طَرْبَلَ بَوْلَهٗ جب اوپر کی طرف لمبا کرے۔

مسئلہ نمبر 9۔ کرامات اولیاء ثابت ہیں جیسا کہ اخبار ثابتہ اور آیات متواترہ دلالت کرتی ہیں۔ اس کا انکار نہیں کرتا مگر بدعتی، ہٹ دھرم یا فاسق منحرف، قرآن کی آیات مریم علیہا السلام کے بارے میں بتاتی ہیں کہ ان کے پاس گرمیوں کے پھل سردیوں میں اور سردیوں کے پھل گرمیوں میں ہوتے تھے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ انہوں نے کھجور کے درخت کو حکم دیا وہ بالکل خشک تھا تو وہ پھلدار ہو گیا۔ حضرت مریم نبیہ نہیں تھیں، اس پر اختلاف ہے۔ اور کرامات پر دلیل حضرت خضر علیہ السلام کے ہاتھ پر کشتی کا پھٹنا، غلام کا قتل کرنا اور دیوار کو کھڑا کرنا سب کرامات ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ کہنا جائز نہیں کہ انہیں نبی کہا جائے کیونکہ نبوت کا ثابت کرنا اخبار احاد کے ساتھ جائز نہیں خصوصاً بغیر کسی احتمال کے اجماع امت سے تواتر کے طریق سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے کہ: ''لانبی بعدی'' (1)۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خاتم النبیین۔ حضرت خضر علیہ اور حضرت الیاس علیہما السلام اس کرامت کے ساتھ باقی ہیں، پس ان دونوں کا غیر نبی ہونا واجب ہے، کیونکہ اگر وہ نبی ہوتے تو ہمارے نبی کے بعد نبی کا ہونا واجب ہوتا مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تشریف لائیں گے اس پر دلیل قائم ہے۔ میں کہتا ہوں: جمہور کا خیال ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی تھے جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں یعنی ابتداً آپ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والا کوئی نہیں۔

مسئلہ نمبر 10۔ لوگوں کا اختلاف ہے کہ کیا ولی جانتا ہے کہ وہ ولی ہے یا نہیں جانتا؟ علماء کے دو قول ہیں: 1۔ قول یہ ہے کہ ولی کے لیے یہ جاننا جائز نہیں اور جو اس کے ہاتھوں پر ظاہر ہو وہ اسے خفیہ تدبیر کی آنکھ سے ملاحظہ کرے کیونکہ ہو سکتا ہے یہ خفیہ تدبیر اور استدراج ہو۔ سری سے حکایت ہے کہ وہ فرماتے تھے: اگر ایک شخص باغ میں داخل ہو اور اس سے درخت کے اوپر سے ایک پرندہ فصیح زبان میں کلام کرے: اے اللہ کے ولی! تجھ پر سلام ہو، پھر وہ اس سے یہ خوف نہ کرے کہ یہ خفیہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، ماذکر عن بنی اسرائیل، جلد 1، صفحہ 491

☆ ابوعبید نے اسے غریب الحدیث میں ذکر کیا ہے جلد 2، صفحہ 18

تدبیر ہوگی تو وہ خفیہ تدبیر میں مبتلا کیا گیا ہے، کیونکہ وہ اگر یہ جان لے گا کہ وہ ولی ہے تو اس سے خوف زائل ہو جائے گا اور اسے امن حاصل ہوگا اور ولی کی شرط میں سے ہے کہ اسے ہمیشہ امید ہو کہ اس پر فرشتے نازل ہوں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَتَنَزَّلُ عَلَيۡهِمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا (حم السجدہ:30)، ولی وہ ہوتا ہے جس کا خاتمہ سعادت پر ہو اور عواقب پوشیدہ ہوتے ہیں کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کا خاتمہ کیسا ہوگا؟ اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''إنما الأعمال بالخواتیم'' (1)۔ اعمال کا دارو مدار خاتمہ پر ہے۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ ولی کے لیے یہ جاننا جائز ہے کہ وہ ولی ہے، کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جاننا جائز ہے کہ وہ ولی ہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کوئی دوسرا جان لے کہ وہ ولی ہے تو اس کے لیے خود جاننا بھی جائز ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عشرہ مبشرہ صحابہ کو اہل جنت میں ہونے کی خوشخبری دی پھر بھی ان کا خوف زائل نہ ہوا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی زیادہ تعظیم کرنے والے تھے اور انہیں خوف زیادہ تھا، اگر عشرہ مبشرہ صحابہ کے لیے جائز ہے کہ وہ خوف سے نہیں نکلے تو دوسروں کے لیے بھی جائز ہے۔ شبلی کہتے تھے: میں اس جانب سے امان میں ہوں۔ جب شبلی فوت ہوئے اور دفن کر دیے گئے تو دیلم ☆ اسی دن دجلہ عبور کر آئے اور بغداد پر غالب آ گئے۔ لوگ کہتے تھے: دو مصیبتیں آ گئیں: شبلی کی موت اور دیلم کا عبور کرنا۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس میں بھی احتمال ہے کہ یہ بھی استدراج ہو، اگر یہ استدراج ہو جب یہ جائز نہیں ہے کیونکہ اس میں تو معجزات کا ابطال ہے تو یہ بھی جائز نہیں کیونکہ اس میں کرامات کا ابطال ہے اور بلعام کے ہاتھوں پر کرامات کا ظہور اور پھر اس کے بعد اس کا دین سے خروج کیونکہ آیت میں ہے: فَانۡسَلَخَ مِنۡهَا، تو آیت میں یہ نہیں ہے کہ وہ ولی تھا پھر اس سے ولایت چلی گئی نیز کرامات کے طور پر جو ظاہر ہوا ہے وہ اخبار احاد ہیں جن سے علم ثابت نہیں ہوتا، واللہ اعلم۔

معجزہ اور کرامت میں فرق یہ ہے کہ کرامت کی شرط میں سے اس کا چھپانا ہے اور معجزہ کی شرط میں سے اس کا اظہار کرنا ہے۔ بعض نے فرمایا: کرامت وہ ہوتی ہے جو بغیر دعویٰ کے ظاہر ہوتی ہے اور معجزہ انبیاء کے دعویٰ کے وقت ظاہر ہوتا ہے ان سے دلیل کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو اس کے بعد معجزہ وہ ظاہر کرتا ہے، کتاب کے مقدمہ میں معجزہ کی شرائط گزر چکی ہیں۔ الحمد للہ وحدہ لاشریک لہ۔

ایسی احادیث جو کرامت کے ثبوت پر وارد ہیں ان میں سے ایک وہ بھی ہے جو امام بخاری نے نقل فرمائی ہے (2)، حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن دس آدمیوں کا ایک گروہ بطور جاسوس بھیجا اور ان کا امیر عاصم بن ثابت انصاری کو بنایا تھا۔ یہ عاصم بن عمر بن خطاب کے دادا تھے ☆ پس وہ چلے حتیٰ کہ جب ھدأۃ مقام پر پہنچے جو عسفان اور مکہ کے درمیان ہے تو ان کا ذکر ہذیل کے ایک قبیلہ سے کیا گیا جنہیں بنو لحیان کہا جاتا تھا، انہوں نے اپنے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، جلد 2، صفحہ 961 2۔ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، هل يستاسر الرجل، جلد 1، صفحہ 427

☆ یہ ایک قبیلہ ہے ان کے علاقہ کی وجہ سے انہیں یہ نام دیا گیا۔

☆ قسطلانی نے ارشاد الساری جلد 5 صفحہ 163 میں کہا: مصعب زبیری نے کہا یہ عاصم کے ماموں تھے۔

دو سو کے قریب تیرانداز تیار کیے وہ ان کے قدموں کے نشانات دیکھتے ہوئے چلے حتی کہ انہوں نے ان کے کھانے کی جگہ پر کھجوریں پائیں جو مدینہ طیبہ سے لے آئے تھے، وہ کہنے لگے: یہ تو مدینہ کی کھجوریں ہیں وہ ان کے قدموں کے نشانات پر چلے جب عاصم اور اس کے ساتھیوں نے انہیں دیکھا تو وہ ایک بلند جگہ پر چڑھ گئے اور بنولحیان نے ان کا احاطہ کرلیا، انہوں نے انہیں کہا: تم اُتر آؤ اور اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو ہم تمہیں عہد اور وعدہ دیتے ہیں کہ ہم تمہیں قتل نہیں کریں گے۔ عاصم جو اس گروہ کا سردار تھا اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں تو آج کافر کے ذمہ میں نہیں اتروں گا اور دُعا کی: اے اللہ اپنے نبی مکرم ﷺ کو ہماری خبر پہنچا دے۔ بنولحیان نے تیر مارے اور عاصم اور چھ مزید لوگوں کو قتل کر دیا۔ تین مسلمان، ان کے عہد و میثاق پر نیچے اتر آئے تھے وہ خبیب انصاری، ابن دثنہ اور ایک شخص تھا جب وہ ان پر غالب آ گئے تو انہوں نے اپنی کمانوں کی رسیاں کھولیں اور انہیں ان سے باندھ دیا تیسرے شخص نے کہا: یہ پہلا غدر ہے، اللہ کی قسم! میں تمہارے ساتھ نہیں چلوں گا میرے لیے ان مقتولوں کا اُسوہ ہے۔ بنولحیان نے اسے کھینچا اور اسے ساتھ لے جانے کی کوشش کی لیکن اس نے ایسا نہ کیا انہوں نے اسے بھی قتل کر دیا وہ خبیب اور ابن دثنہ کو لے کر چلے حتیٰ کہ انہوں نے جنگ بدر کے بعد مکہ میں انہیں فروخت کر دیا۔ بنو حارث بن عامر بن نوفل بن عبد مناف نے خبیب کو خریدا، خبیب وہ شخص تھا جس نے حارث بن عامر کو جنگ بدر میں قتل کیا تھا۔ حضرت خبیب ان کے پاس قیدی بن کر رہے۔ عبید اللہ بن عیاض نے بتایا کہ بنت حارث نے انہیں بتایا کہ جب وہ (بنولحیان) جمع ہوئے تھے تو خبیب نے استرا مانگا جس کے ساتھ وہ اپنے بال صاف کرے تو اس عورت نے اسے استرا دے دیا، پھر وہ کہتی ہے: میں غافل تھی تو میرا بچہ اس کے پاس چلا گیا تو اس نے اسے پکڑ لیا وہ عورت کہتی ہے میں نے خبیب کو دیکھا کہ وہ اس بچے کو اپنی ران پر بٹھائے ہوئے ہے اور استرا اس کے ہاتھوں میں ہے۔ اس عورت نے کہا: میں گھبرا گئی۔ خبیب میری گھبراہٹ میرے چہرے سے پہچان گئے حضرت خبیب نے کہا کیا: تو خوف کر رہی ہے کہ میں اسے قتل کر دوں گا؟ میں ایسا نہیں کروں گا، اس عورت نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے خبیب سے بہتر کوئی قیدی نہیں دیکھا اللہ کی قسم! میں نے ایک دن اسے ہاتھوں میں انگور لے کر کھاتے ہوئے دیکھا حالانکہ وہ لوہے کی زنجیروں کے ساتھ باندھا ہوا تھا اور مکہ میں کوئی پھل نہیں تھا، وہ کہتی تھی: یہ وہ رزق تھا جو اللہ تعالیٰ نے خبیب کو دیا تھا جب وہ خبیب کو حرم سے باہر لے کر گئے تا کہ اسے حرم سے نکالیں تو خبیب نے اسے کہا: مجھے چھوڑ دو میں دو رکعتیں ادا کرلوں پھر حضرت خبیب نے دو رکعتیں ادا کیں پھر فرمایا: اگر تم یہ گمان نہ کرتے کہ میں موت سے ڈر گیا ہوں تو میں رکعتوں کو لمبا کرتا پھر فرمایا: اے اللہ! ان کو جڑ سے ختم کر دے اور انہیں جدا جدا کر کے قتل کر دے اور ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑ پھر کہا:

وَلَسْتُ أُبَالِي حِينَ أُقْتَلُ مُسْلِمًا … عَلَى أَيِّ شِقٍّ كَانَ لِلّٰهِ مَصْرَعِي

وَذَلِكَ فِي ذَاتِ الْإِلٰهِ وَإِنْ يَشَأْ … يُبَارِكْ عَلَى أَوْصَالِ شِلْوٍ مُمَزَّعِ

مجھے کوئی پروا نہیں جب میں مسلمان ہو کر قتل کیا جاؤں گا جس طرف بھی اللہ کی رضا کے لیے میرا گرنا ہوگا یہ ذات الٰہی کے لیے ہے اگر وہ چاہے گا تو اکھڑے ہوئے اعضاء میں بھی برکت ڈال دے گا۔

بنو حارث نے حضرت خبیب کو قتل کر دیا، خبیب وہ شخص تھا جس نے ہر مسلمان کے لیے دو رکعت سنت چھوڑیں جو باندھ کر قتل کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عاصم کی دُعا قبول فرمائی تھی جب وہ شہید ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو ان کی شہادت کی خبر پہنچادی۔

کفار قریش کو جب خبر پہنچی کہ حضرت عاصم قتل ہو گئے ہیں تو انہوں نے کچھ لوگوں کو بھیجا تا کہ وہ عاصم کے جسم سے کچھ کاٹ کر لے آئیں تا کہ وہ اسے پہچان لیں۔ حضرت عاصم نے بدر کی جنگ میں ان کے ایک سردار کو قتل کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عاصم کی حفاظت کے لیے بھڑوں کو بھیج دیا جنہوں نے ان کی طرف آنے والے افراد سے حضرت عاصم کی حفاظت کی وہ ان کا گوشت کاٹنے پر قادر نہ ہوئے (1)۔

ابن اسحاق نے اس واقعہ میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عاصم بن ثابت جب شہید ہو گئے تو ہذیل نے ارادہ کیا کہ ان کا سر کاٹ لیں تا کہ اسے سلافہ بنت سعد کے ہاں فروخت کریں اس نے نذر مانی تھی جب حضرت عاصم نے اس کے بیٹوں کو جنگ احد میں قتل کیا تھا کہ اگر وہ اس کے سر پر قادر ہوئی تو اس کی کھوپڑی میں شراب پیئے گی تو بھڑوں نے حضرت عاصم کی حفاظت کی، جب بھڑیں حائل ہو گئیں تو انہوں نے کہا: اسے چھوڑ دو حتیٰ کہ شام ہو جائے تو شام کے وقت بھڑیں چلی جائیں گی پھر ہم اس کو کاٹ لیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے وادی کو حکم دیا تو اس نے حضرت عاصم کو اٹھالیا اور وہ غائب ہو گئے۔ حضرت عاصم نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ وہ کسی مشرک کو نہ چھوئیں گے اور نہ کوئی مشرک انہیں چھوئے گا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی وفات کے بعد محفوظ فرمایا اس سے جس سے وہ زندگی میں بچتے رہے۔

عمرو بن امیہ ضمری سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تنہا بطور جاسوس بھیجا فرمایا میں خبیب کی سولی کے پاس آیا میں اس پر چڑھا میں دیکھنے والوں سے ڈر رہا تھا، میں نے خبیب کو سولی سے کھولا تو وہ زمین پر گرے پھر میں اترا پھر میں تھوڑا سا دور ہوا پھر میں متوجہ ہوا تو زمین نے اسے نگل لیا تھا۔ ایک روایت میں یہ زیادتی ہے کہ آج تک خبیب کی قبر کا ہم سے ذکر نہیں کیا گیا، یہ بیہقی نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ یہ کوئی ناپسندیدہ بات نہیں کہ ولی کے لیے مال اور جائیداد ہو جس کے ساتھ وہ اپنی ذات اور عیال کی حفاظت کرے۔ صحابہ کرام کی ذوات میں تیرے لیے اسوہ کافی ہے کہ ان کی ولایت وفضیلت کے باوجود ان کے اموال تھے اور وہ دوسروں پر حجت تھے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں (2) فرمایا: ''ایک شخص صحرا میں تھا اس نے بادل میں ایک آواز سنی فلاں کے باغ کو پانی پلا، وہ بادل چلا اور پتھریلے ٹیلے میں اپنا پانی برسایا وہاں جو پانی کا نالا تھا وہ پانی سے بھر گیا وہ شخص اس پانی کے پیچھے پیچھے چلا تو کیا دیکھا ایک آدمی کسی کے ساتھ پانی کو پھیر رہا ہے پوچھا: اے اللہ کے بندے! تیرا نام کیا ہے؟ اس نے کہا: فلاں، وہ نام ذکر کیا جو اس نے بادل کے اندر سے سنا تھا۔ اس نے کہا: اے اللہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، ھل یستاسر الرجل، جلد 1، صفحہ 427

2۔ صحیح مسلم، کتاب الزھد، فضل الانفاق علی المساکین وابن السبیل، جلد 2، صفحہ 411

کے بندے! تو نے میرا نام کیوں پوچھا ہے؟ اس نے کہا: میں نے اس بادل میں آواز سنی تھی جس کا یہ پانی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا: فلاں کے باغ کو پانی پلا، اس نے تیرا نام لیا تھا، تو اس میں کیا کرتا ہے؟ اس نے کہا جب تو کہتا ہے (تو سن) میں اس باغ کی کل پیداوار کو دیکھتا ہوں پھر اس سے ایک تہائی صدقہ کرتا ہوں ایک تہائی میں اور میرا اعیال کھاتے ہیں اور ایک تہائی اس میں پھر کاشت کرتا ہوں"۔ ایک روایت میں ہے: "اس کا ایک تہائی مسکین، سائلین اور مسافروں کے لیے رکھتا ہوں" (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: "لاتتخذوا الضیعة فترکنوا إلی الدنیا" (تم جائیداد نہ بناؤ ورنہ دنیا کی طرف جھک جاؤ گے) کے منافی نہیں ہے۔ اس حدیث کو ترمذی نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے (2)، اور فرمایا: یہ حدیث حسن ہے۔ یہ حدیث اس پر محمول ہے جو کثرت مال کی خاطر جائیداد بناتا ہے یا جائیداد سے لطف اندوز ہونے کے لیے جائیداد اکٹھی کرتا ہے لیکن وہ شخص جو بطور معیشت جائیداد بناتا ہے تاکہ اس کے ساتھ اپنے دین اور اپنے عیال کی حفاظت کرے تو اس نیت سے جائیداد بنانا افضل عمل ہے اور یہ افضل مال ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "بہتر مال نیک شخص کے لیے ہے" (3)۔ کرامات اولیاء بہت سے لوگوں نے کثرت سے ذکر کی ہیں جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس میں کفایت ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا اس میں اجارہ کے جواز کی صحت پر دلیل ہے یہ انبیاء اور اولیاء کی سنت ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۃ القصص میں ان شاء اللہ آئے گا۔ جمہور علماء نے لَتَّخَذْتَ اور ابوعمرو نے لَتَخِذْتَ پڑھا ہے۔ حضرت ابن مسعود، حسن اور قتادہ کی یہی قرأت ہے یہ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں کا معنی ایک ہے۔ اور الأخذ سے مشتق ہے جیسے تیرا قول ہے: تبع واتبع تقی واتقی۔ بعض قراء نے ذال کو تاء میں ادغام کیا ہے اور بعض نے مدغم نہیں کیا ہے۔ حضرت ابی ابن کعب کی حدیث میں ہے: لوشئت لأوتیت أجرا (4)۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کی جہت سے سوال صادر ہوا تھا نہ کہ بطور اعتراض تھا۔ اس وقت حضرت خضر علیہ السلام نے آپ کو کہا: هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ کا تکرار اور بیننا سے عدول تاکید کی خاطر ہے۔ سیبویہ نے کہا، کہا جاتا ہے: أخزی الله الکاذب منی ومنک یعنی منا یعنی ہم میں سے جھوٹے کو اللہ رسوا کرے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول کشتی اور غلام کے بارے میں اللہ کے لیے تھا اور دیوار کے بارے میں قول اپنی ذات کے لیے دنیا کی چیز طلب کرنے کے لیے تھا، پس یہی جدائی کا سبب بنا۔ وہب بن منبہ نے کہا: وہ دیوار سو ہاتھ اونچی تھی۔

مسئلہ نمبر 13۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا کسی چیز کی تاویل کا مطلب ہے اس کا انجام یعنی حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ سے کہا: میں تمہیں بتاتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کیا ہے کیوں کیا ہے؟ ان آیات کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حجت ہیں نہ کہ ان کے لیے تعجب ہیں، یہ اس طرح ہے کہ جب کشتی کے پھاڑنے پر انکار کیا تو آواز دی گئی: اے موسیٰ! یہ تیری تدبیر کہاں تھی جب تو تابوت میں تھا اور تجھے دریا میں ڈالا گیا تھا، پھر

1۔ جامع ترمذی، ہم الدنیا، جلد 2، صفحہ 56
2۔ جامع ترمذی کتاب الزھد، باب ماجاء فی ہم الدنیا وحبھا، حدیث 2250
3۔ مسند امام احمد بن حنبل حدیث نمبر 17763
4۔ صحیح بخاری، تفسیر سورۂ کہف، اذ قال موسی لفتاہ، جلد 2، صفحہ 688

جب لڑکے کے مسئلہ پر انکار کیا تو ارشاد ہوا: یہ تیرا انکار کہاں تھا تو نے جب قبطی کو مارا تھا اور اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا، جب دیوار کے کھڑے کرنے پر انکار کیا تو آواز دی گئی: یہ کہاں تھا جب تو حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹیوں کے لیے کنوئیں کا پتھر بغیر اجرت کے اٹھا رہا تھا۔

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ﴿٧٩﴾ وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا ﴿٨٠﴾ فَأَرَدْنَا أَنْ يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِنْهُ زَكَاةً وَأَقْرَبَ رُحْمًا ﴿٨١﴾ وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ذَٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ﴿٨٢﴾

''وہ جو کشتی تھی وہ چند غریبوں کی تھی جو (ملاحی کا) کام کرتے تھے دریا میں، سو میں نے ارادہ کیا کہ اسے عیب دار بنادوں اور (اس کی وجہ یہ تھی کہ) ان کے آگے (جابر) بادشاہ تھا جو پکڑ لیا کرتا تھا ہر کشتی کو زبردستی۔ اور وہ جو لڑکا تھا (تو اس کی حقیقت یہ ہے) کہ اس کے والدین مومن تھے پس ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ (اگر زندہ رہا تو) مجبور کر دے گا انہیں سرکشی پر۔ پس ہم نے چاہا کہ بدلہ دے انہیں ان کا رب ایسا بیٹا جو بہتر ہو اس سے پاکیزگی میں اور (ان پر) زیادہ مہربان ہو۔ باقی رہی دیوار (تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ) وہ شہر کے دو یتیم بچوں کی تھی اور اس کے نیچے انکا خزانہ (دفن) تھا اور ان کا باپ بڑا نیک شخص تھا، پس آپ کے رب نے ارادہ فرمایا کہ وہ دونوں بچے اپنی جوانی کو پہنچیں اور نکال لیں اپنا دفینہ یہ (ان پر) ان کے رب کی خاص رحمت تھی، اور (جو کچھ میں نے کیا) میں نے اپنی مرضی سے نہیں کیا یہ حقیقت ہے ان امور کی جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ جو علماء کہتے ہیں فقیر سے مسکین بہتر حال میں ہوتا ہے انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے، اس کا معنی سورہ براءۃ میں تفصیلاً گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ لوگ تاجر تھے لیکن چونکہ وہ مسافر تھے وہ دریا کے اوپر تھے ان کے پاس مال کم تھا اور تکلیف کو دور کرنے کی حالت میں کمزور تھے تو انہیں مساکین کہا گیا کیونکہ وہ ایسی حالت میں تھے کہ اس کے سبب ان پر شفقت کی گئی ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے تو کسی غنی شخص کے بارے میں کہتا ہے جو کسی تکلیف اور مصیبت میں واقع ہوا ہے: مسکین ہے۔ کعب وغیرہ نے کہا: یہ مساکین دس بھائی تھے جن کو کشتی باپ کی طرف سے میراث میں ملی تھی پانچ ان میں سے اپاہج تھے اور پانچ دریا میں ملاحی کا کام کرتے تھے۔ بعض نے فرمایا: وہ سات تھے ان میں سے ہر ایک کو ایسی تکلیف تھی جو دوسرے کو نہیں تھی۔ نقاش نے ان کے اسماء ذکر کیے ہیں ان میں سے جو کام کرنے والے تھے ان میں ایک جزام کی مرض میں مبتلا تھا، دوسرا کانا تھا، تیسرا لنگڑا تھا، چوتھے کو خصیوں کی

تکلیف تھی، پانچواں بخار میں ہمیشہ رہتا تھا وہ سب سے چھوٹا تھا۔ پانچ وہ تھے جو کام بالکل نہیں کر سکتے تھے وہ اندھا، بہرہ، گونگا، اپاہج اور مجنون تھا۔ اور وہ جس دریا میں کام کرتے تھے وہ فارس اور روم کے درمیان تھا، یہ ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ ایک فرقہ نے لمساکین، سین کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ کشتی کے ملاح تھے کیونکہ مساک وہ ہوتا ہے جو کشتی کا نچلا حصہ روکتا ہے اور پوری خدمت اس کے روکنے کی وجہ سے ہوتی ہے اس لیے تمام کو مساکین کہا گیا۔ ایک جماعت نے کہا: المساکین سے مراد کھالوں کا دباغت کرتا ہے اس کا واحد مسلک ہے۔ اظہر قرأت مساکین ہے جمع مسکین ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ کشتی ضعیف اور کمزور لوگوں کے لیے تھی ان پر شفقت کرنا مناسب تھا، واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَهَا میں نے اسے عیب دار کرنا چاہا۔ کہا جاتا ہے: عبت الشئ فعاب، میں نے اسے عیب دار کیا تو وہ عیب دار ہوگئی۔ فھو معیب وعائب، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ یَّاْخُذُ كُلَّ سَفِیْنَةٍ غَصْبًا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن جبیر نے صحیحة پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عثمان بن عفان نے صالحة پڑھا ہے اور وراء اس کی اصل بمعنی خلف ہے۔ بعض مفسرین نے کہا: وہ پیچھے تھا اور ملاحوں نے اس بادشاہ کی طرف لوٹنا تھا۔ اکثر علماء نے کہا: یہاں وراء کا معنی امام ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن جبیر کی قرأت اس کی تائید کرتی ہے۔ وَكَانَ اَمَامَهُمْ مَلِكٌ یَاْخُذُ كُلَّ سَفِیْنَةٍ صَحِیْحَةٍ غَصْبًا۔ ابن عطیہ نے کہا: میرے نزدیک وَرَآءَهُمْ اپنے معنی میں ہے یہ اس طرح ہے کہ ان الفاظ میں زمانہ کی رعایت رکھی جاتی ہے پس جو حادث مقدم موجود ہے وہ پہلے ہے اور جو اسکے بعد آئے گا وہ وراء (پیچھے) ہے۔ یہ بادی النظر میں جو ظاہر ہوتا ہے اس کے خلاف ہے ان الفاظ میں ان کے مقامات پر غور کر جہاں یہ وارد ہیں تو تو ان کو عام پائے گا۔ اس آیت میں اس کا معنی یہ ہے کہ یہ لوگ اور ان کا عمل اور ان کی کوشش اس کے بعد اس بادشاہ کا غصب ہے اور جنہوں نے أمامهم پڑھا ہے انہوں نے جگہ کے اعتبار سے کہا ہے، یعنی وہ گویا ایک شہر کی طرف جائیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "الصلاة أمامك" (1) (نماز آگے پڑھیں گے) یہاں بھی مکان کا ارادہ کیا ہے۔ اس وقت میں ان کا ہونا زمانہ کے اعتبار سے نماز سے پہلے تھا۔ اس گفتگو میں غور کر یہ تجھے ان الفاظ کے استعمال کی پریشانی سے راحت دے گی۔ طبری کی کتاب میں قتادہ کا قول: وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ کے تحت واقع ہوا ہے۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی أمامهم ہے۔ آپ نہیں دیکھتے کیا مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ جَهَنَّمُ۔ یعنی ان کے آگے جہنم ہے۔ یہ قول درست نہیں ہے غیر فصیح قول ہے جس سے حسن بن ابی حسن نے اختلاف کیا ہے، یہ زجاج کا قول ہے (2)۔

میں کہتا ہوں: اس امام نے جو اختیار کیا ہے اس سے پہلے ابن عرفہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ ہروی نے کہا: ابن عرفہ نے کہا کہنے والا کہتا ہے: من وراءه کیسے کہا ہے؟ وہ اس کے آگے تھی، ابوعبیدہ اور ابو علی قطرب نے کہا: یہ لفظ اضداد میں سے ہے وراء، قدام کے معنی میں ہے یہ غیر محصل ہے کیونکہ أمام، وراء کی ضد ہے یہ اماکن اور اوقات میں استعمال کی صلاحیت

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، الجمع بین الصلاتین بالمزدلفة، جلد 1، صفحہ 227

2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 535

رکھتا ہے جیسے تیرا قول ہے: إذاوعد وعداً فی رجب لرمضان۔ پھر وہ کہے: ومن وراءك شعبان، تو جائز ہے، اگرچہ وہ اس سے آگے ہے کیونکہ وہ وعدہ کے وقت اس کو پیچھے کرتا ہے۔ قشیری نے بھی اس قول کی طرف اشارہ کیا ہے، فرمایا: یہ اوقات کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ آدمی کو امامك نہیں کہا جاتا کیونکہ وہ تیرے پیچھے ہے۔ فراء نے کہا: دوسرے علماء نے اس کو جائز قرار دیا ہے اس قوم کو بادشاہ کی خبر نہیں تھی اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کو خبر دی حتیٰ کہ انہوں نے کشتی کو عیب لگا دیا؛ یہ زجاج نے ذکر کیا ہے۔ ماوردی نے کہا: امام کی جگہ میں وراء کے استعمال میں اہل عربیہ کے تین اقوال ہیں: ا۔ اس کا استعمال ہر حال میں جائز ہے اور ہر مکان میں جائز ہے یہ اضداد میں سے ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ جَهَنَّمُ۔ یعنی أمامھم جھنم، شاعر نے کہا:

أترجو بنُو مَروانَ سمعِي وطاعتي	وقومي تميمٌ والفَلاةُ وَرَائِيا

یہاں بھی وراء، امام کے معنی میں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وراء، امام کی جگہ میں مواقیت اور زمانہ میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ انسان اس سے گزر جاتا ہے اور وہ اس کے پیچھے ہوتا ہے اور اسکے علاوہ جائز نہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ ان اجسام میں استعمال ہوتا ہے جن کا سامنا ہوتا ہے جیسے دو متقابل پتھر ان میں سے ہر ایک دوسرے کے پیچھے ہے، اور اس کے علاوہ میں جائز نہیں، یہ علی بن عیسیٰ کا قول ہے (1)۔

اس بادشاہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: ہُدد بن بُدد تھا بعض نے کہا: جلندی تھا، یہ سہیلی کا قول ہے۔ امام بخاری نے اس غصب کرنے والے بادشاہ کا ذکر کیا ہے فرمایا: وہ ہدد بن بدد تھا اور مقتول لڑکا، اس کا نام جیسور تھا ہم نے ''الجامع'' میں یزید مروزی کی روایت سے اسی طرح مقید کیا ہے اور اس روایت کے علاوہ میں حیسور (حاء کے ساتھ) ہے اور میرے پاس کتاب کے حاشیہ میں تیسری روایت ہے وہ حیسون ہے۔ وہ بادشاہ ہر اچھی کشتی غصب کر لیتا تھا اسی وجہ سے حضرت خضر علیہ السلام نے اسے عیب لگا دیا اور اس میں شگاف کر دیا، اس سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ مصلحت کے لیے کوئی عمل کرنا جائز ہے جب مصالح ثابت ہوں اور کل مال کی بعض مال کے افساد کے ساتھ اصلاح کرنا جائز ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ صحیح مسلم میں کشتی کو شگاف لگانے کی حکمت اس طرح بیان کی گئی ہے: جب وہ آئے گا جو اس کو قبضہ میں کرنا چاہتا ہو تو وہ اسے پھٹا ہوا پائے گا تو وہ اس سے آگے نکل جائے گا، پھر یہ لکڑی کے ساتھ اس کی اصلاح کر لیں گے (2)۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ تکالیف میں صبر کرنا چاہیے بہت سی ناپسندیدہ چیزوں میں فوائد ہوتے ہیں، اس ارشاد: وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (بقرہ: 216) کا یہی معنی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ صحیح حدیث میں ہے: ''اس پر کافر ہونے کی مہر لگائی گئی تھی'' (3)۔ یہ اس کی تائید کرتا ہے کہ وہ بالغ نہیں تھا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اس کے متعلق خبر ہو جبکہ وہ بالغ ہو، یہ مفہوم پہلے

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 6	2۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، فضائل خضر علیہ السلام، جلد 2، صفحہ 271

3۔ جامع ترمذی تفسیر سورۂ کہف، جلد 2، صفحہ 144

گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا بعض علماء نے فرمایا: یہ حضرت خضر علیہ السلام کے کلام سے ہے۔ سیاق کلام بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے یعنی ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ انہیں سرکشی اور کفر پر مجبور کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کے لیے اس جہت پر نفوس کے قتل میں اجتہاد کو مباح کر دیا تھا۔ بعض علماء نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت خضر علیہ السلام نے بیان کیا۔ طبری نے کہا: اس کا معنی ہے ہم نے جان لیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا معنی ہے ہم نے جان لیا۔ یہ اس طرح ہے جس طرح علم کو خوف سے تعبیر کیا جاتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ (بقرہ: 229)۔

حکایت ہے کہ حضرت ابی نے فَعَلِم ربك پڑھا ہے۔ بعض نے فرمایا: خشیت بمعنی کراہت ہے۔ کہا جاتا ہے: فرقت بینهما خشية أن يقتلا۔ یعنی لڑکے کی کراہت کی وجہ سے میں نے ان کے درمیان جدائی کر دی۔ ابن عطیہ نے کہا: میرے نزدیک اس تاویل کی توجیہ میں اظہر یہ ہے اگرچہ لفظ اس کی تائید نہیں کرتے کہ یہ استعارہ ہے یعنی مخلوق اور مخاطبین کے گمان پر اگر وہ اس کی حالت کو جان لیں انہیں والدین کو مجبور کرنے کا اندیشہ واقع ہو۔ حضرت ابن مسعود نے فخاف ربك پڑھا ہے یہ استعارہ میں واضح ہے اس کی نظیر قرآن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعل اور عسیٰ کا ذکر ہے۔ تمام ایسے حروف اور صیغے جن میں ترجی، توقع، خوف اور خشیت ہے وہ تمہارے اعتبار سے ہیں اے مخاطبو! يُّرْهِقَهُمَا کا معنی ہے وہ انہیں مجبور کرے گا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی محبت انہیں اس کی اتباع پر ڈالے گی پس وہ گمراہ ہو جائیں گے۔ فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا جمہور علماء نے باء کے فتحہ اور دال کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور عاصم نے باء کے سکون اور دال کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اسے بیٹا عطا فرمائے گا۔ خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً۔ جو دین اور صلاح کے اعتبار سے اس سے بہتر ہو، کہا جاتا ہے: بدل و أبدل جیسے مهل و أمهل، نزل و أنزل کہا جاتا ہے۔ وَّاَقْرَبَ رُحْمًا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، شاعر نے کہا:

وکیف بظلم جارية ومنها اللِّينُ والرُّحُمُ

باقی قراء نے حاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے: اسی سے رؤبہ بن عجاج کا قول ہے:

يامُنْزِلَ الرُّحْمِ على إدْرِيسَا ومُنْزِلَ اللَّعنِ على إبْلِيسَا(1)

ابوعمرو سے اختلاف مروی ہے۔ رحما معطوف ہے۔ زکاۃ پر اس کا معنی رحمۃ ہے کہا جاتا ہے: رَحِمه رَحمة و رُحْمًا، اس کا الف تانیث کے لیے ہے اس کا مذکر رُحم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: رحما بمعنی الرَحم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے واَوْصَل رُحْمًا پڑھا ہے یعنی رَحِمًا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ازکی منه بھی پڑھا ہے۔ ابن جبیر اور ابن جریج سے مروی ہے کہ ان والدین کو لڑکی بدلہ میں دی گئی۔ کلبی نے کہا: اس لڑکی سے ایک نبی نے نکاح کیا تھا پھر اس سے نبی پیدا ہوا تھا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 536

اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے ایک امت کو ہدایت دی تھی۔ قتادہ نے کہا: اس نے بارہ انبیاء کو جنم دیا تھا۔ ابن جریج سے مروی ہے کہ اس لڑکے کی ماں اس دن ایک مسلمان بچے کے ساتھ حاملہ تھی جس دن وہ قتل ہوا تھا اور مقتول لڑکا کافر تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: اس نے بچی جنم دی جس نے پھر نبی کو جنم دیا۔ ایک روایت میں ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کے بدلے میں بچی دی جس نے ستر انبیاء کو جنم دیا، اور یہ جعفر بن محمد نے اپنے باپ سے روایت کر کے کہا ہے: ہمارے علماء نے کہا یہ بعید ہے، انبیاء کی کثرت صرف بنی اسرائیل میں معروف ہے اور یہ عورت بنی اسرائیل میں نہ تھی۔ اس آیت سے مستنبط ہوتا ہے کہ اولاد کے مفقود ہونے کے ساتھ مصائب آسان ہوتے ہیں اگرچہ اولاد جگر کا ٹکڑا ہوتی ہے اور جو قضاء الٰہی کو تسلیم کرتا ہے اس کا انجام ید بیضا سے بھی روشن ہوتا ہے۔ قتادہ نے کہا: جب وہ بچہ پیدا ہوا تھا تو اس کے والدین خوش ہوئے تھے اور جب وہ قتل ہوا تھا تو پریشان ہوئے تھے۔ اگر وہ لڑکا باقی رہتا تو اس میں ان کی ہلاکت تھی، پس ہر شخص پر اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی ہونا واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا مومن کے حق میں کبھی ناپسندیدہ امر کا فیصلہ بہتر ہوتا ہے بنسبت اس کے جو وہ اس کے لیے اس کی پسند کا فیصلہ فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ۔(1) یہ لڑکے دونوں چھوٹے تھے کیونکہ یتیم کے ساتھ ان کی صفت بیان کی گئی ہے۔

ان کے نام اُصرام اور صریم تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یُتم بعد بلوغ "بلوغت کے بعد یتیمی نہیں ہے"۔ یہی ظاہر ہے۔ یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ ان پر شفقت کی بناء پر بعد از بلوغ یتیم کا لفظ بولا گیا ہو اگرچہ وہ یتیم نہ تھے(2)۔ یہ پہلے گزر چکا ہے کہ لوگوں میں یتیم وہ ہوتا ہے جس کا باپ فوت ہو جائے اور حیوانوں میں وہ ہوتا ہے جس کی ماں مرجائے۔ فِي الْمَدِيْنَةِ میں دلیل ہے کہ دیہات کو بھی مدینہ کہا جاتا ہے، اسی سے حدیث ہے أمرتُ بقرية تاكلُ القرىٰ(3) اور ہجرت کی حدیث میں ہے۔ لمن انت۔ تو اس شخص نے کہا: من أهل المدينه۔ یعنی مکہ سے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا، كَنْزٌ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، عکرمہ اور قتادہ نے کہا: وہ بہت بڑا مال تھا، یہ کنز کے اسم سے ظاہر ہے کیونکہ لغت میں مال مجموع کو کنز کہا جاتا ہے؛ اس کے متعلق کلام گزر چکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا یہ علم تھا جو مدفون صحیفوں میں تھا(4)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے فرمایا: وہ سونے کی تختی تھی جس پر یہ لکھا ہوا تھا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مجھے تعجب ہے اس شخص کے لیے جو تقدیر پر ایمان رکھتا ہے پھر وہ کیسے پریشان ہوتا ہے؟ مجھے تعجب ہے اس پر جو رزق پر ایمان رکھتا ہے پھر وہ کیسے تھکتا ہے؟ مجھے تعجب ہے اس پر جو موت پر ایمان رکھتا ہے پھر وہ کیسے خوش ہوتا ہے؟ مجھے تعجب ہے اس پر جو حساب پر ایمان رکھتا ہے پھر کیسے غافل ہوتا ہے؟ مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو اس کو جانتا ہے اور اس کے اپنے اہل کے ساتھ تبدیل ہونے کو بھی جانتا ہے پھر اس کے لیے مطمئن ہوتا ہے، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 537
2۔ سنن ابی داؤد، باب ماجاء متى ينقطع اليتم، حدیث 2489
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الوصایا، ماجاء متى ينقطع اليتم، جلد 2، صفحہ 41
4۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 9

عکرمہ اور عمر مولی غفرہ سے اسی طرح مروی ہے، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا سیاق کلام اور لفظ کا تقاضا یہ ہے کہ ان کا قریبی والد تھا (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ ان کا ساتواں دادا تھا؛ یہ جعفر بن محمد کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ دسواں دادا تھا اس کی وجہ سے ان کی حفاظت کی گئی اگرچہ وہ صلاح کے ساتھ مشہور نہ تھا، اسے کاشح کہا جاتا تھا؛ یہ مقاتل کا قول ہے۔ ان کی والدہ کا نام دینا تھا؛ یہ نقاش نے ذکر کیا ہے۔ اس میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ صالح شخص کی اپنی بھی حفاظت فرماتا ہے اور اس کی اولاد کی بھی حفاظت فرماتا ہے، اگرچہ وہ اس سے بہت دور کا رشتہ رکھتے ہوں۔ روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ صالح آدمی کی سات پشتوں تک حفاظت کرتا ہے، اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّ وَلِیِّ‌یَ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَ هُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ ۞ (الاعراف)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ۔ یہ اس بات کا مقتضی ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی تھے (2) ان کے بارے میں اختلاف گزر چکا ہے۔ ذٰلِكَ تَاْوِیْلُ یعنی تفسیر۔ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَیْهِ صَبْرًا ۞ ایک جماعت نے تستطع پڑھا ہے۔ جمہور علماء نے تسطع پڑھا ہے۔ ابو حاتم نے کہا: ہم مصحف کے خط میں اسی طرح پڑھتے تھے۔ یہاں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اگر کوئی کہنے والا کہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نوجوان کا ذکر نہ آیت کی ابتدا میں ہوا نہ آخر میں ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں اختلاف ہے۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نوجوان کا ذکر نہیں سنا گیا حالانکہ وہ ان کے ساتھ تھا، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: نوجوان نے پانی پیا تھا پس وہ ہمیشہ زندہ رہے گا اسے عالم نے پکڑا اور اس پر کشتی کو چسپاں کر دیا پھر اس دریا میں چھوڑ دیا وہ اس کے ساتھ قیامت تک دریا میں گھومتی رہے گی یہ اس لیے ہوا کہ اسے پانی پینا نہیں تھا، لیکن اس نے اس سے پانی پی لیا تھا۔ قشیری نے کہا: اگر یہ ثابت ہو تو پھر نوجوان یوشع بن نون نہ ہو کیونکہ یوشع بن نون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد زندہ رہے تھے اور ان کے خلیفہ تھے۔ اظہر یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نوجوان کو واپس بھیج دیا تھا جب ان کی حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہمارے شیخ امام ابو العباس نے کہا: یہ احتمال ہے کہ متبوع کے ذکر کی وجہ سے تابع کا ذکر چھوڑ دیا گیا ہو۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 2۔ اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ان لڑکوں کے خزانہ کو نکالنے کے واقعہ کو اللہ کی طرف کیسے منسوب کیا جبکہ انہوں نے کشتی کو شگاف لگانے کے بارے میں کہا فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَهَا عیب کی نسبت اپنی طرف کی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ دیوار میں ارادہ کو اللہ کی طرف منسوب کیا کیونکہ ایک لمبے زمانہ میں ایک نیا امر تھا اور غیوب میں سے ایک غیب تھا، پس اس جگہ صرف اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا ہی بہتر تھا، اگرچہ حضرت خضر علیہ السلام نے وہ ارادہ کیا تھا جو اللہ تعالیٰ نے اسے بتایا تھا کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: چونکہ یہ کام تمام خیر تھا تو اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی۔ اور کشتی کے عیب کو ادب کی رعایت کرتے ہوئے اپنی طرف منسوب کیا کیونکہ یہ عیب کا لفظ تھا پس انہوں نے ادب کا خیال کرتے ہوئے ارادہ کو اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا بلکہ اپنی طرف منسوب کیا جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ادب

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 537
2۔ ایضاً

کا خیال کرتے ہوئے کہا تھا: وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴿﴾ (الشعراء) پہلے اور بعد میں فعل کو اللہ کی طرف منسوب کیا اور اپنی طرف مرض کی نسبت کی کیونکہ اس میں نقص اور مصیبت کا معنی ہے، پس اللہ تعالیٰ کی طرف صرف وہی الفاظ منسوب کیے جاتے ہیں جو مستحسن ہوں۔ یہ ایسے ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بِيَدِكَ الْخَيْرُ (آل عمران: 26) خیر پر اکتفا فرمایا اور شر کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا اگرچہ خیر و شر، نقصان اور نفع اس کے ہاتھ میں ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہی ہر شی سے آگاہ ہے، اس پر اس حدیث سے اعتراض نہیں کیا جا سکتا جس میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا: اے ابن آدم! میں مریض تھا تو تو نے میری عیادت نہیں کی، میں نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا تو تو نے مجھے کھلایا نہیں تھا، میں نے تجھ سے پانی طلب کیا تھا تو تو نے مجھے پانی نہیں پلایا تھا" (1)۔ یہ خطاب میں تنزل اور عتاب میں تلطف ہے۔ اس کا مقصد ذی الجلال کی فضیلت کی پہچان ہے، اور ان پر اعمال کے ثواب کی مقادیر کی معرفت ہے؛ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کو شایان ہے کہ اپنے لیے جو چاہے بیان کرے اور ہمیں صرف اسی کی اجازت ہے جس میں اوصاف جمیلہ کا ذکر ہو اور افعال شریفہ کا بیان ہو۔ اللہ تعالیٰ نقائص اور آفات سے بلند و بالا ہے۔ لڑکے کے بارے میں فرمایا: فَاَرَدْنَآ قتل کی نسبت اپنی طرف کی اور تبدیلی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی، افضل کمال خلق اور کمال عقل ہے۔ سورۂ انعام میں اس کا معنی گزر چکا ہے۔ الحمد للہ۔

مسئلہ نمبر3۔ ہمارے شیخ ابو العباس نے فرمایا: زنادقہ باطنیہ قوم سلوک طریق کا نظریہ رکھتے ہیں جس سے احکام شرعیہ لازم ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: یہ احکام شرعیہ عامہ جو ہیں ان کے ساتھ حکم انبیاء اور عوام پر لگایا جاتا ہے۔ رہے اولیاء اور اہل خصوص وہ ان نصوص کے محتاج نہیں ہیں بلکہ ان سے وہی مراد ہوتا ہے جو ان کے دلوں میں واقع ہوتا ہے۔ اور ان پر اس کے ساتھ حکم لگایا جاتا ہے جو ان کے خواطر پر غالب آتا ہے، انہوں نے کہا: یہ اس لیے ہے کہ ان کے دل کدورتوں سے صاف ہوتے ہیں اور ان کے دل اغیار سے خالی ہوتے ہیں، اور ان کے لیے علوم الٰہیہ روشن ہوتے ہیں اور حقائق ربانیہ واضح ہوتے ہیں، وہ اسرار کائنات پر واقف ہوتے ہیں اور جزئیات کے احکام جانتے ہیں اس لیے وہ احکام شرعیہ کلیہ سے مستغنی ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت خضر علیہ السلام کے لیے اتفاق ہوا وہ علوم جو ان کے لیے روشن تھے ان کی وجہ سے وہ ان علوم سے مستغنی ہوئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس تھے اور یہ لوگ یہ حدیث اپنے اس نظریہ پر نقل کرتے ہیں "اپنے دل سے فتویٰ پوچھ اگرچہ مفتی تجھے فتویٰ دیں"۔ ہمارے شیخ نے فرمایا: یہ قول زندقہ اور کفر ہے، اس کے قائل کو قتل کیا جائے گا اور اس سے توبہ طلب نہیں کی جائے گی کیونکہ یہ معلوم شرائع کا انکار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت جاری فرمائی اور اپنی حکمت نافذ فرمائی ہے کہ اس کے احکام معلوم نہیں ہوتے ہیں مگر ان رسولوں کے واسطہ سے جو اس کے اور مخلوق کے درمیان سفیر ہوتے ہیں وہ اس کے پیغام اس کی طرف پہنچاتے ہیں اور وہ اس کی شریعت اور احکام بیان کرتے ہیں، اسی وجہ سے اس نے انہیں چنا ہے اور اس کے ساتھ انہیں خاص کیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب عیادۃ المریض، جلد 2، صفحہ 318

اللّٰہَ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ ۝ (الحج)

اور فرمایا: اَللّٰہُ اَعۡلَمُ حَیۡثُ یَجۡعَلُ رِسَالَتَہٗ (الانعام: 124) اور فرمایا: کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً ۟ فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیۡنَ وَ مُنۡذِرِیۡنَ (البقرہ: 213) اس کے علاوہ بھی آیات ہیں۔

بہر حال علم یقینی اور قطعی یقین اور سلف وخلف کا اس بات پر اجماع حاصل ہے کہ احکام الٰہیہ کی معرفت کا کوئی راستہ نہیں جو اس کے امر اور نہی پر مشتمل ہیں۔ اور ان میں سے کسی حکم کی پہچان نہیں ہو سکتی مگر رسولوں کی جہت سے۔ پس جو کہتا ہے کہ کوئی دوسرا طریقہ ہے جس سے امر و نہی کی پہچان بغیر رسولوں کے ہوتی ہے رسولوں کی جس میں ضرورت نہیں تو وہ کافر ہے، اسے قتل کیا جائے گا اور اس سے توبہ طلب نہیں کی جائے گی اور نہ اس کے ساتھ سوال وجواب کی ضرورت ہے۔ پھر یہ تو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دوسرے انبیاء کا اثبات ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے خاتم الانبیاء اور خاتم الرسل بنایا ہے۔ حالانکہ اس کے بعد نہ کوئی نبی ہے نہ رسول اس کا بیان یہ ہے کہ جو کہتا ہے کہ وہ اپنے دل سے احکام لیتا ہے جو اس کے دل میں واقع ہو گا وہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہو گا وہ اس کے مقتضا کے مطابق عمل کرے گا وہ اس کیفیت کے ساتھ کتاب وسنت کا محتاج نہیں تو اس نے خاص اپنے لیے نبوت ثابت کی کیونکہ یہ اس طرح ہے جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: کہ ”روح القدس نے میرے دل میں پھونکا“ ☆۔

مسئلہ نمبر 4۔ جمہور لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کا وصال ہو گیا ہے۔ اور ایک جماعت نے کہا: وہ زندہ ہیں کیونکہ آپ نے آب حیات کے چشمہ سے پانی پیا تھا۔ وہ زمین میں باقی ہیں اور وہ بیت اللہ کا حج کرتے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: اس مفہوم میں نقاش نے بڑی لمبی کلام کی ہے، انہوں نے اپنی کتاب میں بہت سی چیزیں حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ سے روایت کی ہیں۔ یہ تمام روایات کسی بنیاد پر مبنی نہیں۔ اگر حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہوتے اور حج کرتے تو ملت اسلامیہ میں ان کا ظہور ہوتا۔ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کی تفاصیل کو جاننے والا ہے اس کے علاوہ کوئی رب نہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام کے وصال پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے: أرأیتم لیلتکم ھذہ فإنہ لا یبقی ممن ھو الیوم علی ظھر الأرض أحد (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ امام بخاری کا مسلک ہے، قاضی ابو بکر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ صحیح قول دوسرا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں جیسا کہ ہم ذکر کریں گے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے فرمایا: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخر میں ایک رات عشاء کی نماز پڑھائی جب سلام پھیرا تو آپ کھڑے ہوئے اور فرمایا: ”تم اپنی اس رات کے بارے میں بتاؤ کہ اس سے سو سال کے آغاز پر جو سطح زمین پر ہے ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا“ (2)۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پر لوگ غلط تبصرے کرنے لگے، سو سال کے بارے میں مختلف باتیں کرنے لگے جو وہ کرتے تھے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو آج سطح زمین پر ہے اس میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا“ (3)۔ اس سے مراد یہ تھا کہ یہ قرن ختم ہو جائے گی۔ اس حدیث کو حضرت جابر بن عبداللہ نے بھی روایت کیا ہے

1۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، السمر فی العلم، جلد 1، صفحہ 22
2۔ کنز العمال، جلد 14، صفحہ 194، حدیث نمبر 38344
3۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، جلد 2، صفحہ 310
☆ شرح السنہ بغوی۔ 4110

فرمایا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وصال سے ایک مہینہ پہلے یہ کہتے ہوئے سنا: "تم مجھ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہو، اس کا علم اللہ کے پاس ہے اور میں اللہ کی قسم اٹھاتا ہوں! سطح زمین پر کوئی نفس رہنے والا نہیں ہوگا جس پر سو سال گزرے گا" دوسری روایت میں ہے سالم نے کہا: ہم نے ذکر کیا کہ جو اس دن پیدا ہو چکا ہے۔ ایک روایت میں ہے آج کوئی نفس ایسا نہیں جس پر سو سال آئے گا، اور وہ اس وقت زندہ ہوگا۔ عبدالرحمن صاحب السقایۃ نے اس کی تفسیر میں فرمایا: عمر کم ہوگی۔ حضرت ابوسعید خدری سے اس حدیث کی طرح مروی ہے۔ ہمارے علماء نے کہا: اس حدیث کے ضمن میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وصال سے ایک مہینہ پہلے خبر دی تھی کہ بنی آدم میں سے جو بھی موجود ہے اس کی عمر سو سال پر ختم ہو جائے گی کیونکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ما من نفس منفوسة** (1)۔ یہ لفظ ملائکہ اور جن کو شامل نہیں کیونکہ ان سے صحیح نہیں کہ وہ اس طرح ہیں اور نہ حیوان غیر عاقل شامل ہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ممن هو على ظهر الأرض أحد** (2)۔ یہ اصل وضع کے اعتبار سے ذوی العقول کے لیے بولا جاتا ہے پس تعین ہو گیا کہ مراد بنی آدم ہیں۔ حضرت ابن عمر نے اس معنی کو بیان کیا ہے فرمایا: اس سے مراد صدی کا ختم ہونا ہے۔ اس شخص کے لیے کوئی حجت نہیں جو اس شخص کے قول کے بطلان پر حجت پکڑتا ہے جو کہتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں کیونکہ **ما من نفس منفوسة** (3) میں عموم ہے چونکہ عموم اگرچہ استغراق کی تاکید کرتا ہے، لیکن اس میں نص نہیں ہوتا بلکہ وہ تخصیص کے قابل ہوتا ہے۔ پس یہ اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شامل نہیں ہے، کیونکہ وہ فوت ہوئے ہیں نہ قتل ہوئے ہیں، نص قرآنی کے ساتھ ان کا زندہ ہونا ثابت ہے، اور یہ عموم دجال کو بھی شامل نہیں حالانکہ وہ بھی زندہ تھا، اس کی دلیل حدیث الجساسہ ہے۔ اسی طرح یہ عموم حضرت خضر علیہ السلام کو بھی شامل نہیں۔ وہ لوگوں کو نظر نہیں آتے اور نہ ان کو نظر آتے ہیں جن لوگوں میں وہ جاتے ہیں تاکہ ان کے دل میں ایک دوسرے سے خطاب کے وقت خطرہ پیدا نہ ہو، اس عموم کی مثل ان کو شامل نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اصحاب کہف زندہ ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حج کرتے ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نوجوان جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول میں ہے جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا۔ ابو اسحاق ثعلبی نے (العرائس) میں ذکر کیا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی ہیں ان کو لمبی عمر دی گئی ہے، آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ محمد بن متوکل نے ضمرہ بن ربیعہ عن ابن شوذب کے سلسلہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت خضر علیہ السلام فارس کی اولاد سے تھے اور حضرت الیاس علیہ السلام بنی اسرائیل سے تھے، وہ ہر سال حج کے موقع پر آپس میں ملاقات کرتے ہیں۔ عمرو بن دینار سے مروی ہے فرمایا: حضرت خضر اور حضرت الیاس علیہما السلام زمین پر زندہ رہیں گے جب تک قرآن زمین پر موجود ہے، جب قرآن اٹھا لیا جائے گا وہ بھی فوت ہو جائیں گے۔ ہمارے شیخ امام ابو محمد عبدالمعطی بن محمد بن عبدالمعطی لخمی نے قشیری کے رسالہ کی شرح میں بہت سے نیک مردوں اور عورتوں کی حکایات ذکر کی ہیں کہ انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو دیکھا اور ان سے ملاقات کی جس کے مجموعہ سے ظن غالب یہی ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہیں نیز نقاش اور ثعلبی وغیرہ نے بھی یہ ذکر کیا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے "دجال شور یلی زمین پر پہنچے گا جو مدینہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، جلد 2، صفحہ 310 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

کے قریب ہوگی اس وقت اس کی طرف ایک شخص نکلے گا جو لوگوں سے بہتر ہوگا"۔ اس حدیث کے آخر میں ہے ابو اسحاق نے کہا: یعنی انّ ھذا الرجل ھو الخضر (1) (وہ شخص حضرت خضر ہوگا) ابن ابی الدنیا نے "الہواتف" میں ایک سند کے ساتھ ذکر کیا ہے جس کو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچایا ہے کہ وہ حضرت خضر علیہ السلام سے ملے اور انہوں نے آپ کو یہ دعا سکھائی اور اس میں اس شخص کے لیے بہت بڑے ثواب، مغفرت اور رحمت کا ذکر کیا ہے جو ہر نماز کے بعد اس کو پڑھے گا وہ دعا یہ ہے: یامن لا یشغلہ سمع عن سمع، ویامن لا تغلطہ المسائل، ویامن لا یتبرم من الحاح الملحین، اذقنی برد عفوک، وحلاوۃ مغفرتک (اے وہ ذات جس کو ایک آواز کا سننا دوسری آواز کے سننے سے غافل نہیں کرتا، اے وہ ذات مسائل جس سے غلطی نہیں کراتے، اے وہ ذات جو اصرار سے مانگنے والوں کے اصرار سے اکتاتی نہیں! تو مجھے اپنے عفو کی ٹھنڈک اور اپنی مغفرت کی حلاوت عطا فرما) انہوں نے حضرت عمر سے بھی بعینہ یہی دعا ذکر کی ہے جو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ذکر کی جو انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام سے سنی ہے، اسی طرح انہوں نے حضرت الیاس علیہ السلام کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہونا بھی ذکر کیا ہے۔ جب حضرت الیاس علیہ السلام کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک باقی ہونا جائز ہے تو حضرت خضر علیہ السلام کا باقی ہونا بھی جائز ہے۔ ابن ابی الدنیا نے ذکر کیا ہے کہ حضرت الیاس اور حضرت خضر علیہما السلام ہر سال بیت اللہ کے پاس ملتے ہیں اور جدائی کے وقت کہتے ہیں: ما شاء اللہ ما شاء اللہ، لا یصرف السوء الا اللہ، ما شاء اللہ ما شاء اللہ ما یکون من نعمۃ فمن اللہ ما شاء اللہ ما شاء اللہ توکلت علی اللہ حسبنا اللہ ونعم الوکیل (جو اللہ چاہے جو اللہ چاہے برائی اور تکلیف کو اللہ کے سوا کوئی نہیں پھیر سکتا، جو اللہ چاہے جو اللہ چاہے۔ ہر نعمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جو اللہ چاہے جو اللہ چاہے۔ میں اللہ پر بھروسہ رکھتا ہوں، ہمیں اللہ کافی ہے اور وہی بہتر کارساز ہے) رہی حضرت الیاس علیہ السلام کی خبر تو وہ سورۃ الصافات میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ابو عمر بن عبد البر نے کتاب "التمہید" میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اور کپڑے کے ساتھ آپ کو لپیٹا گیا تھا تو گھر کے ایک کونے سے ہاتف غیبی نے آواز دی لوگ اس کی آواز سنتے تھے اور اس شخصیت کو نہیں دیکھتے تھے: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ السلام علیکم اھل البیت۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ۔ انّ فی اللہ خلفا من کلّ ھالک وعوضا من کلّ تالف، وعزاء من کلّ مصیبۃ۔ فباللہ فثقوا، وایاہ فارجوا، فانّ المصاب من حُرم الثواب (اے اہل بیت! تم پر سلام ہو، ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پاس ہر جانے والے کا خلیفہ ہے اور تلف ہونے والے کا عوض ہے، ہر مصیبت سے تسلی ہے، اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو اور اس سے امید رکھو، مصیبت زدہ وہ ہے جو ثواب سے محروم کیا گیا) صحابہ کرام خیال کرتے تھے کہ یہ حضرت خضر علیہ السلام ہیں علی الارض میں الف، لام عہد کے لیے ہے جنس کے لیے نہیں ہے، اس سے مراد عرب کی زمین ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ ان کا آمیں تصرف تھا اور اس کی طرف لوٹنا تھا نہ کہ یاجوج وماجوج کی زمین اور نہ ہندوسندھ کے دور دراز علاقے جس کا نام بھی نہیں سنا گیا اور نہ اس کا علم ہوا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفتن، صفۃ الدجال، جلد 2، صفحہ 402

اور دجال کے بارے میں جواب نہیں۔

علامہ سہیلی نے کہا: حضرت خضر علیہ السلام کے نام کے بارے میں بڑا واضح اختلاف ہے۔ ابن منبہ سے مروی ہے انہوں نے کہا: ایلیا بن ملکان بن فالغ بن شالخ بن ارفحشد بن سام بن نوح۔ بعض علماء نے کہا: وہ ابن عامیل بن سماقحین ابن اُریا بن علقما بن عیصو بن اسحاق ہے، ان کا باپ ملیکا تھا اور ماں بنت فارس اس کا نام الھا تھا انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو ایک غار میں جنم دیا تھا وہاں ایک بکری تھی جو انہیں ہر روز دودھ پلاتی تھی وہ اس شہر کے ایک آدمی کی بکریوں میں سے تھی، اس شخص نے حضرت خضر علیہ السلام کو پکڑ لیا اور آپ کی پرورش کی جب جوان ہو گئے تو ملک جو حضرت خضر کا باپ ہے نے ایک کاتب بلایا اور اہل معرفت ونبالت کو جمع کیا تا کہ وہ صحیفے لکھے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت شیث علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے۔ جو کاتبوں میں اس کے سامنے آیا اس کا بیٹا خضر تھا، وہ اسے نہیں جانتا تھا، جب اس نے بہت اچھا لکھا تو اس نے اس کے بارے میں خوب چھان بین کی اسے پتا چلا کہ وہ اس کا بیٹا ہے تو اس نے اس کو اپنی قربت بخشی اور لوگوں کے امور کا والی بنا دیا پھر حضرت خضر علیہ السلام بادشاہ سے بھاگ گئے۔ ان اسباب کی وجہ سے جن کا ذکر بہت طویل ہے، حتی کہ وہ آب حیات کے چشمہ پر پہنچے اور اس کا پانی پیا پس وہ دجال کے نکلنے تک زندہ رہیں گے اور وہ شخص جس کو دجال قتل کرے گا اور پھر اسے کاٹ دے گا اور پھر اللہ تعالیٰ اسے زندہ کرے گا وہ حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ نہیں پایا اور یہ صحیح نہیں ہے۔ امام بخاری اور اہل حدیث کی ایک جماعت نے کہا جن میں سے ہمارے شیخ ابوبکر بن عربی رحمہ اللہ بھی ہیں کہ وہ سو سال ختم ہونے سے پہلے وصال کر گئے، اس کی وجہ یہ حدیث ہے: الی رأس مائۃ عام لا یبقی علی ھذہ الأرض فمن ھو علیھا أحد سو سال کے آغاز تک جو بھی اس زمین پر ہے ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے، یعنی جو زندہ تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلام فرمایا تھا۔

میں کہتا ہوں: ہم نے اس حدیث کا ذکر کیا اور اس پر کلام کی اور ہم نے حضرت خضر علیہ السلام کی زندگی اب تک کے لیے بیان کی۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت خضر علیہ السلام جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جدا ہونے لگے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا: مجھے وصیت فرمائیے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: تو مسکرانے والا ہو جا اور ہنسنے والا نہ ہو، لجاجت چھوڑ دے اور بغیر حاجت کے نہ چل۔ خطا کاروں پر ان کی خطاؤں کی وجہ سے عیب نہ لگا اور اے ابن عمران اپنی خطا پر رو۔

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَیْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝۸۳ اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِی الْاَرْضِ وَ اٰتَیْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا ۝۸۴ فَاَتْبَعَ سَبَبًا ۝۸۵ حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ وَّ وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ؕ۬ قُلْنَا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِیْهِمْ حُسْنًا ۝۸۶ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ

ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸۷﴾ وَ اَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨ الْحُسْنٰى ۚ وَ سَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ﴿۸۸﴾ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿۹۰﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَ قَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾

"اور وہ دریافت کرتے ہیں آپ سے ذی القرنین کے متعلق، فرمایئے: میں ابھی بیان کرتا ہوں تمہارے سامنے اس کا حال۔ ہم نے اقتدار بخشا تھا اسے زمین میں اور ہم نے دیا تھا اسے ہر چیز (تک رسائی حاصل کرنے) کا سازوسامان، پس وہ روانہ ہوا ایک راہ پر، یہاں تک کہ جب وہ غروب آفتاب کی جگہ پہنچا تو اس نے اسے یوں پایا گویا وہ ڈوب رہا ہے ایک سیاہ کیچڑ کے چشمہ میں اور اس نے وہاں ایک قوم پائی، ہم نے کہا: اے ذوالقرنین! (تمہیں اختیار ہے) خواہ تم انہیں سزا دو خواہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ ذوالقرنین نے کہا: جس نے ظلم (کفر و فسق) کیا تو ہم ضرور اسے سزا دیں گے پھر اسے لوٹا دیا جائے گا اس کے رب کی طرف تو وہ اسے عذاب دے گا بڑا ہی سخت عذاب۔ اور جو شخص ایمان لایا اور اچھے عمل کیے تو اس کے لیے اچھا معاوضہ ہے اور ہم اسے حکم دیں گے ایسے احکام بجالانے کا جو آسان ہوں گے۔ پھر وہ روانہ ہوا دوسرے راستہ پر، یہاں تک کہ جب وہ پہنچا طلوع آفتاب کے مقام پر تو اس نے پایا سورج کو کہ وہ طلوع ہو رہا ہے ایسی قوم پر کہ نہیں بنائی ہم نے ان کے لیے سورج (کی گرمی) سے بچنے کی آڑ، بات یونہی ہے، اور ہم نے احاطہ کر رکھا ہے ہر اس چیز کا جو اس کے پاس تھی"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ؕ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ﴿۸۳﴾ ابن اسحاق نے کہا: ذی القرنین کی خبر میں سے یہ ہے کہ انہیں وہ عطا کیا گیا جو کسی دوسرے کو عطا نہیں کیا گیا اس کے لیے اسباب اتنے کشادہ ہوئے کہ وہ زمین کے مشارق و مغارب کے شہروں تک پہنچا۔ وہ کسی زمین پر پہنچا تو اس پر غالب آگیا حتی کہ وہ مشرق و مغرب کے اس مقام پر پہنچا کہ جس کے بعد مخلوق نہیں ہے۔ ابن اسحاق نے کہا: مجھے اس شخص نے بتایا جو عجمیوں سے حکایات روایت کرتا ہے کہ وہ ذی القرنین کے بارے میں متواتر یہ علم رکھتے ہیں کہ وہ اہل مصر میں سے ایک شخص تھا جس کا نام مرزبان بن مردبہ یونانی تھا وہ یونان بن یافث بن نوح کی اولاد سے تھا۔ ابن ہشام نے کہا: اس کا نام اسکندر تھا، یہ وہی ہے جس نے اسکندریہ بنایا پس اس کی نسبت اس کی طرف کی گئی۔ ابن اسحاق نے کہا مجھے ثور بن یزید نے خالد بن معدان کلاعی سے روایت کر کے بتایا۔ خالد ایک شخص تھا جس نے لوگوں کو پایا کہ رسول اللہ ﷺ سے ذوالقرنین کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: "وہ بادشاہ تھا جس نے زمین کو نیچے سے چھوا اسباب کے ساتھ" (1)۔ خالد نے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو یا ذالقرنین کہتے

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 23

ہوئے سنا تو حضرت عمر نے کہا: اللهم غفراً أما رضيتم أن تسموا باسماء الانبياء حتى تسميتم باسماء الملائكة (اے اللہ معاف فرما کیا تم خوش نہیں ہو کہ تم انبیاء کے اسماء کے ساتھ نام رکھو حتی کہ تم نے ملائکہ کے اسماء کے ساتھ نام رکھ لیے) ابن اسحاق نے کہا: اللہ بہتر جانتا ہے وہ کون تھا کیا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا یا نہیں۔ حق یہ ہے کہ نہیں فرمایا تھا۔

میں کہتا ہوں: حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر کے قول کی مثل مروی ہے انہوں نے ایک شخص کو سنا جو دوسرے شخص کو آواز دے رہا تھا: اے ذوالقرنین! حضرت علی نے فرمایا: کیا تمہارے لیے کافی نہ تھا کہ تم نے انبیاء کرام کے نام کے ساتھ نام رکھے حتی کہ تم نے ملائکہ کے نام کے ساتھ نام رکھ لیے ہیں۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ صالح بادشاہ بندہ تھا، اللہ تعالیٰ کا مخلص تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تائید فرمائی۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ نبی تھے جو مبعوث کیے گئے تھے اللہ تعالیٰ نے اسے زمین کی فتح عطا فرمائی۔ دارقطنی نے کتاب الاخبار میں ذکر کیا ہے کہ ایک فرشتہ ہے جس کو رباقیل کہا جاتا ہے وہ ذی القرنین پر اترتا تھا یہ وہ فرشتہ ہے جو قیامت کے روز زمین کو لپیٹے گا اور اسے کم کرے گا۔ تمام لوگوں کے اقدام اس زمین پر واقع ہوں گے جیسا کہ بعض اہل علم نے ذکر کیا۔ سہیلی نے کہا: یہ وہ فرشتہ تھا جو ذی القرنین پر مقرر کیا گیا تھا جس نے زمین کے مشارق و مغارب کو طے کیا تھا جیسا کہ خالد بن سنان کا واقعہ ہے کہ ان کے لیے آگ کو مسخر کیا گیا تھا آگ پر متعین فرشتے کی حالت میں مشاکلت تھی وہ فرشتہ مالک ہے علیہ السلام وعلی جمیع الملائکۃ اجمعین۔ ابن ابی خیثمہ نے کتاب البدء میں خالد بن سنان کا ذکر کیا ہے اور اس کی نبوت کا ذکر کیا ہے۔ خازن النار مالک فرشتہ کو اس پر مقرر کیا گیا تھا (یعنی اس کے ذریعے اس کی تائید کی جاتی تھی) اس کی نبوت کی علامتوں میں سے یہ تھا کہ ایک آگ کو نار الحدثان کہا جاتا تھا وہ لوگوں پر ایک غار سے نکلتی تھی اور لوگوں کو جلا دیتی تھی لوگ اس کو دور نہیں کر سکتے تھے، خالد بن سنان نے اس کو لوٹایا تو وہ پھر کبھی نہ نکلی۔

ذی القرنین کے نام میں اور اس سبب میں بہت زیادہ اختلاف ہے جس کی وجہ سے اسے یہ نام دیا گیا رہا اس کا نام تو بعض نے کہا: وہ اسکندر بادشاہ یونانی مقدونی ہے، کبھی قاف مشدد کہا جاتا ہے، المقدونی کہا جاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا نام ہرمس ہے۔ بعض نے کہا اس کا نام ہردیس ہے۔ ابن ہشام نے کہا: وہ صعب بن ذی یزن حمیری ہے جو وائل بن حمیر کی اولاد سے تھا، ابن اسحاق کا قول پہلے گزر چکا ہے۔ وہب بن منبہ نے کہا: وہ رومی ہے۔ طبری نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث ذکر کی ہے کہ ذی القرنین روم کا ایک نوجوان تھا (1)۔ اس حدیث کی سند انتہائی کمزور ہے: یہ ابن عطیہ کا قول ہے۔ سہیلی نے کہا: علم الاخبار سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دو شخص تھے ایک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہ شخص تھا جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے فیصلہ کیا تھا جب وہ بئر السبع کے بارے میں شام میں فیصلہ اس کے پاس لے گئے تھے۔ دوسرا شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھا۔ بعض نے فرمایا: وہ افریدون تھا جس نے عہد ابراہیم میں بیوراسب بن اروند اسب سرکش بادشاہ کو قتل کیا تھا یا اس سے پہلے کچھ زمانہ تھا۔ رہا اس سبب میں اختلاف جس کی وجہ سے ذوالقرنین کہا جاتا ہے۔ تو بعض نے کہا: اس کے بالوں کی دو مینڈھیاں تھیں ان کی وجہ سے ذوالقرنین کہا جاتا ہے؛ یہ ثعلبی

1۔ تفسیر طبری، جز 16، 15 صفحہ 24

وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ الضفائر، سر کے بالوں کی مینڈھیوں کو کہتے ہیں، شاعر نے کہا:

فَلَثَمْتُ فَاهَا آخِذًا بِقُرُونِهَا　شُرْبَ النَّزِيفِ بِبَرْدِ مَاءِ الحَشْرَجِ

بعض علماء نے فرمایا: اس نے اپنی بادشاہی کے آغاز میں خواب دیکھا کہ وہ سورج کے دونوں قرن پر قابض ہے (1) اس نے یہ خواب بیان کیا تو اس کی تعبیر یہ بتائی گئی کہ وہ ہر اس جگہ پر غالب آئے گا جس پر سورج طلوع ہوتا ہے، اسی وجہ سے اسے ذوالقرنین کہا جاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اسے یہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ مغرب و مشرق تک پہنچا گویا اس نے دنیا کے دونوں کناروں کو جمع کر لیا۔ ایک جماعت نے کہا: جب وہ سورج کے طلوع ہونے کی جگہ پہنچا تو اس کے دیکھنے کے ساتھ سورج کے قرون ظاہر ہوئے اسی وجہ سے اسے ذوالقرنین کہا جاتا ہے۔ سورج کے ساتھ شیطان کے قرن (سینگ) دیکھے۔ وہب بن منبہ نے کہا اس کے عمامہ کے نیچے دو سینگ تھے۔ ابن الکواء نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ذی القرنین کے متعلق پوچھا کہ وہ نبی تھے یا بادشاہ؟ حضرت علی نے فرمایا: نہ نبی تھا نہ بادشاہ، وہ الله کا نیک بندہ تھا اس نے اپنی قوم کو الله تعالیٰ کی توحید کی طرف بلایا تھا تو انہوں نے اس کا سر زخمی کر دیا پھر انہوں نے دعوت دی تو لوگوں نے سر کی دوسری طرف بھی زخمی کر دی اسی وجہ سے اسے ذوالقرنین کہا جاتا ہے۔ اس کے زمانہ کے بارے میں بھی اختلاف ہے، ایک قوم نے کہا: وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد تھے ایک قوم نے کہا: وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد فترت کے زمانہ میں تھے۔ بعض نے کہا: وہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے زمانہ میں تھے اور حضرت خضر علیہ السلام ان کا بڑا جھنڈا اٹھانے والے تھے۔ اس نے اس کا ذکر سورۂ بقرہ میں کیا ہے۔ بہر حال الله تعالیٰ نے اسے اقتدار بخشا اور سلطنت بخشی اور بادشاہوں نے اس کی اطاعت کی، روایت ہے کہ تمام دنیا کے چار بادشاہ تھے (2)، دو مومن تھے دو کافر تھے، مومن حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام اور اسکندر تھے اور کافر نمرود اور بخت نصر تھے اور پانچواں اس امت سے مالک ہوگا کیونکہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (التوبہ:33) اور وہ مہدی علیہ السلام ہوں گے۔ بعض علماء نے فرمایا ان کو ذوالقرنین اس لیے کہا جاتا تھا کیونکہ وہ باپ اور ماں دونوں کی طرف سے کریم الطرفین تھا (یعنی اس کے والدین کے خاندان اعلیٰ حسب و نسب والے تھے) بعض علماء نے فرمایا: اس کے وقت میں لوگوں کی دو نسلیں گزریں جبکہ وہ زندہ تھا اس لیے اسے ذوالقرنین کہا جاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس لیے یہ نام تھا کہ وہ جب لڑتا تھا تو ہاتھوں اور رکابوں دونوں سے لڑتا تھا۔ بعض نے فرمایا: اس لیے کہ اسے علم ظاہر اور علم باطن دیا گیا تھا۔ بعض نے فرمایا: وہ ظلمت و نور میں داخل ہوا تھا۔ بعض نے فرمایا: وہ فارس و روم کا بادشاہ تھا۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کے لیے بادل کو مسخر کیا گیا تھا اور اس کے لیے اسباب پھیلائے گئے تھے اور اس کے لیے نور کشادہ کیا گیا تھا اس پر رات اور دن برابر تھا۔ حضرت عقبہ بن عامر کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب کے کچھ لوگوں کو کہا جنہوں نے آپ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھا تھا فرمایا: "ابتدا میں وہ رومیوں میں سے ایک جوان تھا، پھر اسے بادشاہی عطا کی گئی وہ چلا حتیٰ کہ وہ مصر کی زمین پر آیا وہاں اس نے ایک شہر بنایا جسے اسکندریہ کہا جاتا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 538　2۔ ایضاً

ہے۔ جب وہ فارغ ہوا تو اس کے پاس ایک فرشتہ آیا وہ اسے اوپر لے گیا اس نے اسے کہا: اپنے نیچے دیکھ، اس نے کہا: میں صرف اپنا شہر دیکھتا ہوں اس کے علاوہ کچھ نہیں دیکھتا۔ اس فرشتے نے اسے کہا: یہ ساری زمین ہے اور اس کے ارد گرد جو تو سیاہی دیکھ رہا ہے یہ سمندر ہے، اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ تجھے زمین دکھائے اس نے تیرے لیے اس میں بادشاہی قائم کی ہے پس تو اس میں چل اور جاہل کو تعلیم دے اور عالم کو پختہ کر" (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاٰتَیْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ہر چیز کا علم عطا فرمایا جس کام کا ارادہ کرتے علم اس کا سبب بنتا۔ حسن نے کہا: جہاں کا ارادہ کرتے وہاں پہنچنا مراد ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ہر وہ چیز بخشی جس کے ساتھ مخلوق کو ضرورت ہوتی ہے۔ بعض نے فرمایا: ہر وہ چیز بخشی جس کے ساتھ بادشاہ مدد حاصل کرتے ہیں، شہروں کی فتح، دشمنوں پر غلبہ وغیرہ۔ السبب کا اصل معنی رسی ہے پھر استعارۃً ہر اس چیز کے لیے استعمال کیا گیا جس کے ذریعے کسی چیز تک پہنچا جاتا ہے۔ فَاَتْبَعَ سَبَبًا۔ ابن عامر، عاصم، حمزہ اور کسائی نے فاتبع ہمزہ قطعی کے ساتھ پڑھا ہے۔ اہل مدینہ اور ابو عمرو نے فاتبع سببا ہمزہ وصلی کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی جو اسباب اسے دیے گئے تھے اس کو استعمال کیا۔ اخفش نے کہا: تبعته و أتبعته ایک معنی میں ہیں جیسے ردفته اور أردفته ایک معنی میں ہیں، اسی سے یہ ارشاد بھی ہے: اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝ (الصافات)

اسی سے کلام میں الاتباع ہے جیسے حَسَنٌ بَسَنٌ اور قبیح شَقِیح۔ ابو عبیدہ نے اہل کوفہ کی قرات کو پسند کیا فرمایا: کیونکہ یہ سیر (چلنے) سے ہے۔ ابو عبیدہ اور اصمعی نے حکایت کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: تبعه و اتبعه جب کوئی کسی کے پیچھے چلے اور اس کو پہنچ نہ پائے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا: اس کی مثل ہے: فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِیْنَ ۝ (الشعراء)

نحاس نے کہا: یہ تفریق ہے اگرچہ اس کو اصمعی نے بیان کیا ہے مگر بغیر علت اور دلیل کے قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِیْنَ ۝ (الشعراء) حدیث میں نہیں ہے کہ وہ ان کو ملے تھے۔ حدیث میں ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی دریا سے نکل گئے اور فرعون اور اس کے ساتھی دریا میں داخل ہوئے تو دریا ان کے اوپر مل گیا۔ اس میں حق یہ ہے کہ تبع، أتبع اور اتبع سب لغات ہم معنی ہیں، یہ السیر کے معنی میں ہیں۔ اس کے ساتھ لاحق ہونا ہے اور لاحق نہ ہونا دونوں جائز ہیں۔ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے حامیة پڑھا ہے، جس کا معنی ہے گرم اور باقی قراء نے حمئة پڑھا ہے، جس کا معنی ہے سیاہ مٹی۔ تو کہتا ہے: حمأت البئر حمأ (میم کی تسکین کے ساتھ) تو اس کا معنی ہے کنویں کی مٹی زیادہ ہوگئی اور حامیة بھی جائز ہے۔ اور یہ الحماۃ سے ہوگا ہمزہ میں تخفیف کی گئی اور یاء سے بدلا گیا ہوگا۔ دونوں قراءتوں کو کبھی جمع کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: وہ مٹی گرم تھی اور سیاہی والی تھی۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو نے کہا (2): نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج کی طرف دیکھا جب وہ غروب ہو رہا تھا فرمایا: نار اللہ الحامیه لولا یزعها من أمر اللہ لأحرقت ما علی الأرض (اللہ تعالیٰ کی گرم آگ ہے، اگر اسے اللہ کا امر نہ روکتا تو یہ جو کچھ

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 368　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 539

زمین پر ہے اسے جلا دیتی) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ابی نے مجھے یہ اسی طرح پڑھایا جس طرح انہیں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھایا تھا۔ فِی عَیْنٍ حَمِئَةٍ(1)۔ اور حضرت معاویہ نے کہا: یہ حامیة ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص نے کہا: میں امیر المومنین کے ساتھ تھا پس انہوں نے کعب کو اپنا حکم بنایا انہوں نے کہا: اے کعب! تم یہ تورات میں کیسے پاتے ہو؟ انہوں نے کہا: میں اسے پاتا ہوں کہ یہ سیاہ چشمے میں غروب ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کی موافقت کی۔ شاعر نے کہا: وہ تبع الیمانی ہے۔

قد کان ذوالقرنین قبلی مسلمًا مَلِکًا تدینُ له الملوکُ و تسجدُ(2)

بلغ المغاربَ والمشارق یبتغِی أسبابَ أمرٍ من حکیم مُرْشِدِ

فرأی مغیبَ الشمسِ عند غروبها فی عینِ ذِی خُلُبٍ وثَأْطٍ حَرْمَدِ

الخلب سے مراد مٹی ہے۔ الثأط سے مراد سیاہ مٹی ہے۔ الحرمد سے مراد بھی سیاہ ہے۔ قفال نے کہا: بعض علماء نے فرمایا اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ سورج کے مغرب و مشرق تک پہنچا حتی کہ اس نے اس کے جرم کو چھوا کیونکہ وہ آسمان کے ساتھ زمین کے اردگرد گھومتا ہے بغیر اس کے کہ وہ زمین سے ملے، یہ اس سے بہت بڑا ہے کہ وہ زمین کے چشموں میں سے کسی چشمہ میں داخل ہو بلکہ یہ زمین سے کئی گنا بڑا ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ مغرب کی جہت کی آخری آبادی اور مشرق کی جہت کی آخری آبادی۔ پس اسے آنکھ سے ایسے نظر آیا کہ وہ سیاہ چشمہ میں داخل ہو رہا ہے جیسے ہم اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ زمین میں داخل ہو رہا ہے، اسی وجہ سے فرمایا: وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝

اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ ان پر طلوع ہوتا تھا تو وہ انہیں چھوتا تھا اور ان سے ملا ہوتا تھا بلکہ یہ مراد ہے کہ پہلے ان پر طلوع ہوتا تھا۔ قفیبی نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ یہ چشمہ سمندر سے ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ سورج اس کے پیچھے یا اس کے ساتھ یا اس کے پاس غروب ہوتا ہو، پس صفت کے حرف کو موصوف کے قائم مقام رکھا گیا ہو۔ واللہ اعلم۔

وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا یعنی اس چشمہ کے پاس یا چشمہ کی انتہا کے پاس۔ یہ اہل جابرس تھے انہیں سریانی زبان میں جرجیسا کہا جاتا ہے، اس چشمہ پر قوم ثمود کی نسل سے کچھ لوگ موجود تھے یہ ان کے باقی ماندہ لوگ تھے جو حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لائے تھے۔ سہیلی نے ذکر کیا ہے: وہب بن منبہ نے کہا ذوالقرنین روم کی بوڑھیوں میں سے ایک بوڑھی کا بیٹا تھا جس کی ذوالقرنین کے علاوہ کوئی اولاد نہ تھی، اس کا نام اسکندر تھا جب وہ بالغ ہوا تو وہ نیک بندہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ذوالقرنین! میں تجھے زمین کی امتوں کی طرف بھیجنے والا ہوں، ان امتوں کی زبانیں مختلف ہیں وہ ساری زمین کی امتیں ہیں اور وہ کئی اقسام پر ہیں۔ دو امتیں ہیں جس کے درمیان ساری زمین کا طول ہے۔ دو امتیں ایسی ہیں جن کے درمیان ساری زمین کا عرض ہے اور کچھ امتیں زمین کے وسط میں ہیں ان میں سے جن، انس اور یاجوج وماجوج ہیں اور وہ دو امتیں جن کے درمیان زمین کا طول ہے ان میں سے ایک امت سورج کے غروب ہونے کی جگہ کے پاس ہے اسے ناسک کہا جاتا ہے۔ اور

1۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ الکہف، حدیث 2858
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 539

دوسری امت سورج کے طلوع ہونے کی جگہ کے پاس ہے اسے منسک کہا جاتا ہے۔ اور وہ دو امتیں جن کے درمیان زمین کا عرض ہے ان میں سے ایک زمین کے دائیں قطر میں ہے اسے ہاویل کہا جاتا ہے اور دوسری امت زمین کے بائیں قطر میں ہے اسے تاویل کہا جاتا ہے۔ ذوالقرنین نے کہا: اے اللہ! تو نے مجھے ایک عظیم کام کی طرف بلایا ہے جس پر صرف تو ہی قادر ہے، تو مجھے ان امتوں کے بارے بتا کہ میں کس قوت کے ساتھ ان پر زیادتی کروں اور کس صبر کے ساتھ میں انہیں برداشت کروں اور کس زبان کے ساتھ میں ان سے کلام کروں، میں کیسے ان کی زبان سمجھوں گا جب کہ میرے پاس قوت نہیں ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تجھ پر بوجھ ڈال رہا ہوں اس کے ساتھ میں تجھے کامیاب کروں گا تیرا سینہ تیرے لیے کھول دوں گا تو ہر چیز کو سنے گا اور تیرے لیے تیرے فہم کو پختہ کروں گا تو ہر چیز کو سمجھ لے گا اور تجھ میں ہیبت دوں گا کوئی چیز تجھے نہیں ڈرائے گی اور میں تیرے لیے نور اور ظلمت مسخر کروں گا، پس وہ تیرے لشکروں میں سے لشکر ہوں گے، نور تیرے آگے سے راہنمائی کرے گا اور پیچھے سے تاریکی تیری حفاظت کرے گی۔ جب اسے یہ کہا گیا تو وہ اپنے متبعین کو ساتھ لیکر چلا پس پہلے وہ اس امت کی طرف چلا جو سورج کے غروب ہونے کی جگہ کے پاس تھی کیونکہ وہ قریب ترین امت تھی اور وہ ناسک امت تھی وہ اتنے زیادہ تھے کہ ان کو شمار نہیں کرسکتا تھا مگر اللہ تعالیٰ اور ایسی قوت تھی کہ اس کی طاقت نہیں رکھتا مگر اللہ اور ان کی مختلف زبانیں تھیں اور مختلف خواہشات۔ تو ظلمت کے ساتھ ان پر حملہ کیا ان کے اردگرد تاریکی کے تین لشکر لگائے جنہوں نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا حتیٰ کہ تاریکی نے انہیں ایک مکان میں جمع کردیا پھر وہ ان پر نور کے ساتھ داخل ہوا پھر انہیں اللہ تعالیٰ اور اس کی عبادت کی طرف بلایا۔ بعض ان میں سے ایمان لے آئے اور بعض نے انکار کیا، پھر منکرین پر ظلمت کو داخل کیا جس نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا حتیٰ کہ وہ ان کے مونہوں، ناکوں، آنکھوں اور گھروں میں داخل ہوگئی اور انہیں ہر طرف سے گھیر لیا پس وہ حیران ہوگئے اور گھومنے لگے اور ہلاکت کا خوف کرنے لگے۔ پس وہ ایک آواز کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر ایمان لے آئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان سے تاریکی ختم کردی اور انہیں سختی سے پکڑ لیا اور وہ دعوت الہیہ میں داخل ہوگئے۔

پس انہوں نے اہل مغرب سے ایک لشکر بنایا اور انہیں ایک لشکر بنایا پھر وہ ان کی قیادت کرتا ہوا چلا تاریکی ان کے پیچھے چلتی تھی اور پیچھے سے حفاظت کرتی تھی، نور آگے سے قیادت کرتا تھا اور راہنمائی کرتا تھا پھر وہ چلا زمین کی دائیں جانب کی طرف وہ اس امت کا ارادہ کرتا تھا جو زمین کی دائیں جانب تھی اور وہ امت ہاویل تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس کے ہاتھ، دل، عقل اور فکر کو مسخر کردیا تھا وہ جب بھی کوئی کام کرتا تھا تو غلطی نہیں کرتا تھا جب وہ کسی حوض یا دریا پر آتے تھے تو چھوٹی چھوٹی تختیوں سے جوتیوں کی مثل کشتیاں بناتا پھر انہیں ایک ساعت میں منظم کردیتا پھر جتنے لوگ ساتھ ہوتے ان میں سوار کردیتا جب وہ دریاؤں اور انہار کو طے کرلیتا تو ان کشتیوں کو توڑ دیتا اور ہر شخص کو ایک تختہ دے دیتا پس وہ ان کو اٹھانے پر کوئی بوجھ محسوس نہ کرتا، پس وہ ہاویل تک پہنچا اس نے ان کے ساتھ بھی اسی طرح کیا جس طرح اس نے ناسک قوم کے ساتھ کیا تھا وہ ایمان لے آئے پھر ان سے فارغ ہوا تو لشکر زمین کی دوسری طرف چلا حتیٰ کہ منسک امت تک پہنچا جو سورج کے طلوع ہونے کی جگہ کے پاس تھی پھر اس نے اس میں بھی عمل کیا اور ان سے اسی طرح لشکر تیار کیا جس طرح پہلی امت میں کیا تھا۔ پھر وہ زمین کی

بائیں جانب کی طرف پلٹا وہ تاویل قوم کا ارادہ کرتا تھا یہ وہ امت تھی جو ہاویل کے مقابل تھی ان کے درمیان زمین کا عرض تھا۔ اس نے اس میں بھی ایسا ہی کیا جیسے پہلی قوم میں کیا تھا۔ پھر ان امتوں کی طرف پلٹا جو زمین کے وسط میں تھیں یعنی جن، انس اور یاجوج و ماجوج جب وہ راستہ میں تھا جو مشرقی جانب ترکوں کے اختتام سے ملی ہوئی جگہ ہے تو اسے انسانوں کے ایک نیک گروہ نے کہا: اے ذوالقرنین! ان دو پہاڑوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے جو بے شمار ہے ان میں انسان سے مشابہت نہیں ہے وہ جانوروں کے مشابہ ہیں، گھاس کھاتے ہیں اور جانوروں اور وحشیوں کو اس طرح چیرتے پھاڑتے ہیں جس طرح درندے چیرتے پھاڑتے ہیں وہ زمین کے حشرات سانپ، بچھو، چھپکلی اور ہر ذی روح کو کھاتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے زمین میں پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کوئی مخلوق ایسی نہیں جو سال میں اتنی بڑھتی ہو جتنا کہ وہ بڑھتے ہیں۔ اگر وقت زیادہ گزر گیا تو وہ زمین کو بھر دیں گے اور لوگوں کو زمین سے نکال دیں گے کیا ہم آپ کے لیے خراج مقرر کریں، اس بناء پر تو ہمارے اور ان کے درمیان دیوار بنا دے، پھر حدیث مکمل ذکر کی۔ آئندہ یاجوج و ماجوج اور ترک کا ذکر آئے گا کہ وہ ان کی ایک قوم ہے اور وہ بیان کفایت کرے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ۔ قشیری ابونصر نے کہا: اگر وہ نبی تھا تو یہ وحی تھی، اگر وہ نبی نہیں تھا تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام تھا۔ اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا۝ ابراہیم بن سری نے کہا: ان دو چیزوں میں اسے اختیار دیا گیا تھا جس طرح حضرت محمد ﷺ کو اختیار دیا گیا تھا، فرمایا: فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ (المائدہ: 42) ابو اسحاق زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے اسے ان دو حکموں میں اختیار دیا ہے۔ نحاس نے کہا: علی بن سلیمان نے اس کا قول رد کیا ہے کیونکہ یہ صحیح نہیں ہے کہ ذوالقرنین نبی تھا اور اس کے ساتھ اس کو خطاب کیا جاتا تھا۔ وہ اپنے رب کو کیسے کہتا تھا: ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ؟ اور کیسے کہتا تھا: فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ؟ وہ نون یعنی جمع کے صیغہ کے ساتھ کیسے اس سے مخاطب ہوتا تھا؟ فرمایا: اس کی تقدیر اس طرح ہے کہ قلنا یا محمد قالوا یا ذالقرنین۔ ابوجعفر نے کہا: یہ ابوالحسن نے کہا ہے اور اس سے کوئی چیز لازم نہیں آتی۔ رہا یہ قول: قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ یہ بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت کے نبی کی زبان پر اسے خطاب کیا ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ اسے اس طرح فرمایا ہو جس طرح ہمارے نبی ﷺ کو فرمایا: فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (محمد: 4) رہا یہ اشکال: فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ تو اس کی تقدیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اسے اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ کے قول میں قتل کرنے اور اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا میں ان کو باقی رکھنے کے درمیان اختیار دیا تو انہوں نے اس قوم سے کہا: اَمَّا مَنْ ظَلَمَ۔ یعنی جو تم میں سے کفر پر قائم رہا فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ہم اسے قتل کے ساتھ عذاب دیں گے۔ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ۔ پھر قیامت کے دن اپنے رب کی طرف لوٹایا جائے گا۔ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا۔ تو وہ اسے جہنم میں سخت عذاب دے گا۔ فَاَمَّا مَنْ تَابَ (القصص: 67) اور جو کفر سے توبہ کرے گا وَ عَمِلَ صَالِحًا اور نیک عمل کرے گا۔ احمد بن یحییٰ نے کہا: ''ان'' اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا۔ میں محل نصب میں ہے اگر تو اسے رفع دے تو بھی درست ہے تو بمعنی اما ھو ہوگا جیسا کہ شاعر نے کہا:

فسیرا فاما حاجة تقضیانها واما مقیلٌ صالح وصدیق

فَلَهٗ جَزَآءَ ٗ الْحُسْنٰی۔ اہل مدینہ، ابو عمرو اور عاصم کی قرأت فله جزاء الحسنیٰ۔ مبتدا کی بناء پر رفع کے ساتھ ہے
استقرار کے ساتھ ہے اور الحسنیٰ اضافت کی وجہ سے محل جر میں ہے اور تنوین اضافت کی وجہ سے حذف کی گئی ہے یعنی اس
کے لیے آخر میں اللہ کی بارگاہ میں جزاء الحسنیٰ ہے اور وہ جنت ہے، جزاء کو جنت کی طرف مضاف کیا۔ جیسے فرمایا: حَقُّ
الْيَقِيْنِ ۝ (الواقعہ) اور فرمایا: وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ (یوسف: 109) اور یہ بھی احتمال ہے کہ الحسنیٰ سے مراد اعمال صالح
ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ جزاء، ذی القرنین کی طرف سے ہو یعنی میں اسے عطا کروں گا اور اس پر مہربانی کروں گا اور یہ بھی
جائز ہے کہ التقاء ساکنین کی وجہ سے تنوین حذف کی گئی ہو اور الحسنیٰ بدل کی بناء پر محل رفع میں ہو یہ بصریوں کے نزدیک
ہے اور کوفیوں کے نزدیک ترجمہ کی بنا پر ہے۔ ابن ابی اسحاق کی قرأت اس بناء پر ہے۔ فله جزاء الحسنیٰ منصوب اور تنوین
کے ساتھ پڑھا ہے یعنی فله الحسنیٰ جزاء۔ الفراء نے کہا: جزاء تمیز کی بنا پر منصوب ہے۔ بعض نے فرمایا: مصدر کی بنا پر
منصوب ہے۔ الزجاج نے کہا یہ مصدر حال کی جگہ میں ہے یعنی مجزیا بها جزاء۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مسروق نے
فله جزاء الحسنیٰ منصوب بغیر تنوین کے پڑھا ہے؛ یہ ابو حاتم کے نزدیک ہے۔ اور تنوین کا حذف التقاء ساکنین کی وجہ سے
ہے جیسے فله جزاء الحسنیٰ رفع میں ایک وجہ کے اعتبار سے۔ نحاس نے کہا: دوسروں کے نزدیک یہ خطا ہے کیونکہ یہ التقاء
ساکنین کی وجہ سے تنوین کے حذف کی جگہ نہیں ہے اس کی تقدیر ہوگی: فله الثواب جزاء الحسنیٰ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ اس کا معنی گزر چکا ہے کہ اتبع اور اتبع کا معنی ایک ہے یعنی وہ راستے اور منزل
کی طرف چلا۔ حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ مجاہد اور ابن محیصن نے میم اور لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، کہا جاتا ہے:
طَلَعَتِ الشَّمْسُ والکواکبُ طُلُوعًا ومَطْلِعًا، المطلَع والمطلِع۔ طلوع ہونے کی جگہ؛ یہ جوہری کا قول ہے اس کا معنی ہے وہ
ایسی قوم کی جگہ پہنچا کہ ان کے اور سورج کے طلوع ہونے کے درمیان کوئی شخص نہیں تھا۔ سورج کے پیچھے بہت زیادہ مسافت
سے طلوع ہوتا تھا یعنی معنی ہے اس قول کا بھی: وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ۔ ان کے بارے میں اختلاف ہے، وہب بن منبہ سے
وہی مروی ہے جو پہلے گزر چکا ہے: یہ ایک امت ہے جسے منسک کہا جاتا ہے یہ ناسک کے مقابل تھی؛ یہ مقاتل کا قول ہے۔ قتادہ
نے کہا: اس کو زنج کہا جاتا ہے(1)۔ کلبی نے کہا: یہ تارس، ہاویل اور منسک میں جو ننگے پاؤں اور برہنہ جسم رہتے تھے اور حق کا
نور دیکھنے سے اندھے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ اہل جابلق ہیں یہ قوم عاد کے مومنین کی نسل سے تھے جو حضرت ہود علیہ
السلام پر ایمان لائے تھے۔ سریانی زبان میں انہیں مرقیسا کہا جاتا ہے۔ اور جو سورج کے غروب ہونے کی جگہ کے پاس تھے
وہ اہل جابرس ہیں ان دو شہروں میں سے ہر ایک شہر کے دس ہزار دروازے تھے ہر دو دروازوں کے درمیان ایک فرسخ
کا فاصلہ تھا اور جابلق کے پیچھے امتیں ہیں وہ تافیل اور تارس ہیں، وہ یاجوج و ماجوج کے پڑوس میں ہیں۔ اہل جابرس اور
جابلق، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ شب معراج آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرے تو آپ نے انہیں دعوت

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 20

دی تو انہوں نے آپ کی دعوت قبول نہ کی، یہ بیہقی نے ذکر کیا ہے، انہوں نے کہا: میں نے یہ تمام ایک طویل حدیث سے اختصار کیا ہے جس کو مقاتل بن حیان نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ طبری نے مسند أمقاتل سے روایت کی ہے۔ واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَّمْ نَجْعَل لَّهُم مِّن دُونِهَا سِتْرًا ﴿٩٠﴾ یعنی ایسا حجاب جس کے ساتھ وہ سورج کے طلوع ہونے کے وقت چھپتے۔ قتادہ نے کہا: ان کے اور سورج کے درمیان کوئی پردہ نہ تھا وہ ایسی جگہ میں تھے جہاں کوئی عمارت ٹھہرتی نہیں تھی وہ سرنگوں میں رہتے تھے حتی کہ جب سورج ڈھل جاتا تھا تو وہ اپنے مال، مویشی اور کھیتوں کی طرف لوٹتے تھے یعنی وہ سورج سے نہ کسی پہاڑ کی غار میں چھپ سکتے تھے اور نہ کسی گھر میں چھپ سکتے تھے۔ امیہ نے کہا: میں نے کچھ لوگوں کو سمرقند میں پایا ہے جو ان لوگوں کے متعلق بیان کرتے ہیں۔ بعض نے کہا: میں چین کی طرف چلا تو مجھے کہا گیا تیرے اور ان کے درمیان ایک دن اور ایک رات کی مسافت ہے، میں نے ایک شخص کو اجرت پر لیا تا کہ وہ مجھے وہ قوم دکھائے حتی کہ میں نے صبح ان کے پاس کی، میں نے دیکھا کہ ان کا ایک شخص اپنا ایک کان نیچے بچھاتا تھا اور دوسرا کان اوپر لپیٹ لیتا تھا۔ میرا ساتھی ان سے اچھی طرح کلام کرتا تھا ہم نے ان کے ساتھ رات گزاری، انہوں نے پوچھا: تم کیسے آئے ہو؟ ہم نے کہا: ہم اس لیے آئے ہیں تا کہ دیکھیں کہ سورج کیسے طلوع ہوتا ہے؟ ہم اسی اثنا میں تھے کہ ہم نے گھنٹی کی ہیبت کی آوز سنی تو میں مدہوش ہو گیا پھر مجھے افاقہ ہوا تو وہ مجھے تیل کی مالش کر رہے تھے۔ جب پانی پر سورج طلوع ہوا تو وہ پانی پر زیتون کے تیل کی ہیت کی طرح تھا، جب آسمان کی طرف پر تھا تو خیمہ کی مانند تھا جب مزید بلند ہوا تو انہوں نے مجھے ایک سرنگ میں داخل کیا، جب سورج بلند ہوا اور ان کے سروں سے ڈھل گیا تو وہ مچھلیوں کے شکار کے لیے نکلے وہ مچھلیوں کو سورج کے سامنے کرتے تھے تو وہ پک جاتی تھیں۔ ابن جریج نے کہا: ایک دفعہ ان کے پاس ایک لشکر آیا تو انہوں نے لشکر والوں کو کہا: سورج کے طلوع ہونے کے وقت تم یہاں نہ ہونا۔ انہوں نے کہا: ہم سورج کے طلوع ہونے تک یہاں ٹھہریں گے۔ انہوں نے کہا: یہ ہڈیاں کیسی ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ ایک لشکر کی ہڈیاں ہیں جن پر سورج طلوع ہوا تھا پس وہ مر گئے تھے۔ فرمایا: وہ زمین میں پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے۔ حسن نے کہا: ان کی زمین ایسی تھی کہ نہ کوئی پہاڑ تھا اور نہ درخت اور ان کی زمین عمارت کو برداشت نہیں کرتی تھی جب ان پر سورج طلوع ہوتا تو وہ پانی میں اتر جاتے تھے جب سورج بلند ہو جاتا تو وہ نکل آتے تھے اور وہ جانوروں کی طرح چرتے تھے (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ تمام اقوال اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہاں کوئی شہر نہیں تھا۔ بعض اوقات ان میں سے کوئی نہر میں داخل ہوتا بعض سرنگ میں داخل ہوتے۔ حسن اور قتادہ کے قول میں کوئی تضاد نہیں۔

ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٩٢﴾ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِن دُونِهِمَا قَوْمًا لَّا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا ﴿٩٣﴾ قَالُوا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَىٰ أَن تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿٩٤﴾ قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، زیر آیت ہذہ

رَبِّیْ خَیْرٌ فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَیْنَكُمْ وَ بَیْنَهُمْ رَدْمًا ﴿۹۵﴾ اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ ؕ حَتّٰۤى
اِذَا سَاوٰى بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِیْۤ اُفْرِغْ
عَلَیْهِ قِطْرًا ﴿۹۶﴾ فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿۹۷﴾ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ
مِّنْ رَّبِّیْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَ كَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا ﴿۹۸﴾

''پھر وہ روانہ ہوا ایک اور راہ پر۔ یہاں تک کہ جب وہ پہنچا دو پہاڑوں کے درمیان تو پایا اس نے ان پہاڑوں کے پیچھے ایک قوم کو جو نہیں سمجھ سکتے تھے (ان کی) کوئی بات۔ انہوں نے کہا: اے ذوالقرنین! یاجوج و ماجوج نے بڑا فساد برپا کر رکھا ہے اس علاقے میں تو کیا ہم مقرر کردیں آپ کے لیے کچھ خراج تاکہ آپ بنا دیں ہمارے درمیان اور ان کے درمیان ایک بلند دیوار۔ وہ بولا: وہ دولت جس میں میرے رب نے مجھے اختیار دیا ہے وہ بہتر ہے پس تم میری مدد کرو جسمانی مشقت سے۔ میں بنا دوں گا تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط آڑ۔ تم لے آؤ میرے پاس لوہے کی چادریں (چنانچہ کام شروع ہوگیا) یہاں تک کہ جب ہموار کر دیا گیا وہ خلا جو دو پہاڑوں کے درمیان تھا تو اس نے حکم دیا دھونکو یہاں تک کہ جب وہ لوہا آگ بنا دیا تو اس نے کہا: لے آؤ میرے پاس پگھلا ہوا تانبا کہ میں اسے اس پگھلے ہوئے لوہے پر انڈیلوں۔ سو (یاجوج و ماجوج) بڑی کوشش کے باوجود اسے سر نہ کر سکے اور نہ ہی اس میں سوراخ کر سکے۔ ذوالقرنین نے کہا: یہ میرے رب کی رحمت ہے (کہ اس نے مجھے یہ توفیق بخشی) اور جب آجائے گا تیرے رب کا وعدہ تو وہ اسے ریزہ ریزہ کردے گا اور میرے رب کا وعدہ (پختہ) سچا ہوا کرتا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَیْنَ السَّدَّیْنِ یہ ارمینہ اور آذربیجان کی طرف سے دو پہاڑ ہیں۔ عطا خراسانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: بَیْنَ السَّدَّیْنِ۔ سے مراد ارمینہ اور اذربیجان کے پہاڑ ہیں (1)۔ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا۔ یعنی ان پہاڑوں کے پیچھے قَوْمًا ۙ لَّا یَكَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾ ایسی قوم پائی جو نہیں سمجھ سکتی تھی (ان کی) کوئی بات۔ حمزہ اور کسائی نے یُفْقِهُوْنَ کو یاء کے ضمہ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ افقہ سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ جس کا معنی ہے ظاہر کرنا یعنی وہ دوسروں کو کلام نہیں سمجھا سکتے تھے۔ اور باقی قراء نے یاء اور قاف کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی وہ نہیں جانتے تھے۔ دونوں قراتیں صحیح ہیں وہ غیر کی بات سمجھتے تھے اور نہ غیر کو سمجھاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ۔ یعنی ایک صالح قوم نے اسے کہا: اِنَّ یَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ اخفش نے کہا: یأجوج ہمزہ کے ساتھ ہے اور دونوں الفوں کو اصل سے بنایا ہے انہوں نے کہا: یاجوج کا وزن یفعول ہے اور ماجوج کا وزن مفعول ہے گویا یہ أجیج النار سے مشتق ہیں۔ اور جو مہموز نہیں بناتے وہ دونوں الفوں کو زائد بناتے

1۔ تفسیر طبری، جز 16-15، صفحہ 22

ہیں وہ کہتے ہیں: یاجوج یججُّ سے ہے اور ماجوج مججُّ سے ہے اور یہ دونوں غیر منصرف ہیں۔ روبہ نے کہا:

لوأن یاجوجَ وماجوجَ معًا وَعادَ عادٌ واستجاشوا تُبَعًا

یہ جوہری نے ذکر کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: دونوں غیر منصرف ہیں کیونکہ دونوں اسم عجمی ہیں جیسے طالوت اور جالوت، غیر مشتق ہیں ان کے غیر منصرف ہونے کے اسباب عجمہ اور تعریف اور تانیث ہیں اور ایک جماعت نے کہا: یہ اجّ اور اَجَّجَ سے مشتق ہو کر معرب ہیں۔ ان کے غیر منصرف ہونے کی علتیں تعریف اور تانیث ہیں۔ ابو علی نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ یہ دونوں عربی لفظ ہوں جس نے ہمزہ سے یأجوج پڑھا ہے یہ اس کے نزدیک یربوع کی طرح یفعول کے وزن پر ہو جیسے تیرا قول ہے: اجت النار، اسی سے الاجیج ہے، یعنی روشن کی گئی آگ اسی سے ملح اُجاج ہے۔ اور جس نے ہمزہ سے نہیں پڑھا ممکن ہے اس نے ہمزہ میں تخفیف کر کے اسے الف سے بدل دیا ہو جیسے راس ہے۔ رہا یاجوج یہ اَجّ سے مفعول کے وزن پر ہے دونوں کلمے اشتقاق میں ایک اصل سے ہیں اور جس نے ہمزہ سے نہیں پڑھا جائز ہے کہ اس نے ہمزہ میں تخفیف کی ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مَجّ سے فاعول کے وزن پر ہو اور تانیث اور تعریف کی وجہ سے غیر منصرف ہے گویا یہ قبیلہ کا اسم ہے ان کے فساد میں اختلاف ہے۔ سعید بن عبد العزیز نے کہا: ان کا (فساد برپا کرنا یہ تھا کہ وہ) بنی آدم کو کھاتے تھے۔ ایک جماعت نے کہا ان کا افساد متوقع ہے یعنی وہ فساد کریں، پس انہوں ان سے بچاؤ کی وجہ کو تلاش کیا۔ ایک جماعت نے کہا: ان کا افساد ظلم، زیادتی، قتل اور وہ تمام شر انگیزیاں ہیں جو انسانیت میں معروف ہیں۔ واللہ اعلم۔ یاجوج، ماجوج کی صفات، ان کے خروج کے بارے میں اخبار وارد ہیں۔ وہ یافث کی اولاد سے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ”حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے ہوئے، سام، حام اور یافث، پھر سام سے عرب، فارس اور روم پیدا ہوئے اور ان میں خیر ہے۔ یافث سے یاجوج، ماجوج، ترک اور صقالبہ پیدا ہوئے اور ان میں خیر نہیں ہے۔ اور حام سے قبط، بربر اور سودان پیدا ہوئے“۔ کعب احبار نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام کو احتلام ہوا ان کا پانی مٹی سے ملا تو انہوں نے افسوس کیا پس اس پانی سے یاجوج ماجوج پیدا کیے گئے۔ یہ باپ کی طرف سے ہمارے ساتھ متصل ہیں اور ماں کی طرف سے متصل نہیں اس میں نظر ہے کیونکہ انبیاء کرام صلوات اللہ علیہم وسلامہ کو احتلام نہیں ہوتا۔ یہ یافث کی اولاد سے ہیں؛ اسی طرح مقاتل وغیرہ نے کہا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ”ان کا کوئی آدمی فوت نہیں ہوتا حتی کہ اس کی پشت سے ہزار افراد پیدا ہو چکے ہوتے ہیں یعنی یاجوج وماجوج“۔ حضرت ابو سعید نے کہا: یاجوج وماجوج کے علاوہ یہ پچیس قبائل ہیں ان میں سے اور یاجوج وماجوج میں سے کوئی شخص فوت نہیں ہوتا حتی کہ اس کی پشت سے ہزار آدمی پیدا ہو چکے ہوتے ہیں؛ یہ قشیری نے ذکر کیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے کہا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یاجوج وماجوج کے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یاجوج اور ماجوج دو امتیں ہیں ہر امت چار لاکھ امت ہے ان کی تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، ان میں سے کوئی شخص نہیں مرتا حتی کہ اسکے اس کی صلب سے ہزار افراد پیدا ہو چکے ہوتے ہیں، تمام کے تمام ہتھیار اٹھا چکے ہوتے ہیں“۔ عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لیے ان کی صفت بیان فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: ''وہ تین قسمیں ہیں ان میں سے ہر صنوبر کے درخت کی مثل ہے، ایک درخت شام میں ہے اس درخت کی لمبائی ایک سو بیس ہاتھ ہے۔ ایک قسم وہ ہے جس کا عرض اور طول برابر ہے جیسے ہاتھ ہے۔ ایک قسم وہ ہے جو ایک کان بچھونا بناتے ہیں اور دوسرے کان کو لحاف بناتے ہیں وہ کسی ہاتھی، وحشی اور خنزیر سے گزرتے ہیں تو اسے کھا جاتے ہیں اور جو ان میں سے مرجاتا ہے اسے بھی کھا جاتے ہیں ان کا مقدمہ شام میں ہوگا اور ان کا ساقہ خراسان میں ہوگا۔ وہ مشرق کی نہریں اور بحیرہ طبریہ کو پی جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ اور بیت المقدس سے روک لے گا'' (1)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ان میں سے ایک قسم لمبائی میں ایک بالشت ہے ان کے پنجے ہیں اور درندوں جیسی کچلیاں ہیں، کبوتر کی طرح بلاتے ہیں، جانوروں کی طرح جفتی کرتے ہیں اور بھیڑیوں کی طرح غراتے ہیں اور ان کے بال انہیں گرمی اور سردی سے بچاتے ہیں اور ان کے بڑے بڑے کان ہیں۔ ایک وبرہ ہے جس میں وہ سردیاں گزارتے ہیں اور دوسرا جلدہ ہے جس میں وہ گرمیاں گزارتے ہیں وہ دیوار کو کھودتے ہیں حتیٰ کہ وہ سوراخ کرنے کے قریب پہنچتے ہیں تو اللہ تعالیٰ پھر اسے پہلے کی طرح بھر دیتا ہے حتیٰ کہ وہ کہیں گے: کل ان شاء اللہ ہم اس کا سوراخ مکمل کریں گے اور باہر نکل آئیں گے، لوگ اپنے قلعوں میں پناہ لیں گے وہ آسمان کی طرف تیر پھینکیں گے وہ تیر ان کی طرف خون میں لت پت لوٹایا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ انہیں اس کیڑے سے ہلاک کرے گا جو ان کی گردنوں میں نکلے گا: یہ غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ ''یاجوج ایک امت ہے اس کے چار سو امیر ہیں اور اسی طرح ماجوج ہے ان کا کوئی فرد نہیں مرتا حتیٰ کہ وہ اپنی اولاد سے ہزار شہسوار دیکھ لیتا ہے''۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے (2) جیسے ابن ماجہ نے سنن میں تخریج کیا ہے فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یاجوج و ماجوج ہر روز دیوار کو کھودتے ہیں جب وہ سورج کی شعاع دیکھنے کے قریب پہنچ جاتے ہیں تو ان کے اوپر جو مسلط ہوتا ہے وہ کہتا ہے: اب واپس چلے جاؤ باقی کل کھودنا تو اللہ تعالیٰ اسے پہلے سے زیادہ مضبوط کر کے بھر دیتا ہے حتیٰ کہ جب ان کی مدت پوری ہوگی اور اللہ تعالیٰ انہیں لوگوں پر بھیجنے کا ارادہ کرے گا تو وہ دیوار کو کھودیں گے حتیٰ کہ سورج کی شعاع دیکھنے کے قریب پہنچ جائیں گے تو وہ کہے گا: اب واپس چلے جاؤ پھر کل ان شاء اللہ تم اسے کھودو گے پس وہ ان شاء اللہ کہیں گے تو پھر وہ لوٹ کر اس کی طرف آئیں گے تو وہ اسی طرح ہوگی جس طرح وہ چھوڑ کر گئے ہوں گے وہ پھر اسے کھودیں گے اور لوگوں پر نکل آئیں گے وہ سارا پانی نکالیں گے لوگ اپنے قلعوں میں اپنا بچاؤ کریں گے پھر وہ اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے تو ان پر خون لوٹے گا''۔ الذی احفظ۔

پس وہ کہیں گے: ہم اہل زمین پر غالب آگئے اور ہم اہل آسمان پر بھی غالب آگئے۔ اللہ تعالیٰ ان پر ایک کیڑا مسلط فرمائے گا جو ان کی گدیوں میں پیدا ہوگا پس اللہ تعالیٰ انہیں اس کے ذریعے قتل کر دے گا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! زمین کے کیڑے یاجوج و ماجوج کا گوشت کھانے کی وجہ سے موٹے

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 597 2۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 5، صفحہ 2195

ہو جائیں گے اور خوب خون سے بھر جائیں گے"(1)۔ جوہری نے کہا: شَكِرَتِ النَّاقَةُ تَشْكَرُ شكرا فهي شَكِرَة واشكر الضرع امتلاء لبناً یعنی اونٹنی کی کھیری دودھ سے بھر گئی۔ وہب بن منبہ نے کہا: ان کو ذوالقرنین نے دیکھا ان میں سے ایک کے قد کی لمبائی ہم میں سے درمیانے قد والے شخص کے نصف کے برابر تھی۔ ان کے ناخنوں کی جگہ پنجے تھے۔ اور ان کی درندوں کی طرح داڑھیں اور کچلیاں اور اونٹوں کی طرح ان کے جبڑے تھے وہ بالوں والے تھے ان پر اتنے بال تھے کہ وہ انہیں چھپا دیتے تھے، ہر ایک کے بڑے بڑے کان تھے۔ ایک کان کو لحاف بناتے اور دوسرے کان کو بچھونا بناتے تھے۔ ان میں ہر ایک کی عمر معلوم نہیں ان میں سے کوئی نہیں مرتا حتیٰ کہ اس کی پشت سے ہزار مرد پیدا ہو جاتے تھے۔ اگر وہ مذکر ہوتا تھا اور اس کے رحم سے ہزار مؤنث پیدا ہو جاتے تھے اگر وہ مونث ہوتی۔ سدی اور ضحاک نے کہا: ترک، یاجوج و ماجوج سے ایک جماعت ہے جو ان سے نکلی ہے تبدیل ہو چکی ہے۔ ذوالقرنین آیا تو اس نے دیوار تعمیر کی پس وہ دیوار کی دوسرے جانب ہیں۔ سدی نے کہا: وہ دیوار اکیس قبائل پر بنائی گئی ہے۔ ان میں سے ایک قبیلہ دیوار سے باہر رہ گیا اور وہ ترک ہیں؛ یہ قتادہ کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: جب یہ ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ترکوں کی اسی طرح صفت بیان کی جس طرح یاجوج و ماجوج کی بیان کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قیامت قائم نہ ہوگی حتی کہ مسلمان ترکوں سے لڑیں گے وہ ایسی قوم ہے جن کے چہرے ایسی ڈھالوں کی طرح ہیں جن پر تہہ در تہہ کھالیں چڑھائی گئی ہوں، وہ بالوں کا لباس پہنیں گے اور بالوں میں چلیں گے"(2)۔ ایک روایت میں ہے "وہ بالوں کے جوتے بنائیں گے"۔ اس حدیث کو مسلم، ابوداؤد وغیرہما نے روایت کیا ہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کثرت تعداد اور ان کی شوکت کی حدت جان لی تو فرمایا: "ترکوں کو چھوڑے رکھو جس وقت تک وہ تمہیں چھوڑے رہیں (3) ان سے اس وقت اتنی امتیں نکلیں جن کی تعداد کو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور مسلمانوں سے انہیں صرف اللہ تعالیٰ نے ہی روکا حتی کہ گویا وہ یاجوج و ماجوج ہیں یا ان کا مقدمہ ہیں"۔ ابوداؤد نے ابوبکرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری امت سے کچھ لوگ کھلی ہموار جگہ پر اتریں گے جو نہر کے پاس ہے وہ اس جگہ کو بصرہ کہیں گے اور اس نہر کو دجلہ کہا جاتا ہوگا اس کے اوپر ایک پل ہوگا اس کے رہنے والے زیادہ ہوں گے اور وہ مہاجرین کے شہروں سے ہوگا"۔ ابن یحییٰ نے کہا: ابومعمر نے کہا: یہ آخر زمانہ میں ہوگا۔ بنو قنطورا جوڑے ہوئے مونہوں والے، چھوٹی آنکھوں والے آئیں گے حتیٰ کہ وہ نہر کے کنارے اتریں گے پھر وہ لوگ تین فرقوں میں بٹ جائیں گے۔ ایک فرقہ گائیوں کی دم پکڑے گا اور بریت کو اختیار کرے گا اور وہ ہلاک ہو جائیں گے۔ ایک گروہ اپنے نفسوں کو اختیار کرے گا اور وہ کفر کریں گے اور ایک فرقہ اپنی عورتوں اور بچوں کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے رکھے گا اور وہ ان سے لڑیں گے اور وہ شہداء ہیں۔ بنو قنطورا سے مراد ترک ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قنطوراء ایک لونڈی کا نام ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تھی اس سے آپ کی اولاد ہوئی تو ان کی

1۔ تفسیر ابن کثیر، صفحہ 2193۔ ابن ماجہ، باب ومن سورۃ الکھف، حدیث 4069۔ جامع ترمذی باب فتنۃ الدجال، حدیث نمبر 3078

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، جلد 2، صفحہ 235۔ سنن ابی داؤد، باب فی قتال الترک، 3749

3۔ سنن ابی داؤد، باب فی النھی عن تھییج الترک والحبشۃ، حدیث نمبر 3748

نسل سے تُرک ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَىٰٓ اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا۔ یہ استفہام حسن ادب کے اعتبار سے ہے۔ خرجاً کا معنی ہے کچھ مال، خراجاً بھی پڑھا گیا ہے۔ الخرج، الخراج سے خاص ہے۔ کہا جاتا ہے: أدِّ خَرْجَ رأسك وخراج مدینتك۔ ازہری نے کہا: الخراج کا اطلاق ٹیکس پر ہوتا ہے اور مال فئ پر بھی ہوتا ہے اور جزیہ پر بھی ہوتا ہے اور غلہ پر بھی ہوتا ہے اور الخرج اس کو کہا جاتا ہے جو اموال میں سے فرضی حصہ نکالا جاتا ہے اور الخراج مصدر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلَىٰٓ اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا یعنی ردم (دیوار)، ردم اس کو کہتے ہیں جس کا بعض، بعض پر جوڑا گیا ہوحتی کہ وہ مل جائے۔ ثوب مردم وہ کپڑا جو جوڑا گیا ہو؛ ہروی کا یہ قول ہے، کہا جاتا ہے: ردمت الثلمة اردمها ردماً۔ میں سوراخ بند کر دیا۔ الردم اسم ہے اس کا معنی دیوار بھی ہے۔ بعض نے فرمایا: الردم، السد سے زیادہ بلیغ ہے کیونکہ السد ہر وہ چیز ہوتی ہے جس کے ساتھ روکا جائے اور الردم کا معنی ہے کسی چیز کو کسی چیز پر رکھنا خواہ پتھر ہو، مٹی ہو یا کوئی اور چیز ہوحتی کہ اس کے ساتھ مضبوط پردہ بن جائے گا اسی سے ردم ثوبه۔ جب اس پر مزید کپڑے لگائے جائیں بعض بعض پر جڑے ہوئے ہوں۔ اسی سے عنترہ کا قول ہے:

هل غادر الشعراء من متردم

یعنی ایسا قول جس کا بعض بعض پر مرکب کیا گیا ہو۔ اور سَدًّا۔ سین پر فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ خلیل اور سیبویہ نے کہا: سین کے ضمہ کے ساتھ اسم ہے اور فتحہ کے ساتھ مصدر ہے۔ کسائی نے کہا: ضمہ اور فتحہ کے ساتھ دونوں لغتیں ہیں دونوں کا معنی ایک ہے۔ عکرمہ، ابوعمرو بن العلاء اور ابوعبیدہ نے کہا: جو اللہ کی تخلیق سے ہو اس میں کوئی کسی عمل سے شریک نہ ہو تو وہ ضمہ کے ساتھ ہے اور جو بشر کے عمل سے ہو وہ فتحہ کے ساتھ ہے۔ اس قول والوں کو سدًّا سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھنا واجب ہے اور اس سے پہلے بین السدین ضمہ کے ساتھ پڑھنا واجب ہے؛ یہ حمزہ اور کسائی کی قرأت ہے۔ ابوحاتم نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے، ابوعبیدۃ کے قول کا برعکس مروی ہے، ابن ابی اسحاق نے کہا: جس کو تیری آنکھیں دیکھیں وہ سُدّ (ضمہ کے ساتھ) ہے اور جس کو آنکھیں نہ دیکھیں وہ سَدّ (سین کے فتحہ کے ساتھ) ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں جیل خانے بنانا اور فسادیوں کو ان میں قید کرنا اور انہیں تصرف سے روک دینا جائز ہے اور ان فسادیوں کو اپنے حال پر نہیں رہنے دیا جائے گا بلکہ ان کو سزا دی جائے گی یا ان سے ضامن لیے جائیں گے اور انہیں چھوڑ دیا جائے گا جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ مَا مَكَّنِّىْ فِيْهِ رَبِّىْ خَيْرٌ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قَالَ مَا مَكَّنِّىْ فِيْهِ رَبِّىْ خَيْرٌ یہ ذوالقرنین نے ان لوگوں کو کہا: جو اللہ تعالیٰ نے مجھے قدرت اور ملک عطا فرمایا وہ تمہارے خراج اور مال سے بہتر ہے لیکن تم بدنی قوت سے میری مدد کرو، یعنی مردوں کے ساتھ اور بدنی عمل کے

ساتھ اور اس آلہ کے ساتھ میری مدد کرو جس کے ساتھ میں وہ دیوار تیار کروں۔ اس کلام میں ذی القرنین کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید ہے کیونکہ اگر لوگ خراج جمع کرتے تو کوئی اس کی مدد نہ کرتا اور وہ دیوار کی تعمیر اس کے سپرد کر دیتے اور ان کا اپنے جسموں سے مدد کرنا اس عمل کو جلدی مکمل کرنے اور خوبصورت بنانے کا باعث تھا اور جو انہوں نے اس کے لیے ذکر کیا وہ خراج سے زیادہ تھا۔ ابن کثیر نے مامکنی، دونوں کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے مامکنی فیہ ربی پڑھا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ بادشاہ پر فرض ہے کہ وہ اپنی رعیت کی حفاظت کرے اور ان کی ضروریت کو پورا کرے اور ان کی سرحدوں کی اصلاح کرے، ان کے مال سے جو ان پر لازم کیے گئے ہیں اور ان حقوق سے جو اس کے ذریعے ان کے خزانہ میں جمع ہیں حتیٰ کہ اگر حقوق اس خزانہ کو ختم بھی کر دیں اور ضروریات اسے صفر تک پہنچا دیں تو ان کے اموال سے جبراً ٹیکس لیا جائے گا اور بادشاہ پر ضروری ہے کہ وہ رعیت کے بارے میں عمدہ اور بہتر انداز میں غور و فکر کرے۔ یہ تین شروط کے ساتھ ہے (i) وہ کسی چیز کے ساتھ اپنے آپ کو ترجیح نہ دے (ii) پہلے اس مال سے حاجت مندوں پر خرچ کرے اور ان کی مدد کرے (iii) ہر ایک کو اس کی قدر و منزلت کے مطابق عطا کرے۔ اس کے بعد اگر مال ختم ہو جائے اور خزانہ خالی ہو جائے اور حوادثات ظاہر ہوں تو بادشاہ لوگوں کو اموال کے خرچ کرنے سے پہلے اپنے جسموں کو پیش کرنے کے لیے کہے اگر جسمانی طاقت سے کام نہ چلے تو پھر تدبیر کے تصرف و تقدیر پر ان سے اموال لیے جائیں گے۔ جب ذوالقرنین پر ان لوگوں نے مال پیش کیا تا کہ وہ ان سے یاجوج و ماجوج کی زیادتی کو روکے تو اس نے کہا: مجھے مال کی ضرورت نہیں مجھے تمہاری افرادی قوت کی ضرورت ہے۔ **فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ** یعنی میرے ساتھ تم جسمانی خدمت بجا لاؤ۔ اموال میرے پاس ہیں اور جسمانی قوت تمہارے پاس ہے۔ اس نے دیکھا کہ ان کے مال مفید نہیں کیونکہ ان کے اموال کو اجرت کے طور پر لے گا تو جس کام کی ضرورت ہے وہ اس سے کم ہیں، پھر ان پر اجر لوٹنے گا، پس بدنی خدمت خود اپنی طرف سے پیش کرنا بہتر ہے۔ ضابطہ یہ ہے کہ کسی سے کام لینا حلال نہیں مگر ضرورت کے لیے جو لاحق ہوتی ہے اس سے وہ مال جبراً لیا جائے گا خفیہ نہیں اور مال وہ عدل کے ساتھ خرچ کرے گا، ترجیحات کے اعتبار سے نہیں، جماعت کی رائے سے خرچ کرے گا نہ کہ اپنی مرضی سے۔ اللہ تعالیٰ درست سمت کی توفیق دینے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ** تم مجھے لوہے کی چادریں دو اس نے انہیں آلات نقل کرنے کا حکم دیا یہ تمام اس عطیہ کا طلب کرنا ہے جو ہبہ کے معنی میں نہیں ہے یہ لینے کے لیے استدعا ہے کیونکہ اس نے ان سے خراج نہ لینے کے قول پر مرتب کیا ہے۔ پس صرف مناولت کی صورت ہی باقی رہ جاتی ہے اور بدنی اعمال کی ضرورت رہ جاتی ہے۔ زبر الحدید، لوہے کے ٹکڑے۔ اس کلمہ کی اصل اجتماع ہے اس سے زبرۃ الاسد ہے۔ شیر کے کندھے کے جمع شدہ بالوں کو کہتے ہیں۔ زبرتُ الکتاب، یعنی میں نے کتاب کو لکھا اور اس کے حروف کو جمع کیا، ابوبکر اور مفضل نے ردما ایتونی پڑھا ہے۔ یہ الاتیان سے ہے جس کا معنی ہے آنا، یعنی میرے پاس لوہے کی چادریں لے آؤ۔ جب حرف جر ساقط ہوتو فعل کو نصب دیا گیا جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

اَمَرْتُكَ الْخَيْرَ

حرف جر کو حذف کیا گیا اور فعل کو نصب دی گئی۔ جمہور نے زبر۔ (فاء کے فتحہ) کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن نے اس کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ تمام زبرۃ کی جمع ہے اس سے مراد لوہے کا بڑا ٹکڑا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى، یعنی جب دیوار کھڑی ہوگئی، دیوار کے لفظ کو حذف کر دیا کیونکہ کلام اس پر دلالت کر رہا ہے۔ بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ۔ ابوعبیدہ نے کہا: یہ پہاڑ کی دونوں طرفیں ہیں۔ اس کو یہ نام اس لیے دیا جاتا ہے کیونکہ یہ آپس میں ملی ہوئی ہوتی ہیں؛ یہ زہری کا قول ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کیونکہ وہ دوسری طرف سے اعراض کیے ہوئے ہے۔ یہ الصدوف سے مشتق ہے، شاعر نے کہا:

كِلَا الصَّدَفَيْنِ يَنْفُذُهُ سَنَاهَا تَوَقَّدُ مِثْلَ مِصْبَاحِ الظَّلَامِ

بلند عمارت کو بھی الصدف کہتے ہیں۔ صدف کو پہاڑ کی طرف سے تشبیہ دی گئی ہے۔ حدیث شریف میں ہے: ''جب جھکی ہوئی بلند منزل سے گزرتے تو تیز چلتے'' (1)۔ ابوعبیدہ نے کہا: الصدف اور الھدف ہر بلند عمارت کو کہتے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: الصدفان سے مراد وہ دو پہاڑ ہیں جو آمنے سامنے ہوتے ہیں (2)۔ ان کو صدفان کہتے ہیں کیونکہ ہر ایک دوسرے کے سامنے ہوتا ہے۔ نافع، حمزہ اور کسائی نے الصدفین یعنی صاد کے فتحہ اور شد کے ساتھ اور دال کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ قرأت حضرت عمر بن خطاب اور عمر بن عبدالعزیز کی ہے؛ یہ ابوعبیدہ کی مختار قرأت ہے اور یہ مشہور لغت ہے۔ ابن کثیر، ابن عامر اور ابوعمرو نے الصدفین صاد اور دال کے ضمہ کے ساتھ پڑھا۔ عاصم نے ابوبکر کی روایت میں الصدفین یعنی صاد کے ضمہ اور دال کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ جیسے الجُرُف اور الجُرْف۔ یہ تخفیف ہے، ابن ماجشون نے صاد کے فتحہ اور دال کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قتادہ نے بین الصدفین، صاد کے فتحہ اور دال کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ تمام کا معنی ایک ہے دو پہاڑ جو مقابل ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ انْفُخُوْا۔ یعنی دھونکنیوں کے ساتھ لوہے کے ٹکڑوں پر پھونکو۔ وہ انہیں لوہے کے ٹکڑے اور پتھر کے ٹکڑوں کو رکھنے کا حکم دیتا تھا پھر ان پر ایندھن اور کوئلہ رکھا جاتا تھا اور دھونکنیوں کے ذریعے آگ جلائی جاتی تھی حتیٰ کہ وہ لوہا گرم ہو جاتا تھا۔ لوہے کو جب گرم کیا جاتا تو وہ آگ کی طرح ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا۔ سے یہی مراد ہے پھر پگھلا ہوا تانبا، رصاص یا لوہا لایا جاتا تھا (قطر میں اختلاف کی بناء پر) اسے ان لوہے کی گرم تہہ در تہہ رکھی ہوئی چادروں پر ڈالا جاتا تھا جب وہ جڑ جاتا تھا اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتا تھا تو پھر دوسری چادر ڈالی جاتی تھی یہاں تک کہ عمل مکمل ہوا اور مضبوط پہاڑ سا بن گیا۔ قتادہ نے کہا: وہ یمنی چادر کی طرح تھا ایک لائن زرد اور ایک لائن سرخ تھی۔ روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور کہا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے یاجوج وماجوج کی دیوار دیکھی ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو نے کیسی دیکھی ہے؟'' اس نے کہا: میں نے وہ یمنی دھاری دار چادر کی طرح دیکھی ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو نے واقعی دیکھی ہے'' (3)۔ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا۔ کا معنی ہے جب وہ آگ کی

1۔ غریب الحدیث، جلد 1، صفحہ 77
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 543
3۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، ذکر یاجوج ماجوج، جلد 1، صفحہ 472

طرح ہو گیا۔ اٰتُوْنِیْۤ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا۔ کا معنی ہے تم مجھے قطر (تانبا) دو میں اس پر انڈیلوں۔ اس میں تقدیم و تاخیر ہے اور جس نے اُتونی پڑھا ان کے نزدیک اس کا معنی ہے تم آؤ میں اس پر تانبا ڈالوں۔ القطر اکثر مفسرین کے نزدیک پگھلا ہوا تانبا ہے اس کی اصل القطر ہے کیونکہ جب وہ پگھلایا جاتا ہے تو اس طرح اس کے قطرے گرتے ہیں جیسے پانی کے قطرے گرتے ہیں۔ ایک جماعت نے کہا: اس سے مراد پگھلا ہوا لوہا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: ان میں سے ابن الانباری بھی ہے کہ قطر سے مراد پگھلا ہوا تانبا ہے۔ یہ قطر یقطر قطراً سے مشتق ہے۔ اسی سے ہے وَ اَسَلْنَا لَهٗ عَیْنَ الْقِطْرِ (سبا: 12) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا۔ یعنی یاجوج و ماجوج اس پر چڑھ نہ سکے کیونکہ وہ چکنی اور پہاڑ جتنی بلند تھی کہ پہاڑ بلند تھا اس کو عبور کرنے کا قصد نہیں کیا جاتا تھا اس دیوار کی بلندی دو سو ہاتھ تھی اور چوڑائی پچاس ہاتھ تھی۔ روایت ہے کہ اس کا طول دو پہاڑوں کی طرفوں کے درمیان تھا (یعنی) سو فرسخ اور عرض پچاس فرسخ؛ وہب بن منبہ نے یہی کہا ہے۔ وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا۔ اس کے عرض اور مضبوطی کی وجہ سے یاجوج و ماجوج سوراخ نہ کر سکے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''آج یاجوج و ماجوج کی دیوار سے اس کی مثل کھل گیا ہے''۔ وہب بن منبہ نے اپنے ہاتھ سے نوے کا عقد بنایا۔ ایک روایت میں ہے: انہوں نے انگوٹھے اور ساتھ والی انگلی سے حلقہ بنایا۔۔۔۔ الخ۔ یحییٰ بن سلام نے سعد بن ابی عروبہ سے انہوں نے قتادہ سے انہوں نے ابو رافع سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یاجوج و ماجوج ہر روز دیوار کو پھاڑتے ہیں حتیٰ کہ جب وہ سورج کی شعاع دیکھنے کے قریب پہنچتے ہیں تو ان کا نگران کہتا ہے: اب لوٹ جاؤ باقی تم کل پھاڑو گے۔ پس اللہ تعالیٰ اسے پہلے سے زیادہ مضبوط کر کے لوٹا دیتا ہے حتیٰ کہ جب ان کی مدت پوری ہو گی اور اللہ تعالیٰ انہیں لوگوں پر بھیجنے کا ارادہ فرمائے گا تو وہ دیوار کو کھودیں گے حتیٰ کہ جب سورج کی شعاع دیکھنے کے قریب ہوں گے تو ان کا نگران انہیں کہے گا: ان شاء اللہ کل تم اسے پھاڑو گے۔ وہ دوسرے دن اس کی طرف آئیں گے تو وہ اسے اسی ہیئت میں پائیں گے جس ہیئت میں چھوڑ کر گئے ہوں گے، پس وہ اسے پھاڑ دیں گے اور لوگوں پر نکل آئیں گے''(1) (الحدیث)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَا اسْطَاعُوْۤا طاء کی تخفیف کے ساتھ جمہور کی قرأت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ لغت استطاعوا کے معنی میں ہے۔ بعض نے فرمایا: بلکہ یہ استطاعوا ہی تھا عربوں کے کلام میں کثرت سے موجود ہے حتیٰ کہ بعض نے اس سے تاء حذف کر دی اور انہوں نے کہا: اسطاعوا۔ اور بعض نے طاء حذف کر دی اور کہا: استاع یستیع بمعنی استطاع یستطیع یہ مشہور لغت ہے۔ صرف حمزہ نے اسے فما اسطاعوا یعنی طاء کی شد کے ساتھ پڑھا ہے گویا اس نے استطاعوا کا ارادہ کیا پھر تاء کو طاء میں ادغام کر دیا ہے اور اسے مشدد کر دیا۔ یہ ضعیف قرأت ہے۔ ابو علی نے کہا: یہ جائز نہیں ہے۔ اعمش نے فما استطاعوا ان یظھروہ وما استطاعوا له نقبا۔ پڑھا ہے دونوں جگہ تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ اس کا قائل ذوالقرنین ہے هذا کے ساتھ اس دیوار کی طرف اور اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 544-543

پر قوت اور یاجوج و ماجوج کے ضرر کو دفع کرنے میں اس سے انتفاع کی طرف اشارہ کیا۔ ابن ابی عبلہ نے ھذہ رحمة من ربی پڑھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ۔ یعنی قیامت کا دن آئے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: جب یاجوج و ماجوج کے خروج کا دن آئے گا جَعَلَهٗ دَكَّآءَ تو اسے زمین کے برابر کردے گا اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا (الفجر) ابن عرفہ نے کہا: اس کا مطلب ہے وہ اس طرح برابر کردی جائے گی کہ اس میں کوئی ٹیلہ نہ ہوگا، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جَعَلَهٗ دَكَّآءَ۔ ایسی اونٹنی جس کی کوہان ختم ہوگئی ہو۔ قتبی نے کہا: اس دیوار کو زمین کے برابر بنادے گا۔ کلبی نے کہا: اسے ٹکڑے ٹکڑے کردیا جائے گا۔ شاعر نے کہا:

هل غير غادٍ دكَّ غارًا فانهدم

ازہری نے کہا: کہا جاتا ہے: دککتہ یعنی دققتہ۔ ریزہ ریزہ کرنا۔ جس نے دکاء پڑھا ہے اس نے یہ ارادہ کیا ہے کہ پہاڑ کو برابر زمین بنادے گا اس سے مراد وہ ٹیلہ ہے جو پہاڑ کی اونچائی کو نہ پہنچتا ہو۔ اس کی جمع دکاوات ہے۔ حمزہ، عاصم اور کسائی نے دکاء مد کے ساتھ پڑھا ہے اور الناقۃ الدکاء (بے کوہان اونٹنی) کے ساتھ تشبیہ کی بناء پر۔ اس کلام میں حذف ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے: جعلہ فی مثل دکاء۔ اس تقدیر کی بناء پر حذف ضروری ہے کیونکہ السد مذکر ہے اس کی صفت دکاء نہیں ہوسکتی اور جنہوں نے دکا پڑھا ہے تو یہ دك یدك کا مصدر ہوگا جب کوئی چیز گرادی جائے اور چور کردی جائے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ جعل بمعنی خلق ہو اور دکاً پر نصب حال کی بنا پر ہو، اسی طرح جنہوں نے مد کے ساتھ پڑھا ہے اس کی نصب کے دو احتمال ہیں۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿۹۹﴾ وَّعَرَضْنَا
جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضَا ﴿۱۰۰﴾ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ
وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ﴿۱۰۱﴾ اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ
دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ
اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ
صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ
لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿۱۰۵﴾ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ
هُزُوًا ﴿۱۰۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿۱۰۷﴾
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ
الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ

يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾

''اور ہم واگزار کر دیں گے بعض کو اس دن کہ وہ (تند موجوں کی طرح) دوسروں میں گھس جائیں گے اور صور پھونکا جائے گا تو ہم سب کو اکٹھا کر دیں گے۔ اور ہم ظاہر کر دیں گے جہنم کو اس دن کفار کے لیے بالکل عیاں۔ وہ کافر جن کی آنکھوں پر پردے پڑے تھے میری یاد سے اور جو (کلمہ حق) سن بھی نہیں سکتے تھے۔ کیا گمان کرتے ہیں کفار کہ وہ بنالیں گے میرے بندوں کو میرے بغیر اپنا حمایتی؟ (یہ ناممکن ہے) بیشک ہم نے تیار کر رکھا ہے جہنم کو کفار کی رہائش کے لیے۔ فرمایئے: (اے لوگو) کیا مطلع کریں تمہیں ان لوگوں پر جو اعمال کے لحاظ سے گھاٹے میں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی ساری جدوجہد دنیوی زندگی کی آراستگی میں کھو کر رہ گئی اور یہ خیال کر رہے ہیں کہ وہ کوئی بڑا عمدہ کام کر رہے ہیں، یہی وہ (بدنصیب) ہیں جنہوں نے انکار کیا اپنے رب کی آیتوں کا اور اس کی ملاقات کا تو ضائع ہو گئے ان کے اعمال تو ہم ان (کے اعمال تولنے) کے لیے روز قیامت کوئی ترازو نصب نہیں کریں گے۔ یہ ہے ان کی جزاء جہنم اس وجہ سے کہ انہوں نے کفر کیا اور میری آیتوں اور رسولوں کو مذاق بنالیا۔ یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل (بھی) کرتے رہے تو فردوس کے باغات ان کی رہائش گاہ ہوں گے۔ وہ ہمیشہ رہیں گے ان میں (اور) نہیں چاہیں گے کہ وہ اس جگہ کو بدل لیں۔ (اے حبیب!) آپ فرمایئے کہ اگر ہو جائے سمندر روشنائی میرے رب کے کلمات (لکھنے) کے لیے تو ختم ہو جائے گا سمندر اس سے پیشتر کہ ختم ہوں میرے رب کے کلمات اور اگر ہم لے آئیں اتنی اور روشنائی اس کی مدد کو (تب بھی ختم نہ ہوں گے)۔ (اے پیکر رعنائی وزیبائی) آپ فرمایئے کہ میں بشر ہی ہوں تمہاری طرح وحی کی جاتی ہے میری طرف کہ تمہارا خدا صرف اللہ وحدہ ہے، پس جو شخص امید رکھتا ہے اپنے رب سے ملنے کی تو اسے چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے اور نہ شریک کرے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ۔ تَرَكْنَا میں ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے یعنی ہم جن وانس کو قیامت کے روز واگزار کر دیں گے وہ (تند موجوں کی طرح) ایک دوسروں میں گھس جائیں گے۔ بعض نے کہا: ہم یاجوج وماجوج کو واگزار کر دیں گے۔ يَوْمَئِذٍ اس دیوار کے کمال کے وقت وہ ایک دوسرے میں گھس جائیں گے۔ ان کے لیے موج کا استعارہ حیرت سے عبارت ہے اور ان کے تردد سے عبارت ہے جیسے غم اور خوف کی وجہ سے نڈھال لوگ ہوتے ہیں انہیں دریا کی موج سے تشبیہ دی ہے جس کی موجیں ایک دوسرے میں گھس جاتی ہیں۔ بعض نے کہا: اس کا مطلب ہے ہم یاجوج وماجوج کو دیوار کے کھلنے کے دن دنیا میں دریا کی موجوں کی طرح کر دیں گے کثرت کی وجہ سے خلط ملط ہو جائیں گے۔

میں کہتا ہوں: یہ تین اقوال ہیں ان میں سے اظہر دوسرا قول ہے اور زیادہ بعید آخری قول ہے۔ پہلا قول حسن ہے کیونکہ

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ کے ارشاد کی تاویل میں قیامت کا ذکر گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ نُفِخَ فِی الصُّوْرِ یہ سورۂ انعام میں گزر چکا ہے۔ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿۹۹﴾ یعنی قیامت کے میدان میں جن وانس کو ہم جمع کریں گے۔ وَّ عَرَضْنَا جَهَنَّمَ یعنی ان کے لیے ہم جہنم کو ظاہر کریں گے۔ یَوْمَىِٕذٍ لِّلْكٰفِرِیْنَ عَرْضَا ﴿۱۰۰﴾ الَّذِیْنَ كَانَتْ اَعْیُنُهُمْ اسم موصول کافرین کی صفت کی بناء پر محل جر میں ہے۔ فِیْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِیْ وہ اس آنکھ کی طرح ہیں جو ڈھانپی گئی ہے وہ اللہ کے دلائل (توحید) کو دیکھتی ہی نہیں۔ وَ كَانُوْا لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَمْعًا ﴿۱۰۱﴾ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام سننے کی طاقت نہیں رکھتے وہ بہرے شخص کی طرح ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَحَسِبَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا۔ حسب کا معنی ہے گمان کیا۔ حضرت علی، عکرمہ، مجاہد اور ابن محیصن نے أفحسب سین کے سکون اور باء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی انہیں کافی ہے۔ اَنْ یَّتَّخِذُوْا عِبَادِیْ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام، ملائکہ اور حضرت عزیر علیہ السلام۔ مِنْ دُوْنِیْۤ اَوْلِیَآءَ میں انہیں سزا نہیں دوں گا۔ کلام میں حذف ہے۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے کیا انہوں نے گمان کیا ہے کہ انہیں یہ نفع دے گا؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ هُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَآىِٕهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِیْمُ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَزْنًا ﴿۱۰۵﴾ اس میں دو مسئلے ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ الآیۃ۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ لوگوں میں سے جو عمل کرتا ہے اور وہ یہ خیال کرتا ہے وہ اچھائی کرنے والا ہے حالانکہ اس کی محنت رایگان ہو چکی ہوتی ہے اور جو چیز اس کی محنت کے ضیاع کا باعث بنتی ہے وہ اس کے عقیدہ کی خرابی ہے یا ریا کاری ہے اور یہاں کفر مراد ہے۔ امام بخاری نے مصعب سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے اپنے باپ سے پوچھا: قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ سے مراد حروریہ (خوارج) ہیں؟ انہوں نے فرمایا: نہیں وہ یہود ونصاریٰ ہیں کیونکہ یہود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرتے ہیں اور نصاریٰ جنت کا انکار کرتے ہیں، انہوں نے کہا: اس میں کھانا، پینا نہیں ہے اور حروریہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے پختہ عہد کرنے کے بعد عہد کو توڑا۔ حضرت سعد انہیں فاسقین کہتے تھے۔ آیت میں توبیخ ہے یعنی ان کفار کو کہو جو میرے علاوہ کی عبادت کرتے ہیں ان کی سعی اور ان کی امنگیں کل قیامت کے روز سب خائب وخاسر ہوں گی۔ پس یہی لوگ اعمال کے اعتبار سے گھاٹے میں ہیں۔ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ هُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾ یعنی میرے سوا کی عبادت میں گمان رکھتے ہیں۔ حضرت علی نے فرمایا: وہ حروراء کے خوارج ہیں۔ مرۃ نے کہا: وہ راہب ہیں جو صوامع میں رہتے ہیں۔ روایت ہے کہ ابن الکواء نے الاخسرین اعمالا کے متعلق ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا: اس سے مراد تو اور تیرے ساتھی ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: ان تمام اقوال کو اس کے بعد والا قول کمزور کر دیتا ہے وہ یہ ہے: اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَآىِٕهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ اور ان گروہوں میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ، اس کی ملاقات، بعث اور نشور کا انکار نہیں کرتا۔ یہ مشرکین مکہ کی صفت ہے جو بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ حضرت علی اور حضرت سعد رضی اللہ عنہما نے ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اس آیت سے اپنا حصہ لیا۔ اعمالا۔ پر نصب تمیز کی بناء پر ہے۔ حبطت۔ جمہور کی قرأت باء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ حضرت ابن عباس

بنی عبہمانے باء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝ جمہور کی قرأت نقیم نون عظمت کے ساتھ ہے۔ مجاہد نے یاء غائب کے ساتھ پڑھا یعنی اللہ قائم فرمائے گا۔ عبید بن عمیر نے فلایقوم پڑھا ہے اسے وزن پڑھنا لازم ہے اسی طرح مجاہد نے، فلا یقوم لھم یوم القیامۃ وزن پڑھا ہے۔ عبید بن عمیر نے کہا: قیامت کے روز ایک بہت لمبے تڑنگے، زیادہ کھانے پینے والے کو لایا جائے گا اللہ کی بارگاہ میں مچھر کے برابر بھی وزن نہ ہوگا۔

میں کہتا ہوں: ایسا قول رائے سے تو نہیں کہا جاتا۔ اس کا معنی بخاری و مسلم کی صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے (2)، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے روز ایک بڑے موٹے شخص کو لایا جائے گا اللہ کی بارگاہ میں مچھر کے برابر بھی اس کا وزن نہ ہوگا۔ اگر چاہو تو یہ پڑھ لو، فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا ثواب نہ ہوگا اور ان کے اعمال کے مقابل عذاب ہوگا، ان کی کوئی نیکی نہ ہوگی کہ قیامت کے میزانوں میں اس کا وزن کیا جائے۔ اور جس کی کوئی نیکی نہ ہوگی وہ آگ میں ہوگا۔ حضرت ابوسعید خدری نے کہا: تہامہ پہاڑ کی طرح اعمال کے ساتھ لایا جائے گا لیکن ان کا کچھ وزن نہ ہوگا۔ بعض نے فرمایا: یہ بھی احتمال ہے کہ مجاز اور استعارہ مراد ہو گویا فرمایا: ہمارے نزدیک اس دن ان کی کوئی قدر نہ ہوگی۔ واللہ اعلم۔ اس حدیث میں فقہ یہ ہے کہ اس موٹاپے کی مذمت کی گئی ہے جو تکلفاً حاصل کیا جاتا ہے کیونکہ اس کے لیے کھانے پینے کا تکلف کرتا ہوگا اور مکارم سے دوری ہوگی، بلکہ یہ دلیل ہے کہ کفایت کی قدر سے زائد کھانا حرام ہے جس کے ساتھ ترفہ اور موٹاپا مطلوب ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ترین شخص موٹا دینی پیشوا ہے'' (3)۔ عمران بن حصین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''تم میں سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر جو اس کے ساتھ متصل ہوں گے''۔ عمران نے کہا: میں نہیں جانتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کے بعد دو زمانوں کا ذکر کیا یا تین زمانوں کا ذکر کیا۔ پھر فرمایا: ''تمہارے بعد ایک قوم ہوگی جو گواہی دیں گے جبکہ ان سے گواہی طلب نہیں کی جائے گی، وہ خیانت کریں گے اور امین نہ ہوں گے، نذریں مانیں گے اور نذر پوری نہیں کریں گے اور ان میں موٹاپا ظاہر ہوگا''۔ یہ مذمت ہے اس کا سبب یہ ہے کہ موٹاپا جو حاصل کیا جاتا ہے وہ کثرت سے کھانے اور حرص کرنے، آرام اور امن سے رہنے اور نفس کو شہوات پر چھوڑنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ پس وہ اپنے نفس کی عبادت کرنے والا ہے، اپنے رب کی عبادت کرنے والا نہیں اور جس کی یہ حالت ہو وہ حرام میں واقع ہوتا ہے اور ہر وہ گوشت جو حرام سے پیدا ہوتا ہے آگ اس کی زیادہ مستحق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زیادہ کھانے کی وجہ سے کفار کی مذمت کی ہے فرمایا: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۝ (محمد)

جب ایک مومن ان کے مشابہ ہوگا اور ہر حال اور زمانہ میں ان جیسے تنعم سے لطف اندوز ہوگا تو اس کے ایمان کی حقیقت کہاں ہوگی اور وہ اسلام کے وظائف کو کیسے قائم کرے گا؟ جو زیادہ کھاتا پیتا ہے اس کی حرص اور لالچ زیادہ ہوتی ہے۔ رات کو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 545 2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، قل ھل انبئکم، جلد 2، صفحہ 690
3۔ جامع ترمذی، کتاب الفتن، ما جاء القرن الثالث، جلد 2، صفحہ 45

سستی اور نیند زیادہ ہوتی ہے، پس اس کا دن لالچ میں گردش کرتے ہوئے اور رات سوتے ہوئے گزرتی ہے۔ یہ مفہوم سورۃ اعراف میں گزر چکا ہے۔ اس میں میزان کا ذکر بھی گزر چکا ہے۔ اس کے دو پلڑے ہیں جن میں اعمال کے صحائف کا وزن کیا جائے گا، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب صحابہ حضرت ابن مسعود کی پنڈلی کی باریکی کو دیکھ کر ہنستے تھے جب کہ وہ کھجور پر چڑھ رہے تھے: ''تم پنڈلی کی وجہ سے ہنس رہے ہو تمام اہل زمین کے عمل کے ساتھ اس کا وزن کیا جائے گا''۔ یہ دلیل ہے کہ اشخاص کا وزن کیا جائے گا؛ غزنوی نے اس کو ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ۔ ذالك مشار الیہ وزن کا ترک ہے۔ ذالك مبتدا ہے اور جزاءهم خبر ہے۔ جهنم، مبتدا سے بدل ہے جو ذالك ہے۔ اور بما کفروا میں ما مصدر یہ ہے اور الهزء کا معنی مزاح کرنا اور ہلکا سمجھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝ قتادہ نے کہا: فردوس جنت کا بلند، عمدہ، اعلیٰ، افضل اور ارفع مقام ہے۔ حضرت ابو امامہ باہلی نے کہا: فردوس جنت کی ناف ہے۔ کعب نے کہا: جنتوں میں سے ایک جنت ہے جو جنۃ الفردوس سے بھی اعلیٰ ہے، اس میں وہ لوگ ہوں گے جو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے(1) فرمایا: ''نبی پاک ﷺ نے فرمایا: جو اللہ پر ایمان لایا، نماز قائم کی، رمضان کے روزے رکھے تو اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ اسے جنت میں داخل کرے خواہ اس نے اللہ کے راستہ میں جہاد کیا ہو یا اس زمین میں بیٹھا رہا ہو جس میں پیدا ہوا تھا''۔ صحابہ کرام نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ ہم لوگوں کو اس کی خوشخبری دے دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جنت میں ایک سو درجے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے تیار کیے ہیں۔ اور ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جیسا کہ آسمان اور زمین کے درمیان ہے جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو جنت الفردوس کا سوال کرو کیونکہ وہ جنت کا اعلیٰ اور بلند درجہ ہے''۔ میرا خیال ہے فرمایا: ''اس کے اوپر رحمن کا عرش ہے اس سے جنت کی نہریں پھوٹتی ہیں''۔ مجاہد نے کہا: فردوس، رومی زبان میں باغ کو کہتے ہے۔ فراء نے کہا: یہ عربی لفظ ہے۔ فردوس جنت میں ایک باغیچہ ہے۔ فردوس یمامہ کے قریب ایک باغ کا نام ہے۔ اس کی جمع فرادیس ہے۔ امیہ بن ابی الصلت ثقفی نے کہا:

كانت منازلهم إذ ذاك ظاهرةً فيها الفَراديس والفُومانُ والبصَلُ

الفرادیس شام کا ایک علاقہ ہے۔ کرم مفردس کا مطلب ہے انگور کی بیلیں جو چھپر کی طرح پھیلی ہوئی ہوں۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ۝ یعنی وہ اس جنت سے کسی اور طرف پھرنا نہیں چاہتے۔ الحول بمعنی التحویل ہے یہ ابوعلی نے کہا۔ زجاج نے کہا، حال من مكانه حولا، جیسے کہا جاتا ہے: عظم عظماً۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ الحیلہ سے مشتق ہو یعنی، لایحتالون منزلاً غیرها۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ، نفد الشی کا

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، درجات المجاهدین فی سبیل اللہ، جلد 1، صفحہ 391

معنی ہے جب مکمل اور فارغ ہو جائے۔ یہ مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا۔ اگر ہم سمندر پر عدد یا وزن کے اعتبار سے زیادتی کر دیں۔ مصحف ابی میں مدادا ہے اسی طرح مجاہد، ابن محیصن اور حمید نے پڑھا ہے۔ مددا کی نصب تمیز یا حال کی بناء پر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (الاسراء) تو یہود نے کہا: ہمیں تورات دی گئی ہے اور جس کو تورات دی گئی تو اسے خیر کثیر دیا گیا (تو ہم افضل ہوئے پھر ہم آپ کی پیروی کیسے کریں) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ۔۔۔ الآیۃ۔ بعض علماء نے کہا: یہود نے کہا: آپ کو حکمت دی گئی ہے اور جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دیا گیا پھر آپ کہتے ہیں: مجھے روح کا علم نہیں ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ فرمائیں اگر مجھے قرآن دیا گیا ہے اور تمہیں تورات دی گئی ہے تو تورات اللہ کے کلمات کی نسبت سے کم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: لِكَلِمٰتِ رَبِّيْ۔ سے مراد مواعظ ربی ہے یعنی میرے رب کے مواعظ۔ بعض علماء نے فرمایا: کلمات سے مراد وہ قدیم کلام ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے اگرچہ وہ ایک ہے اس کو لفظ جمع سے تعبیر کرنا جائز ہے کیونکہ اس میں فرائد کلمات موجود ہیں اور فرائد کلمات کے قائم مقام ہے۔ پس عظمت شان کے اظہار کے لیے جمع کے صیغہ سے تعبیر کرنا جائز ہے۔ اعشٰی نے کہا:

ووجہٌ نقیّ اللون صافٍ یزینُہ مع الجیدِ لَبّاتٌ لہا ومَعاصِمُ

اس شعر میں لبہ کو لبات سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن میں ہے: نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ (حم السجدہ: 31) اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ (الحجر: 9) وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ (الحجر: 23)۔ اسی طرح فرمایا: ان ابراھیم کان امۃ۔ کیونکہ ابراہیم علیہ السلام ایک امت کے قائم مقام تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے وہ عبارات اور دلالات ختم نہ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے کلام کے معانی کے مفہومات پر دلالت کرتی ہیں۔ سدی نے کہا: اس کا مطلب ہے اگر سمندر روشنائی بن جائے میرے رب کے کلمات کے لیے تو سمندر ختم ہو جائے گا اس سے پہلے کہ اس جنت کی صفات ختم ہوں جو دار الثواب ہے۔ عکرمہ نے کہا: سمندر ختم ہو جائے گا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے والے کے ثواب کے ختم ہونے سے پہلے۔ اس آیت کی مثال یہ آیت ہے: وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ۔۔۔۔ الآیۃ (لقمان: 27)

حمزہ اور کسائی نے قبل ان ینفد یاء کے ساتھ پڑھا ہے فعل کے تقدم کی وجہ سے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ۔ یعنی میں نہیں جانتا مگر جو اللہ تعالیٰ مجھے سکھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا علم شمار سے وراء ہے مجھے تو حکم ہے کہ میں تمہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پہنچاؤں۔ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ۔ جو اللہ تعالیٰ کی رؤیت اور ثواب کی امید رکھتا ہے اور اس کے عذاب سے ڈرتا ہے۔ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ حضرت جندب بن زہیر عامر کے بارے میں نازل ہوئی اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں اللہ کے لیے عمل کرتا ہوں اور اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتا ہوں مگر جب اس پر (لوگوں کی) آگاہی پائی جاتی ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ پاک ہے اور وہ قبول نہیں فرماتا مگر پاک کو اور اسے قبول نہیں فرماتا جس میں کسی اور کو

شریک کیا گیا ہو"(1) تو یہ آیت نازل ہوئی۔ طاؤس نے کہا: یارسول اللہ! ﷺ میں اللہ کے راستہ میں جہاد کو پسند کرتا ہوں اور میں یہ بھی پسند کرتا ہوں کہ میرا مکان و مرتبہ دیکھا جائے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ مجاہد نے کہا: ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: یارسول اللہ! ﷺ صدقہ کرتا ہوں اور صلہ رحمی کرتا ہوں اور میں یہ کام نہیں کرتا مگر اللہ کے لیے۔ پھر میری طرف سے اس کام کو ذکر کیا جاتا ہے اور اس پر تعجب کیا جاتا ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے اور مجھے اچھا لگتا ہے۔ نبی کریم ﷺ خاموش ہو گئے اور کوئی کلام نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَمَنۡ كَانَ يَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلۡيَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشۡرِكۡ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ۔(2)

میں کہتا ہوں یہ آیت تمام اعمال کو شامل ہے سورۂ ہود میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث ان تین شخصوں کے بارے گزر چکی ہے جن کا سب سے پہلے فیصلہ کیا جائے گا۔ اور سورۃ النساء میں ریاکاری پر کلام گزر چکی ہے اور ہم نے وہاں بہت سے واقعات ذکر کیے ہیں جن میں کفایت ہے ماوردی نے کہا: تمام علماء تفسیر نے کہا: وَّلَا يُشۡرِكۡ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا کا مطلب ہے کہ وہ اپنے اعمال کسی کو نہ دکھائے (یعنی ریاکاری نہ کرے) ترمذی حکیم رحمۃ اللہ علیہ نے نوادر الاصول میں روایت کیا ہے فرمایا: ہمیں عبد الواحد بن زید نے عبادہ بن نُسی سے روایت کر کے بتایا فرمایا: میں شداد بن اوس کے پاس اس کی جائے نماز میں آیا تو وہ رو رہے تھے میں نے کہا: اے ابو عبد الرحمٰن تم کیوں رو رہے ہو؟ انہوں نے کہا: میں نے ایک دن نبی پاک ﷺ سے ایک دن ایک حدیث سنی تھی؟ میں نے نبی پاک ﷺ کے چہرے پر پریشانی دیکھی تھی۔ میں نے عرض کی: یارسول اللہ! ﷺ آپ کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہیں کیا وجہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "شرک اور خفیہ شہوت"(3)۔ میں نے عرض کی یارسول اللہ! ﷺ آپ کے بعد آپ کی امت شرک کرے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "اے شداد! لوگ سورج، چاند، پتھر، ریت کی پوجا تو نہیں کریں گے لیکن وہ اپنے اعمال میں ریاکاری کریں گے"۔ میں نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ ریاکاری شرک ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں"۔ میں نے پوچھا: حضور! شہوت خفیہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے کوئی صبح کے وقت روزے سے ہوگا پھر اس کے لیے دنیا کی شہوات ظاہر ہوں گی تو وہ روزہ افطار کر دے گا"۔ عبد الواحد نے کہا: میں حسن سے ملا تو میں نے پوچھا: اے ابو سعید! مجھے ریاکاری کے بارے بتا کیا وہ شرک ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں۔ کیا تو یہ آیت نہیں پڑھتا: فَمَنۡ كَانَ يَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّهٖ---الخ۔ اسماعیل بن اسحاق نے روایت کیا ہے فرمایا: ہمیں محمد بن ابی بکر نے بتایا تو انہوں نے کہا: ہمیں معتمر بن سلیمان نے بتایا انہوں نے لیث سے انہوں نے شہر بن حوشب سے روایت کیا ہے فرمایا: عبادہ بن صامت اور شداد بن اوس اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے کہا: ہم اس امت پر شرک اور شہوت خفیہ کا خوف کرتے ہیں۔ شہوت خفیہ عورتوں کی طرف سے ہے۔ انہوں نے کہا: ہم نے نبی پاک ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے "جس نے ریاکاری کرتے ہوئے نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوا کرتے ہوئے

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ بقرہ، جلد 2، صفحہ 596
2۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 308
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 110-109

روزہ رکھا اس نے شرک کیا'' پھر یہ آیت تلاوت کی: فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ۔۔۔ الآیۃ (1)۔

میں کہتا ہوں: شہوت خفیہ کی تفسیر اس کے خلاف بھی آئی ہے وہ ہم نے سورۃ النساء میں ذکر کر دی ہے۔ حضرت سہل بن عبد اللہ نے کہا: حسن سے اخلاص اور ریا کاری کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اخلاص میں سے یہ ہے کہ تو اپنی نیکیوں کو چھپانا پسند کرے اور اپنی برائیوں کو پسند نہ کرے۔ اگر اللہ تعالیٰ تجھ پر تیری نیکیاں ظاہر کر دے تو تو کہے: (اے رب کریم!) یہ تیرا فضل اور احسان ہے یہ نیکیاں میرا فعل نہیں (بلکہ یہ کرم ہے) اور تو اس ارشاد کو یاد کر لے: فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ۔۔۔ الآیۃ۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا۔۔۔ الآیۃ (المومنون: 60) یعنی جنہیں اخلاص دیا گیا ہے وہ ڈرتے ہیں کہ ان سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور رہی ریا کاری تو وہ یہ ہے کہ انسان دنیا میں اپنے نفس کے عمل کا حصہ طلب کرے۔ پوچھا گیا کیسے ہوگا؟ فرمایا: ''جس نے اپنے اور اللہ تعالیٰ اور دار آخرت کے سوا کسی کو اپنے کسی عمل کے ساتھ طلب کیا تو وہ ریا کاری ہے''۔ ہمارے علماء نے فرمایا: ریا کاری انسان کو لوگوں کے استہزا تک پہنچاتی ہے جیسا کہ حکایت ہے کہ طاہر بن حسین نے ابو عبد اللہ مروزی سے کہا: تم اے عبد اللہ! کب سے عراق میں ہو؟ اس نے کہا: میں بیس سال سے عراق میں ہوں اور میں تیس سال سے روزہ رکھ رہا ہوں۔ اس نے کہا: اے ابو عبد اللہ! ہم نے تجھ سے ایک سوال پوچھا آپ نے ہمیں دو مسئلے بتا دیے۔ اصمعی نے حکایت کیا ہے کہ ایک اعرابی نے نماز پڑھی اور بڑی لمبی نماز پڑھی اور اس کے قریب ایک قوم تھی انہوں نے کہا: کیا خوب تیری نماز تھی۔ اس نے کہا: اس کے ساتھ میں روزے سے بھی ہوں۔ اشعث بن قیس کا قول ہے کہ اس نے نماز پڑھی اور بہت تخفیف کی ان سے کہا گیا: تو نے بہت تخفیف کی ہے۔ اس نے کہا: اس میں ریا کاری ملی ہوئی نہیں، اپنے نفس سے ریا کاری کی نفی کرنے کے ساتھ ان کی تنقیص سے بچ گیا۔ سورۃ النساء میں ریا کاری کی دواء اور علاج لقمان کے قول سے گزر چکا ہے کہ وہ عمل کو چھپانا ہے۔ ترمذی حکیم نے ذکر فرمایا: ہمیں جریر نے بتایا میرے باپ نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں حمانی نے خبر دی فرمایا ہمیں جریر نے بتایا انہوں نے لیث سے روایت کیا انہوں نے شیخ سے انہوں نے معقل بن یسار سے روایت کیا فرمایا: حضرت ابو بکر نے کہا اور انہوں نے اس کے ساتھ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر گواہی دی فرمایا: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کا ذکر کیا فرمایا: ''شرک تم میں چیونٹی کے رینگنے سے بھی زیادہ مخفی ہوتا ہے (2)، میں تجھے ایک وظیفہ سکھاتا ہوں جب تو وہ کرے گا تو چھوٹا، بڑا شرک تجھ سے دور ہو جائے گا۔ تو کہہ: اللّٰھم إنی أعوذ بك أن أشرك بك وأنا أعلم وأستغفرك لما لا أعلم (3)'' اے اللہ! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں تیرے ساتھ دانستہ شرک کروں اور میں تجھ سے مغفرت طلب کرتا ہوں کہ میں غیر دانستہ شرک کروں''۔ تین بار کہے۔ عمر بن قیس کندی نے کہا: میں نے حضرت معاویہ کو سنا انہوں نے منبر پر یہ آیت تلاوت کی، فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ۔ پھر کہا: یہ آخری آیت ہے جو آسمان سے نازل ہوئی اور حضرت عمر نے کہا (4): نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے وحی کی گئی ہے کہ جو فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ۔۔۔ الخ۔ پڑھے گا اس کے لیے ایک

1۔ مستدرک للحاکم، جلد 4، صفحہ 329
2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزھد، الریا والسمعۃ، جلد 1، صفحہ 320
3۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 385
4۔ المستدرک للحاکم، جلد 2، صفحہ 371

نور بلند کیا جائے گا جو عدن سے مکہ تک فاصلہ جتنا ہوگا اس کو ملائکہ نے پُر کر رکھا ہوگا جو اس بندے کے لیے دعا کرتے ہوں گے اور اس کے لیے استغفار کرتے ہوں گے۔ حضرت معاذ بن جبل نے کہا(1): نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے سورۂ کہف کا اول و آخر پڑھا اس کے لیے سر سے قدموں تک نور ہوگا اور جو پوری سورت پڑھے اس کے لیے زمین سے لیکر آسمان تک نور ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ایک شخص نے ان سے کہا: میں رات کے وقت اٹھنے کا دل میں عزم کرتا ہوں لیکن مجھ پر نیند غالب آجاتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب تو رات کے کسی وقت اٹھنا چاہے تو بستر پر سوتے وقت یہ آیت پڑھا کر۔ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ۔۔۔۔ الخ۔ تو اللہ تعالیٰ تجھے بیدار کر دے گا جب تو اٹھنا چاہے گا۔ یہ فضائل ثعلبی نے ذکر کیے۔ پس مسند داری میں ہے ابو محمد نے کہا: ہمیں محمد بن کثیر نے بتایا انہوں نے اوزاعی سے انہوں نے عبدہ سے انہوں نے زر بن حبیش سے روایت کیا ہے فرمایا: جس نے سورۂ کہف کا آخر تلاوت کیا وہ رات کو جس وقت اٹھنا چاہے گا اٹھ پڑے گا۔ عبدہ نے کہا: ہم نے اس کا تجربہ کیا تو ہم نے اسی طرح پایا۔ ابن عربی نے کہا: ہمارے شیخ طرطوشی اکبر کہتے تھے زمانے تم سے ہم عصروں سے لڑتے ہوئے اور بھائیوں سے تعلق جوڑتے ہوئے نہ گزر جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے بیان کو اس قول پر ختم کر دیا ہے۔ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝۱۱۰

1۔ المستدرک للحاکم، جلد 2، صفحہ 367